اکتوبر ۲۰۱۷ء

اُردو ڈائجسٹ

www.urdudigest.pk

۱۱ ٹی وی ٹاک شوز کی بحثیں اُمید نہیں انتشار پھیلانے کا ذریعہ ہیں

۳۲ کرپٹ سیاست دانوں سے نبرد آزما
ایک دلیر و جری جج

۱۱۱ دربدر بھٹکتے
روہنگیا مسلمانوں
کا قصہ الم

۳۸
انتہائی مقبول بھارتی گُرو
کے عروج و زوال کی سنسنی خیز داستان

۸۶ قتل نے
چینی صدر شی جن پنگ
کو طاقتور بنا دیا

۴۷ کینیا میں
سپریم کورٹ
کا تاریخی فیصلہ

۷۱ ایک سابق احمدی
کے حیرت انگیز
انکشافات

ابا میاں باورچی خانے میں... چٹ پٹی آپ بیتی ۱۵۵
غذا کو ضائع کرنا قابل سزا جرم ہونا چاہیے ۱۲۲
گوگل کی پراڈکٹس سے جان چھڑانے کا لمحہ آن پہنچا ۶۷

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
www.pakistanipoint.com
پاکستانی پوائنٹ
اردو ادب کی بہترین ویب سائٹ
ایک رابطہ اپنوں سے

زکوٰۃ وعطیات دیجئے

علم وہنر سے آراستہ روشن اور باوقار پاکستان کے لئے!

کاروان علم فاؤنڈیشن کے مالی تعاون سے کم وسیلہ، یتیم اور معذور مگر باصلاحیت طلباء وطالبات اعلیٰ پیشہ وارانہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اپنے خاندان کا سہارا بن رہے ہیں اور قومی ترقی کے دھارے میں شامل ہو رہے ہیں

الحمدللہ **5,524** طلباء وطالبات کو اعلیٰ تعلیم کے لئے **-/125,441,886** روپے کے وظائف جاری کیے جا چکے ہیں جن میں **937** یتیم اور **333** معذور طلبہ بھی شامل ہیں

سکالرشپ حاصل کرنے والے طلباء وطالبات کی تعداد اور شعبہ جات

ایم بی بی ایس	1314	ایم اے	133	بی کام آنرز	159	ایل ایل بی	14	ایف ایس سی	510
بی ڈی ایس	51	ایم کام	40	بی ایس آنرز	701	بی اے آنرز	45	ایف اے	90
فزیوتھراپی	45	ایم بی اے	58	بی بی اے	61	بی اے	73	آئی کام	52
ڈی وی ایم	121	ایم پی اے	5	اے سی سی اے	18	سی ایس ایس	01	ڈی کام	05
ڈی فارمیسی	99	ایم فل	19	سی اے	04	بی ٹیک	23	آئی سی ایس	17
ایم ایس سی	135	بی ایس سی انجینئرنگ	1398	بی ایس ایڈ/بی ایڈ	41	ڈپلومہ ایسوسی ایٹ انجینئرنگ	161	میٹرک	131

آپ کے تعاون کے منتظر

ایس۔ایم ظفر (چیئرمین) | احسان اللہ وقاص (وائس چیئرمین) | ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی (سیکرٹری جنرل) | ایوب صابر افتخار (سیکرٹری فنانس) | مجیب الرحمٰن شامی (گورننگ ممبر) | الطاف حسن قریشی (گورننگ ممبر)

کاروان علم فاؤنڈیشن

میزان بنک سمن آباد، لاہور پاکستان	اکاؤنٹ نمبر	0240 0100882859
بنک آف پنجاب سمن آباد، لاہور پاکستان	اکاؤنٹ نمبر	0110 002 000424 0003
بنک آف پنجاب شاہراہ فیصل کراچی پاکستان	اکاؤنٹ نمبر	0247 002 000827 0003

گھر سے عطیات کی وصولی کے لئے رابطہ
لاہور: مہدی رضا
0305-4133173
اسلام آباد: کلیم اللہ چوہدری
0321-5587250

معلومات وراہنمائی کے لئے رابطہ کیجئے

67-کشمیر بلاک حفیظ تائب روڈ نزد رحیم سٹور علامہ اقبال ٹاؤن لاہور۔

فون: 0321-8461122, 0345-8461122, 0333-8461122

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کا قرآن

یہ ہے وہ جس کی خوشخبری دیتا ہے اللہ اپنے بندوں کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے تم فرماؤ میں اس (تبلیغ دین) پر تم سے کچھ اجرت نہیں مانگتا مگر قرابت کی محبّت اور جو نیک کام کرے ہم اس کے لیے اس میں اور خوبی بڑھائیں بیشک اللہ بخشنے والا قدر فرمانے والا ہے (الشُّوریٰ:۲۳)

رسول ﷺ کا فرمان

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بے شک میں تم میں دو نائب چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ایک اللہ تعالیٰ کی کتاب جو کہ آسمان وزمین کے درمیان پھیلی ہوئی رسی (کی طرح) ہے اور میری عترت یعنی میرے اہل بیت اور یہ کہ یہ دونوں اس وقت تک ہرگز جدا نہیں ہوں گے جب تک یہ میرے پاس حوض کوثر پر نہیں پہنچ جاتے۔'' اس حدیث کو امام احمد بن حنبل نے روایت کیا ہے۔

(امام احمد بن حنبل: المسند، الهيثمي: مجمع الزوائد)

اُردو ڈائجسٹ

اکتوبر 2017ء
محرم الحرام 1439ھ
جلد نمبر 57 شمارہ نمبر 10

urdudigest.pk www.urdudigest.pk

صدر مجلس: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیر اعلیٰ: الطاف حسن قریشی
ایگزیکٹو ایڈیٹر: طیب اعجاز قریشی
ڈپٹی ایڈیٹر: سید عاصم محمود
سب ایڈیٹر: عافیہ مقبول جہانگیر
مجلس تحریر: ڈاکٹر آصف محمود جاہ، سلمیٰ اعوان
مہتمم طباعت: فاروق اعجاز قریشی
انچارج کمیونیکیشن: افنان کامران قریشی
پروف خواں: ارم ناز
ڈیزائنر و کمپوزر: فیصل ایوب، کاشف شہزاد

مارکیٹنگ

ڈائریکٹر: ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093

اشتہارات

advertisement@urdudigest.pk
مینیجر ایڈورٹائزمنٹ: 0300-4005579
لاہور: ندیم حامد

سالانہ خریداری 560 روپے کی بچت کے ساتھ

subscription@urdudigest.pk خریداری کے لیے رابطہ
فون: +92-42-35290707 پاکستان 1560 کے بجائے 1000 روپے میں
بیرون ملک 100 امریکی ڈالر اُردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے
اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ
درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No.
Pk18 BPUN 1100 0280 0380 0000
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس

اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں
325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 ◆ فیکس: +92-42-35290731
ای میل: editor@urdu-digest.com editor@urdudigest.pk

قیمت: 100 روپے

طابع وناشر الطاف حسن قریشی نے اردو ڈائجسٹ پرنٹرز 24۔ سرکلر روڈ سے چھپوا کر سن آباد لاہور سے شائع کیا

ایگزیکٹو ایڈیٹر نوٹ

علم کی دولت

جب میں دخترِ عزیز، رجا کے ساتھ کارنیل یونیورسٹی میں داخل ہوا، تو ہماری آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے..... خوشی کے آنسو! ہمارا دیرینہ خواب حقیقت میں بدل گیا تھا۔ کہتے ہیں انسان کے تمام خواب عملی جامہ پہن سکتے ہیں بس ہمت ہونی چاہیے۔ مجھے اور رجا کو ہمت کی دولت اپنے بزرگوں سے حاصل ہوئی۔

میرے والد ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی ہجرت کر کے تہی دامن سرسہ، بھارت سے پاکستان آئے تھے۔ اُن میں نئے وطن کی خدمت کرنے کا جذبہ موجزن تھا۔ اسی جذبے کے زیرِ اثر انھوں نے انیس سو پچاس کی دہائی میں جرمنی جانے کا فیصلہ کیا تاکہ اعلیٰ تعلیم پا کر اپنے دیس کی ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ وسائل محدود تھے اور راہ میں کئی رکاوٹیں حائل تھیں لیکن اپنی ہمت و جذبے سے وہ دیارِ غیر جانے میں کامیاب رہے۔

قرآن پاک میں آیا ہے کہ زمین پر گھومو پھرو تاکہ اللہ تعالیٰ کی بکھری نعمتیں اور نشانیاں دیکھ سکو۔ سفر وسیلۂ ظفر یہ انسان کا ذہن کھولتا اور بلند شعور عطا کرتا ہے۔ ابا جان جرمن یونیورسٹی سے تعلیم پا کر وطن واپس آئے، تو ان میں یہ جذبہ موجزن تھا کہ کنوئیں کے مینڈک بنے ہم وطنوں کو بھی کرۂ ارض پر بکھری اللہ تعالیٰ کی نشانیاں دکھائی جائیں اور ذہن کا کینوس وسیع کیا جائے۔ انھوں نے چچا جان محترم الطاف حسن قریشی اور دیگر احباب سے مشورہ کیا۔ یہ خواب اُردو ڈائجسٹ کی تعبیر بن کر جلوہ گر ہوا۔ وطنِ عزیز میں علم و ادب کے فروغ اور سیاسی و معاشرتی شعور اُجاگر کرنے میں اس ماہنامے کی خدمات محتاجِ بیاں نہیں۔

دادا جان کی ہمت، محنت اور جدوجہد سے متاثر ہو کر ہی پوتی میں اس امنگ نے جنم لیا کہ وہ کسی بہترین غیر ملکی یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم پا کر ملک و قوم کی خدمت کرے۔ اسی جذبے نے بیٹی رجا کو یہ ہمت دے ڈالی کہ وہ ہزاروں میل دور واقع امریکی کارنیل یونیورسٹی میں اپنے پیاروں سے دور اور تن تنہا اعلیٰ تعلیم و تربیت پائے اور سبھی مشکلات کا مقابلہ خندہ پیشانی سے کرے۔ بیٹی کی دلیری نے مجھے بھی اس کی جدائی برداشت کرنے کا حوصلہ دے ڈالا۔

سبھی والدین اپنے بچوں خصوصاً بیٹیوں سے جدائی کا دکھ درد نہایت صبر سے جھیلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت یہ رحمت گھر بھر کی روشنی ہوتی ہے۔ بیٹی کی عدم موجودگی میں ہمیں بھی اپنا گھر سونا سونا سا لگتا ہے۔ دل پر پتھر رکھ کر ہی رجا کو خود سے جدا کرنا پڑا تاکہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا اپنا ارمان پورا کر سکے۔

وطنِ عزیز کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ یہاں اعلیٰ تعلیم دینے والی اچھی یونیورسٹیوں کا فقدان ہے۔ اسی لیے مجبوراً معیاری تعلیم پانے کے خواہش مند طلبہ و طالبات کو بیرونِ ملک جانا پڑتا ہے۔ امریکا اور برطانیہ کی یونیورسٹیاں جدید تعلیم دینے میں عالمی شہرت رکھتی ہیں۔ ان ممالک کے حکمران طبقے کا رویہ پاکستان جیسے ترقی پزیر ملکوں سے منافقانہ ہے، لیکن امریکا، برطانیہ، کینیڈا وغیرہ کے بیشتر عوام انسان دوست، ہمدرد اور اپنے کام سے کام رکھنے والے ہیں۔ مغربی حکمرانوں کے سیاہ کرتوتوں کا ذمے دار وہاں کے عام لوگوں کو قرار دینا شاید درست نہیں ہوگا۔

امریکا و برطانیہ کی یونیورسٹیاں کئی سو برس کے تلخ و شیریں تجربات کی بھٹی سے نکل کر کندن بن چکیں۔ یہی وجہ ہے، دنیا بھر کی بیشتر ایجادات اور سائنسی تحقیق انہی جامعات میں انجام پاتی ہیں۔ ان یونیورسٹیوں میں مصروف کار موجودوں، محققوں اور سائنسدانوں نے مغرب ہی نہیں دنیا کی ترقی کا پہیہ رواں دواں رکھا ہوا ہے۔ گو یہ بھی حقیقت ہے کہ مغربی یونیورسٹیاں علم و حکمت والی اس عظیم الشان روایت کی وارث ہیں جس کی داغ بیل مسلمان دانشوروں، علما اور ماہرین علوم نے ڈالی تھی۔

اب کارنیل یونیورسٹی ہی کو لیجیے جس کا شمار ''آئی وی لیگ'' میں ہوتا ہے جو امریکا ہی نہیں دنیا کی بہترین آٹھ یونیورسٹیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ امریکی ریاست نیویارک کے شہر اتھاکا میں واقع ہے۔ دو امریکی سیاست دانوں، ایزرا کارنیل اور اینڈریو ڈکسن نے ۱۸۶۵ء میں کارنیل یونیورسٹی کی بنیاد رکھی۔ پچاس سے زائد نوبل انعام یافتہ شخصیات وہاں تعلیم پا چکیں۔ فارغ التحصیل شخصیات میں تائی انگ وین (پہلی تائیوانی خاتون صدر)، رتن ٹاٹا (مشہور بھارتی صنعت کار)، جمشید آموزگار (ایرانی وزیراعظم) اور ٹونی ماریسن (نوبل انعام یافتہ امریکی ادیبہ اور جینٹ رینو (امریکا کی پہلی خاتون اٹارنی جنرل) نمایاں ہیں۔

اس مایہ ناز یونیورسٹی میں فی الوقت بیس ہزار طلبہ و طالبات زیرِ تعلیم ہیں۔ ان میں سے پانچ ہزار کا تعلق دنیا کے ۱۵۰ ممالک سے ہے جن میں پاکستان بھی شامل ہے۔ یونیورسٹی میں نہایت جدید اور سائنسی خطوط پر تعلیم دی جاتی ہے۔ تعلیم کا بنیادی وصف یہ ہے کہ ہر طالب علم آزادی سے غور و فکر کرے اور اپنی صلاحیتیں خوب چمکا دمکا لے۔ اس پر خواہ مخواہ نصابی کتب کا بار ٹھونسا نہیں جاتا اور یہ سعی ہوتی ہے کہ تعلیم پاتے ہوئے ہر طالب علم اور طالبہ کی تخلیقی صلاحیتیں خوب جلا پا جائیں۔ اس قسم کی جدت پسند تعلیم ابھی پاکستانی یونیورسٹیوں میں عنقا ہے جہاں نصاب کو تخلیقی سوچ پر اوّلیت دی جاتی ہے۔

ممتاز امریکی نومسلم، میلکم ایکس کہتا ہے: ''تعلیم خوشحال مستقبل کا پاسپورٹ ہے۔ کل انہی کا ہے جو آج تیاری کر لیں۔'' اگر ہماری نئی نسل ہمت و جذبے سے اعلیٰ تعلیم پالے اور جدید علوم و فنون میں طاق ہو جائے تو یقین جانیے پاکستان ناقابلِ تسخیر طاقت بن سکتا ہے۔ تب مودی ہو یا ٹرمپ، کوئی جرأت نہیں کرے گا کہ وطنِ عزیز کا بال بیکا بھی کر سکے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ نئی نسل ہمارا بے مثال سرمایہ ہوگی اور ایسا مضبوط دماغ بھی جو ملک کو خوشحالی و ترقی کی نئی منازل پر لے جا سکے۔

پڑھیے، پڑھائیے، سیکھیے اور لطف اُٹھائیے

طیب اعجاز قریشی

فہرست

کچھ اپنی زبان میں

قانون سازی کا معروف طریقہ..... قانونی ارتقاء ایک زندہ معاشرے کے لیے ناگزیر ہے — الطاف حسن قریشی — ۰۹

تبادلۂ خیال

داخلی استحکام کی ایک جامع حکمت عملی..... وقت کے اہم ترین موضوع پر قومی سیمینار — الطاف حسن قریشی — ۱۱

اسلامی زندگی

نیکی کی طاقت..... تاریخ اسلام سے سبق آموز واقعات کا جامع انتخاب — طالب ہاشمی — ۴۹

اسلامی شخصیت

سسلی کا چیف جسٹس..... سچائی و سادگی کو سربلند کرنے والی روح پرور داستان — حبیب اشرف صبوحی — ۶۴

حضرت آمنہ رملیہؒ..... دینی علوم میں یکتائے روزگار عالم و عارفہ کی روح پرور داستان — ام عائشہ — ۱۵۳

انکشافات

چمکتے بھارت کا سیاہ چہرہ..... نام نہاد بدنام بھارتی گرو کی چشم کشا داستان — سیّد عاصم محمود — ۲۹

دنیائے انٹرنیٹ کے فراڈیے..... جرائم پیشہ لوگوں نے اس ایجاد کو بھی نہ بخشا — آفاق احمد — ۱۸۵

بدیسی ادب

صید و صیاد..... موت کو بخوشی گلے لگا لینے والے فرانسیسی نوجوان کا قصۂ عجب — سیّد احمد شاہ پطرس بخاری — ۲۱۶

عالمِ تمام

برازیل کا کرپشن سکینڈل..... کچھ طاقتور مگرمچھوں کو جیل کی راہ دکھلانے والی مملکت کا مثالی اقدام — عالیہ شاہ — ۴۲

حالاتِ حاضرہ

کینیا میں سپریم کورٹ کا تاریخی فیصلہ..... جب طاقتور حکومت کا فراڈ الیکشن کالعدم قرار دے دیا گیا — ابوصارم — ۴۷

کمپیوٹر سائنس

گوگل سے جان چھڑائیں..... یہ کمپنی بھی اپنی حکومت کی طرح شیطان صفت بن چکی — راؤ محمد شاہد اقبال — ۶۷

آپ بیتی

میں ایک قادیانی تھا..... سابق احمدی نے لالچی مکار راہنماؤں کے پول کھول دیے — ڈاکٹر منیر الدین احمد — ۷۱

سفرنامہ

اورفہ..... شامی مہاجرین کا دل جیتنے والی سرزمین کے ایمان افروز واقعات — ڈاکٹر آصف محمود جاہ — ۹۷

معاشرتی کہانیاں

بے نام اندیشے..... اپنے سینے میں کئی راز رکھنے والی ایک ماں کی دلدوز کہانی — طوبیٰ احسن — ۱۰۵

جو پتا تھا اپنے گھر کا..... جب دیواریں ریت پتھر سے نہیں جذبوں سے بنائی جاتی تھیں — سلیم احمد — ۱۸۷

مادہ پرستی کا زہر..... دورِ جدید کی مصنوعی زندگی سے عاجز آئی ایک لڑکی کا منفرد فسانہ — سعدیہ بتول — ۲۳۳

مزاح

غلطی..... ایک پُراسرار خط کے ہاتھوں گھن چکر بنے بھولے شوہر کی قہقہہ بار کہانی — مسعود مفتی — ۱۸۰

پپو یار! تنگ نہ کر..... سڑکوں پر رواں دواں ٹرکوں اور بسوں کے پیچھے لکھا قلمی خزانہ — ڈاکٹر منصور احمد باجوہ — ۲۰۲

فکاہیہ

بھوک..... ایک استاد روٹی پکانے کی مشقت میں بے حال ہو گیا — پروفیسر مجیب ظفر انوار حمیدی — ۱۱۸

معلومات

انسانی دماغ کا انوکھا جہاں..... دنگ کر دینے والی رب تعالیٰ کی حیرت انگیز کاریگری — قاضی مظہر الدین طارق — ۱۲۷

تازہ افسانے

پیاسی ندیا..... ایک معصوم پنچھی کی دلگداز کہانی جس کی زندگی صیاد نے جہنم بنا رکھی تھی — شاہدہ ناز قاضی — ۱۳۰

ابا میاں باورچی خانے میں..... ازدواجی نوک جھونک کے چٹکلوں سے آراستہ ایک دلچسپ روداد — سارہ خالد — ۱۵۵

زہر ہلاہل..... ایک بدلحاظ روح کا قصہ عبرت وہ لوگوں کے لیے وبالِ جان بن گئی تھی — مہ جبیں تاج درانی — ۱۷۴

سانحۂ کربلا

دین پر جان قربان..... اسلام کے لیے سر کٹوا دینے والے نواسۂ رسول ﷺ کا قصہ حیات — پروفیسر ارشد عزیز — ۱۴۴

ناروے کی کہانی

دو بھائی..... ناراضی اور خوشی کے انوکھے جذبات سے مملو برادرانہ محبت کی لازوال داستان — احمد فواد — ۱۴۸

توانائی

شمسی پینلوں کی بہار..... لوڈ شیڈنگ کے توڑ سورج کی روشنی سے مستفید ہونا اب بہت سہل ہے — سلیم احمد — ۱۶۴

لسانیات

اُردو ہے جس کا نام..... قومی زبان سے ناآشنا نئی نسل کا المیہ اُجاگر کرتا نثر پارہ — رفیق سجاد — ۱۷۸

تعلیمات

اُستادِ مہرباں..... ٹیچنگ کالج میں گزری تلخ و شیریں یادوں کا شگفتہ تذکرہ — سیما صدیقی — ۱۹۰

دیارِ غیر سے

ہوئے مر کے ہم جو رسوا..... لالچ کے گرداب میں پھنسے ایک لوبھی کا طرح دار فسانہ — نصر ملک — ۱۹۴

انشائیہ

گیانی بلی..... من پسند جانور کی خصوصیات آشکارا کرتا منفرد خاکہ — احمد جمال پاشا — ۲۰۷

علامتی کہانی

ابنِ آذر..... صدیوں سے پیری مریدی کے چکر میں پھنسے کم عقل دیہاتیوں کی کتھا — زبیر سلیمانی — ۲۱۰

نفسیات

مثبت سوچ کا کمال..... شخصیت میں انقلاب پیدا کرنے والے تیر بہدف مشورے — عائشہ خان — ۲۱۴

مستقل سلسلے

تبصرۂ کتب ۲۲۹ چمنِ خیال ۲۳۶

قانون سازی کا معروف طریقہ

قانون کی حکمرانی کا ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ قانون سازی میں کامل احتیاط برتی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے مقاصد اور اس کی تمام شقوں کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے اور اسے معروف طریقے سے منظور کیا جائے۔ عام انتخابات میں اب صرف گیارہ ماہ رہ گئے ہیں اور انتخابی اصلاحات کا بل جس عجلت، ہنگامہ آرائی اور جوڑ توڑ کی فضا میں سینیٹ سے منظور کرایا گیا ہے، اس کے بارے میں غیر جانب دار حلقے ناپسندیدگی کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ بل جو دو سو سے زائد شقوں پر مشتمل تھا اور جس کی تیاری میں تقریباً تین سال صرف ہوئے، وہ قومی اسمبلی میں واضح اکثریت سے منظور ہو چکا تھا۔ تحریک انصاف جس نے متعلقہ اسٹینڈنگ کمیٹی میں بل کی حمایت کی تھی، مگر ایوان میں اس نے بعض شقوں پر اعتراضات کرتے ہوئے کارروائی کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ سنجیدہ قومی حلقوں نے اس اقدام پر تنقید کی تھی اور انتخابی اصلاحات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا تھا۔

سینیٹ میں جب یہ بل پیش کیا گیا تو اس کے اندر متعدد ترامیم تجویز کی گئیں۔ چیئرمین سینیٹ میاں رضا ربانی اجلاس کی صدارت کر رہے تھے۔ بل میں ایک ترمیم کثرت رائے سے منظور کر لی گئی۔ اس کے بعد وزیر قانون جناب زاہد حامد نے ایک اور ترمیم پیش کی جس کا مقصد پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ سے ایک شق حذف کرنا تھا جو جنرل پرویز مشرف کے عہد اقتدار میں داخل کی گئی تھی۔ اس شق کی رو سے کوئی ایسا شخص سیاسی جماعت کا سربراہ نہیں بن سکے گا جو قومی اسمبلی کی رکنیت کے لیے نااہل ہو یا اسے آئین کی دفعات ۶۲،

۶۳ کے تحت سزا دی گئی ہو۔ چیئرمین صاحب نے اس ترمیم پر بحث کرنے کی اجازت نہیں دی، لیکن حکمران جماعت کا اصرار بڑھتا گیا۔ اس پر میاں رضا ربانی نے معاملہ ایوان پر چھوڑ دیا اور خود چیمبر میں چلے گئے۔ ایوان میں ترمیم پر رائے شماری ہوئی۔ تب ۳۸ معزز ارکان نے حق میں جبکہ ۳۷ نے مخالفت میں ووٹ ڈالے۔ یوں ترمیم صرف ایک ووٹ کی کثرت سے منظور ہوئی۔

اس موقع پر اپوزیشن جماعتوں کا جو طرزِ عمل سامنے آیا، وہ کسی طور بھی اعلیٰ جمہوری روایات کی عکاسی نہیں کرتا ہے۔ وہ پبلک طور پر تو اس ترمیم کی مخالف تھیں، مگر اس کے کچھ سینیٹر غائبانہ حکومت کے ساتھ مل چکے تھے، چنانچہ انھوں نے یا تو ترمیم کے حق میں ووٹ ڈالے یا غیر حاضر ہو گئے اور یوں ایوان میں ایک ڈرامائی کیفیت پیدا ہو گئی جو ساز باز کی چغلی کھا رہی تھی۔ اس ترمیم کی منظوری سے یہ عمومی تاثر قائم ہوا کہ فردِ واحد کو فائدہ پہنچانے کے لیے کی گئی ہے۔ جناب نواز شریف جن کو سپریم کورٹ نے دفعات ۶۲، ۶۳ کے تحت نااہل قرار دے دیا ہے، اب وہ اس ترمیم کے بعد مسلم لیگ نون کے صدر بن سکیں گے۔ انتخابی اصلاحات ایکٹ نافذ تو ہو جائے گا، مگر مقدمات کا ایک لامتناہی سلسلہ چل نکلے گا اور سیاسی میدان میں بھی محاذ آرائی کو تقویت ملے گی۔ یہ کام احسن طریقے سے کیا جانا چاہیے تھا۔

اسی واقعے کے پہلو میں ایک اور انہونی نے جنم لیا ہے۔ ایک روز اخبارات میں یہ اعلان شائع ہوا کہ فاٹا میں پولیس اور عدالتی نظام صدرِ مملکت کی منظوری سے نافذ کر دیا گیا ہے۔ پھر یہ خبریں آنے لگیں کہ اس فیصلے کا گورنر خیبر پختونخواہ کو علم ہے نہ وزارت سفیران کی طرف سے کوئی سمری بھیجی گئی ہے۔ فاٹا کے اراکین قومی اسمبلی بھی اس اعلان پر حیرت زدہ تھے۔ آرڈیننس جاری کرنے کا بھی ایک معروف طریقہ آئین میں درج ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض اعلانات حکومت سیاسی یا نفسیاتی دباؤ میں کر رہی ہے جن سے گمبھیر تنازعات سر اٹھا سکتے ہیں۔ قانونی ارتقا ایک زندہ معاشرے کی ایک ناگزیر ضرورت ہے، مگر اس کے لیے قانون سازوں کو گہری بصیرت اور اخلاقی توانائی کا ثبوت دینا ہوگا۔ ◆◆◆

الطاف حسن قریشی کے قلم سے

داخلی استحکام کی ایک جامع حکمتِ عملی

وقت کے اہم ترین موضوع پر "پائنا اور سوچ" کے زیرِ اہتمام سیمینار کی رُوداد

پاکستان نے گزشتہ چار پانچ برسوں کے دوران اپنے گردوپیش اور اپنے اندر عجیب و غریب واقعات رونما ہوتے دیکھے ہیں جن کا سلسلہ تیز تر ہوتا جا رہا ہے۔ ان واقعات میں گہری تشویش کے پہلو بھی ہیں اور قدرے طمانیت کا سامان بھی۔ تشویش اس بات کی کہ عالمی طاقتوں کی جو ایک نئی صف بندی ہو رہی ہے اور ان کے مابین محاذ آرائی جو شدت اختیار کرتی جا رہی ہے، وہ پاکستان کے داخلی معاملات پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ امریکہ جو کبھی مغربی تہذیب کا امام اور دنیا کی سب سے بڑی طاقت کا درجہ رکھتا تھا، اس کی قیادت بتدریج روبہ زوال ہے اور اس کے اثر و نفوذ میں واضح کمی آتی جا رہی ہے۔ اس کے مقابلے میں چین دنیا کی دوسری بڑی اقتصادی طاقت کے طور پر ابھرا ہے جو براعظم افریقہ، جنوبی امریکہ اور افغانستان کے علاوہ امریکہ میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کر رہا ہے اور "ون بیلٹ ون روڈ" کے اسٹریٹیجک منصوبے کے ذریعے مختلف براعظموں کو جوڑتے ہوئے عالمی تجارت کی شاہراہیں تعمیر کر رہا ہے۔ اس کی حیرت انگیز طور پر بڑھتی ہوئی طاقت کی روک تھام کے لیے امریکہ نے بھارت، جاپان اور آسٹریلیا کا بلاک قائم کر لیا ہے۔ اس کے اور چین کے درمیان پراکسی وار جاری ہے جس کی زد میں پاکستان آتا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ بھارت افغانستان کے ذریعے ہمارے ملک میں دہشت گردی کی حوصلہ افزائی کرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان اور افغانستان کے تعلقات میں زہر گھول رہا ہے۔ حال ہی میں امریکی صدر ٹرمپ نے شمالی کوریا کو پوری طرح تباہ کر دینے کا الٹی میٹم دیا

ہے' بین الاقوامی امور کے ماہرین کی نگاہ میں یہ دھمکی پاکستان کے لیے بھی ہے۔ ان کے اس خیال کو تقویت امریکی صدر کے اس پالیسی بیان سے پہنچتی ہے جو انھوں نے افغانستان اور جنوبی ایشیا کے بارے میں چند ماہ پہلے دیا تھا۔ افغانستان کی حکومت جس کا نصف علاقے پر کوئی کنٹرول نہیں' وہ پاکستان کے لیے سنگین مسائل پیدا کر رہی ہے جو ہمارے داخلی استحکام کے لیے بہت بڑا چیلنج بنتے جا رہے ہیں۔

گزشتہ چند برسوں میں وقوع پزیر ہونے والے واقعات میں طمانیت کے بھی کچھ پہلو ہیں۔ پاکستان پہلی بار شنگھائی تعاون تنظیم کا مستقل رکن بنا جس کی بدولت اسے روس اور وسطی ایشیا کی ریاستوں کے ساتھ روابط مستحکم کرنے کا موقع ملا ہے۔ روس جس نے ۱۹۷۱ء میں پاکستان کو دولخت کرنے میں بھارت کا ساتھ دیا تھا' وہ اب خطے میں ایک مثبت کردار ادا کرنے میں گہری دلچسپی لے رہا ہے۔ ایران کے ساتھ پاکستان مکالمے کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ اسی طرح بھارت کشمیریوں پر جو مظالم ڈھا رہا ہے' انھیں عالمی سطح پر بے نقاب کرنے اور کشمیریوں کے حق خودارادیت کے لیے عالمی حمایت کو فروغ دینے میں اہم اور بااثر ممالک پاکستان کے ہم نوا بنتے جا رہے ہیں۔ ان میں ترکی پیش پیش ہے اور بیشتر مغربی ممالک بھی اب پوری صورت حال کا صحیح ادراک رکھتے ہیں۔ پاکستانی قیادت نے دہشت گردوں کی ہیبت اور طاقت ختم کرنے میں حیرت انگیز کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ فوج اور قوم کی مشترکہ کوششوں سے کراچی کا امن بحال ہوا ہے' بلوچستان میں علیحدگی پسندی کی تحریک دم توڑ چکی ہے' بجلی کے بحران پر بڑی حد تک قابو پا لیا گیا ہے اور ملکی معیشت نے بھی سنبھالا لیا ہے' مگر مختلف داخلی اور خارجی عوامل ہمارے وطن کو عدم استحکام سے دوچار کرنے کے لیے سرگرم ہیں۔ آج سیاسی جماعتیں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں اور اداروں کے مابین کشیدگی کے آثار بڑے نمایاں ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا ملک گزشتہ سات عشروں میں جو مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں سرانجام دیتا آیا ہے اور گزشتہ چند برسوں میں اسے

جو سیاسی استحکام حاصل ہوا تھا' وہ سب کچھ خزاں رسیدہ پتوں کی طرح بکھر جائے گا۔

اس نازک صورت حال پر غور کرنے اور بنیادی نکات پر اتفاق رائے پیدا کرنے کے لیے "**پائنا** اور سوچ" نے پنجاب یونیورسٹی میں سیمینار کا اہتمام کیا جس میں دانش وروں' سیاسی تجزیہ نگاروں' مسائل پر سنجیدگی کے ساتھ سوچنے اور لکھنے والے پروفیسروں' صحافیوں' کالم نگاروں اور فوج میں اپنی زندگی کا بڑا حصہ گزارنے والے اصحاب نے حصہ لیا۔ قانون اور سیاست کے رمز آشنا جناب ایس ایم ظفر' پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ظفر معین ناصر' علم السیاسیات کے پروفیسر ڈاکٹر رشید احمد خان' یونیورسٹی لا کالج کے استاد ڈاکٹر امان اللہ' قومی دانش ور جناب مجیب الرحمن شامی' ٹی وی اینکر پرسن جناب سجاد میر' بزنس لیڈر جناب جاوید نواز' پولیٹیکل جیوگرافی کی استاد ڈاکٹر عمرانہ مشتاق' لیفٹیننٹ جنرل (ر) غلام مصطفیٰ' بریگیڈیئر (ر) ریاض احمد طور' پروفیسر شبیر احمد خان' سیاسی تجزیہ نگار جناب حفیظ اللہ نیازی' 'سوچ'' کے سربراہ جناب محمد مہدی' ایڈیٹر جناب عطاء الرحمن' سینئر صحافی جناب رؤف طاہر' پروفیسر ڈاکٹر امجد مگسی' کالم نگار جناب نجم ولی' سیاسی تجزیہ نگار جناب فاروق چوہان' نامور ادیب جناب قاضی منشا' انٹرنیشنل میڈیا براڈ کاسٹر جناب احمد شیخ اور سابق بیوروکریٹ فاروق تسنیم مذاکرے میں موجود تھے۔ دو گھنٹوں پر مشتمل اس تبادلۂ خیال میں داخلی استحکام کے بنیادی اجزا' اس پر اثر انداز ہونے والے محرکات' خارجی چیلنجز اور داخلی خطرات زیر بحث آئے اور ایک جامع حکمت عملی کے خدوخال کا تعین کرنے کی بڑی عرق ریزی سے کوشش کی گئی۔ نکتۂ نظر کا اختلاف بھی سامنے آیا اور کبھی کبھی بات کرتے ہوئے آواز بلند ہو گئی' مگر انتہائی تشویش ناک صورت حال سے نجات پانے کا جذبہ غالب رہا اور اتفاق رائے کی اچھی صورتیں سامنے آئیں جن کو صدر محفل جناب ایس ایم ظفر نے ایک لڑی میں پرو دیا۔ سیمینار کا آغاز تلاوت قرآن سے ہوا اور جناب سجاد میر نے میزبانی کے فرائض سرانجام دیے۔

الطاف حسن قریشی

پائنا کے سیکرٹری جنرل نے سیمینار کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے داخلی حالات پر غیر معمولی مدوجزر کی کیفیت طاری ہے۔ ایک سال پہلے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم سیاسی اور معاشی استحکام کی بلند سطح عبور کرنے والے ہیں' مگر وہ عالمی طاقتیں جو سی پیک کے منصوبے کو سبوتاژ کرنے پر تلی ہوئی ہیں انھوں نے پاکستان میں ایسے حالات پیدا کر دیے کہ دیکھتے ہی دیکھتے پورا نقشہ تبدیل ہوتا گیا۔ وزیراعظم نواز شریف کی عدالتی فیصلے کے ذریعے اقتدار سے علیحدگی نے ہماری سیاسی زندگی میں زبردست ارتعاش پیدا کر دیا ہے اور وہ آئینی ادارے جو آئین کے مطابق چیک اینڈ بیلنس کا فریضہ ادا کرنے کے پابند ہیں' وہ ایک دوسرے کے مدمقابل نظر آتے ہیں۔ برکس اعلامیہ سامنے آیا جس میں پاکستان کے اندر سرگرم عسکریت پسند تنظیموں کے نام درج تھے اور پانچ ملکوں کی سربراہ کانفرنس جو چین میں منعقد ہوئی تھی اس میں اس امر کا اظہار کیا گیا تھا کہ پاکستان دہشت گردوں کے مکمل خاتمے کے لیے مزید اقدامات کرے گا۔ اس اعلامیے پر نئے وزیرخارجہ جناب خواجہ آصف نے بیان دیا کہ ہمیں اپنا گھر درست کرنے کی ضرورت ہے۔ اس پر سابق وزیرداخلہ جناب چودھری نثار علی خاں کا تند و تیز بیان آیا کہ ایسے وزیرخارجہ کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی دوسرے دشمن کی ضرورت نہیں۔ یہی مسئلہ کئی روز موضوعِ گفتگو بنا رہا۔ کسی نے کہا ہم نے اپنے حصے کا کام مکمل کر لیا ہے کہ عالمی دہشت گردی کی جنگ میں ہم پچاس ہزار فوجی اور سویلین کی قربانیاں دے اور ۱۵۰ ارب ڈالر کا نقصان سہہ چکے ہیں۔ آپریشن ضربِ عضب اور ردالفساد نے دہشت گردوں کی کمر توڑ دی ہے اور اُن کے محفوظ ٹھکانے تباہ کر دیے ہیں۔ اب یہ عالمی طاقتوں کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے حصے کا کام کریں اور جو عناصر ہمارے ہاں دہشت گردی پھیلا رہے ہیں' اُن کا ہاتھ روکیں اور پاکستان کو سیاسی اور معاشی طور پر مضبوط بنانے میں ہاتھ بٹائیں۔ اس نکتۂ نظر کے جواب میں یہ کہا جا رہا ہے کہ ہمارے ہاں بعض ایسی تنظیمیں موجود ہیں جو نام بدل بدل کر دہشت گردی میں ملوث ہیں جس کے باعث مختلف ملکوں سے ہمارے تعلقات خراب ہو رہے ہیں اور ایک دنیا ہمارا موقف تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ ہم ان بحثوں میں الجھے ہوئے ہیں جبکہ ہمارے چاروں طرف خطرات منڈلا رہے ہیں۔ اُن کا مقابلہ کرنے اور اپنی بقا کی جنگ جیتنے کے لیے داخلی استحکام کی سب سے زیادہ ضرورت محسوس ہو رہی ہے جو اداروں کے مابین آویزش کے سبب لرزہ براندام ہے۔ ہم نے آپ کو اس لیے دعوت دی ہے کہ اجتماعی دانش کے ذریعے ایک ایسی جامع حکمت عملی وضع کی جائے جو داخلی استحکام کی ضمانت فراہم کر سکے۔ اس وقت رنجشیں اس قدر زیادہ اور فاصلے اس قدر بڑھ چکے ہیں کہ بھنور سے باہر آنا سہل نظر نہیں آ رہا۔ آپ چونکہ مسائل پر سالہا سال سے غور کرتے آئے ہیں اور رائے عامہ کی تشکیل میں کردار ادا کر سکتے ہیں' اس لیے توقع

کی جاتی ہے کہ قوم کی صحیح راہنمائی کرتے ہوئے آپس میں اتفاق و اتحاد پیدا کرنے کی راہیں تلاش کر سکیں گے۔ میثاقِ جمہوریت میں سیاسی راہنماؤں نے سچ اور مصالحتی کمیشن (Truth & Reconciliation Commission) قائم کرنے کا عہد کیا تھا' کیا اسے عملی جامہ پہنانے کی کوئی صورت نکل سکتی ہے یا سینیٹ کے چیئرمین جناب میاں رضا ربانی نے اداروں کے مابین ''عظیم مکالمے'' کی جو تجویز دی تھی جس کا عسکری قیادت نے بھی خیر مقدم کیا ہے' کیا اس کے لیے آپ جیسے اہلِ دانش فضا ہموار کر سکیں گے؟ اس سوال کے درست جواب پر آئندہ کی پیش رفت کا بہت بڑا انحصار ہوگا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سابق وزیراعظم نواز شریف کو اپنے خلاف ریفرنسز کا احتساب عدالتوں میں نہایت باوقار انداز میں دفاع کرنا اور قانونی اور سیاسی محاذ پر بردباری اور دوربینی کا ثبوت دینا چاہیے۔ آرمی چیف جنرل قمر جاوید باجوہ پارلیمنٹ کے ساتھ روابط استوار کرنے کی خواہش کا اظہار کر چکے ہیں جو سول عسکری تعلقات کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ فضا میں ایک خوشگوار تبدیلی محسوس ہو رہی ہے۔

جناب حفیظ اللہ نیازی

نیازی صاحب روزنامہ جنگ میں فکر انگیز کالم لکھتے ہیں جس میں وسیع تر عالمی تناظر میں واقعات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ انھوں نے پاکستان کے اندرونی احوال کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ زیادہ تر عالمی حالات کی پیداوار ہیں۔ میں تاریخ کا جس قدر مطالعہ کرتا ہوں' مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آج پہلی اور دوسری جنگِ عظیم سے پہلے جیسے حالات جنم لے رہے ہیں۔ اصل جنگ چین اور امریکہ کے مابین ہے جس کا تعلق سی پیک سے ہے۔ چین کا یہ نہایت اہم اسٹریٹیجک منصوبہ ہے جس سے وہ کسی طور دست بردار نہیں ہوگا جبکہ امریکہ اس گیم چینجر منصوبے کو سبوتاژ کرنے کے لیے ایڑھی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔ چین اگر گوادر میں طاقتور نیول بیس قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر پورے بحیرہ عرب اور بحرِ ہند پر اس کی بالادستی قائم ہو جائے گی اور اس کی اجازت کے بغیر آبنائے ہرمز سے تیل یورپی ملکوں اور جاپان تک نہیں جا سکے گا۔ اس کے علاوہ اس نے تھائی لینڈ اور سنگاپور کے درمیان پاناما کی طرح ایک نہر بھی تعمیر کر لی ہے جس کے بعد امریکا اور جاپان اس کا بحری محاصرہ نہیں کر سکیں گے۔ امریکہ' اپنی ایمپائر کا خاتمہ برداشت نہیں کرے گا اور پوری قوت سے چین پر حملہ آور ہوگا۔ اسی پراکسی وار کے پاکستان پر گہرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ امریکا نے پہلے پاکستان میں شیعہ سنی فسادات کرانے کا حربہ آزمایا۔ بلوچستان میں ہزارہ قبیلے کے لوگ قتل کرائے' مگر مسلمانوں کی عظیم اکثریت نے ان تخریبی سرگرمیوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ بریلوی اور دیوبندی اختلافات کو بھی ہوا دینے کی سرتوڑ کوششیں ہوئیں جو ناکام ثابت ہوئیں۔ اس

کے بعد سیاسی جماعتوں کو ایک دوسرے کے مدِ مقابل لا کھڑا کر دیا گیا ہے۔ باخبر لوگ کہتے ہیں عمران خان ۲۰۱۴ء سے احتجاجی ماحول انہی طاقتوں کی شہ پر تیار کرتے رہے اور آخر کار نواز شریف کی حکومت ختم کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ اب فوج سمجھتی ہے کہ اس نے نواز شریف کو گرا کر بہت مضبوط قلعہ سر کر لیا ہے جبکہ نواز شریف کا خیال ہے کہ وہ عوامی دباؤ کے ذریعے منہ زور طاقت کو قابو میں لا سکیں گے۔ یہ دونوں تصورات کم نگاہی پر مبنی ہیں' اس لیے ہمیں درمیانی راستہ دریافت کرنا اور جوش کے بجائے ہوش سے کام لینا ہوگا۔ مجھے بہتری کی اس لیے امید ہے کہ جنرل قمر جاوید باجوہ فوج اور پارلیمان کے درمیان رابطے مضبوط کرنے کی بات کر رہے ہیں۔ توقع کی جا سکتی ہے کہ نواز شریف بھی عظیم مکالمے کو عملی جامہ پہنانے کی حکمت عملی اختیار کریں گے۔

جناب مجیب الرحمن شامی

شامی صاحب دنیا ٹی وی پر ہفتے میں چار دن پروگرام کرتے اور تازہ ترین حالات کا بڑی ذہانت سے جائزہ لیتے ہیں۔ انھوں نے داخلی استحکام کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ماشاء اللہ ہر طرف قانون کی طاقت اور عدالت عظمیٰ کا تحکم قائم ہے۔ قرآن میں انسانوں اور جنوں کا ذکر آیا ہے۔ انسان دکھائی دیتے ہیں جبکہ جن عام آدمی کو نظر نہیں آتے۔ وہ ہمارے درمیان مختلف سرگرمیاں کر رہے ہیں جن کا ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے نہ اُن پر قانون کا اطلاق ممکن ہے۔ کھلم کھلا ایسے واقعات رونما ہو رہے ہیں جن کا عدالت عظمیٰ کو نوٹس لینا چاہیے تھا، مگر اُن کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ میں ایک مثال دینا چاہوں گا۔ جناب بیرسٹر زاہد جمیل کا انٹرویو جیو چینل پر نشر ہوا۔ وہ ایگزیکٹ کے خلاف مقدمات میں پراسیکیوشن وکیل تھے جو جعلی ڈگریاں تقسیم کرنے پر قائم ہوئے تھے۔ ایک مرحلے پر وہ اپنی ذمے داری سے دست بردار ہو گئے۔ انھیں دوبارہ یہ کام سرانجام دینے کے لیے راضی کیا گیا جس کے بعد اُن کے گھر پر حملہ ہوا۔ مقدمات میں جج اور وکیل بار بار تبدیل کیے گئے اور ایف بی آئی کا خط عدالت میں پیش کرنے سے روک دیا گیا۔ اس پر اُن سے شاہ زیب خانزادہ نے پوچھ لیا یہ خط کس نے روکا' تو انھوں نے کہا نو کمنٹ۔ یہ پروگرام ٹی وی پر نشر ہوا اور قانون کی حکمرانی کی درگت بنتے ہوئے قانون کے محافظ دیکھتے رہے۔ ایگزیکٹ کا ٹی وی چینل بول ہے جس کے خلاف پیمرا نے بار بار نوٹس دیے اور ہر بار اسے سندھ ہائی کورٹ سے حکم امتناعی ملتا رہا۔ ایک بار اس چینل کی نشریات کھولنے میں ذرا تاخیر ہوئی تو پیمرا سے بڑی سختی سے پوچھا گیا کہ اسے یہ جرأت کیسے ہوئی۔ یہ تمام ٹیلی فون کالز ریکارڈ میں محفوظ ہیں' مگر عدالت عظمیٰ نے کوئی ایکشن نہیں لیا۔

آپ این اے ۱۲۰ کے ضمنی انتخاب کے احوال کا جائزہ لیجیے' وہاں سے مسلم لیگ کے کارکن جس طرح اٹھائے گئے اور

ووٹ ڈالنے کا عمل جس سست رفتاری کا شکار رکھا گیا، ان سنگین خلاف ورزیوں کی غیر جانب دارانہ تحقیقات ہونی چاہیے۔ اس وقت نواز شریف کی فہم و فراست کا بہت کڑا امتحان ہے۔ ان کی تمام تر کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ان کی جماعت میں گروہ بندی اور ٹوٹ پھوٹ نہ ہونے پائے' دراصل سیاسی جماعتوں کے استحکام کا پاکستان کے داخلی استحکام کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے۔ اس اعتبار سے میاں صاحب کی ذمے داری میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔ انھیں اعتدال اور بالغ نظری کی راہ اختیار کرنا ہوگی۔ اسی طرح فوج اور عدلیہ کو بھی اپنی آئینی حدود میں رہنا ہوگا کہ یہی سلامتی کا راستہ ہے۔

جناب قیوم نظامی

وہ روزنامہ نوائے وقت میں تجزیاتی کالم لکھتے اور اپنے سیاسی تجربات کی روشنی میں بنیادی مسائل کا حل پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں سیمینار کے انعقاد پر قریشی صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ دراصل ہمارا ان دنوں اداروں کے بجائے شخصیات پر زیادہ زور ہے جبکہ افراد آتے جاتے رہتے ہیں اور ادارے مستقل طور پر کام کرتے ہیں۔ ریاست اداروں سے پہچانی جاتی ہے۔ یہ سیاسی جماعتیں، یہ پارلیمنٹ' یہ عدلیہ' یہ فوج ہمارے قومی ادارے ہیں جو آئین میں دیے ہوئے اختیارات کے مطابق اپنے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ ہمیں فروعی باتوں پر وقت ضائع کرنے کے بجائے اس امر کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ جو سسٹم امورِ مملکت چلانے کے لیے بنے ہوئے ہیں' وہ کیا ڈلیور کر رہے ہیں اور عوام کو کتنی ریلیف بہم پہنچا رہے ہیں اور اُن کی صلاحیت کار کیسی ہے۔ این ڈی پی کی ایک تازہ رپورٹ میں پاکستان کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''سیاسی مقاصد کے زیر اثر اصلاحات سسٹمز کی صلاحیت' میرٹ اور اعتبار کے بنیادی ایشوز حل کرنے میں ناکام رہی ہیں۔'' اسی طرح ورلڈ جسٹس رپورٹ میں یہ بتایا گیا ہے کہ قانون کی حکمرانی کے اعتبار سے پاکستان ۱۱۳ ملکوں میں ۱۰۶ ویں نمبر پر ہے۔ یہ اشاریے ہمیں احساس دلاتے ہیں کہ آئین کی بالادستی اور قانون کی حکمرانی قائم کرنے کے لیے مزید بہت کچھ کرنا ہوگا اور اپنی ذمے داریاں دوسروں پر ڈالنے کے بجائے خود احتسابی اور امن عامہ کا نظام بہت بہتر بنانا ہوگا۔ پولیس کو سیاست سے آزاد کیے بغیر امن عامہ قائم ہو سکتا ہے نہ کرپشن پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اعلیٰ مناصب پر اہل اور دیانت دار افراد کا انتخاب ازبس ضروری ہے۔

انھوں نے کہا کہ تعصب ہمارا بہت بڑا سماجی مسئلہ ہے جس نے ہماری پوری زندگی میں بگاڑ پیدا کیا ہے۔ اسلام ہر نوع کے تعصب کا سخت مخالف ہے اور باہمی اعتماد اور باہمی خیر خواہی کا درس دیتا ہے۔ ہماری سیاست' ہمارے نظم و نسق اور وسائل کی تقسیم میں ایک تعصب اور جانب داری پائی جاتی ہے۔ اس بیماری نے ہمارے داخلی استحکام کو نہایت منفی انداز میں

متاثر کیا ہے۔ ہمیں اس کا علاج تلاش کرنا ہوگا۔

پروفیسر شبیر احمد خاں

خاں صاحب پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ سیاسیات کے استاد ہیں اور اُنہوں نے اپنے قیام کے دوران کئی سال امریکہ کے نظام کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ اُن کے خیال میں سیمینار کے موضوع میں یہ نکتہ شامل ہے کہ ہمارا داخلی استحکام وقت کی ایک اہم ترین ضرورت ہے۔ ہمیں گفتگو اس پہلو پر کرنی چاہیے کہ اس کی ایک جامع حکمت عملی کیا ہوسکتی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ داخلی استحکام کا دارومدار سیاسی، معاشی اور سماجی استحکام پر ہے۔ ان شعبوں میں استحکام کیونکر لایا جاسکتا ہے، دنیا میں اس سوال کا جواب اب مختلف طریقے سے تلاش کیا جاتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں ہر مسئلے کا حل پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ امریکی صدر نے شمالی کوریا کو غیر ذمے دار ایٹمی ملک کی حیثیت سے مکمل طور پر صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی دھمکی دی ہے۔ بین الاقوامی امور کے ماہرین یہ واضح اشارے دے رہے ہیں کہ اس دھمکی میں پاکستان بھی شامل ہے، چنانچہ ہمیں اپنے جوہری ہتھیاروں کے بارے میں کمال ذمے داری کا ثبوت دینا ہوگا۔ خوش قسمتی سے ہمارا ریکارڈ اس ضمن میں قابل تعریف ہے اور ویانا میں انٹرنیشنل ایٹمی ایجنسی نے پاکستان کے کردار کی تعریف کی ہے، مگر امریکی عزائم پر ہمیں کڑی نگاہ رکھنا ہوگی جو ایٹمی پھیلاؤ کا مسئلہ بار بار اُٹھا رہا ہے۔

پروفیسر صاحب نے سیاسی استحکام کی صورت حال پیش کرتے ہوئے کہا کہ جمہوریت دراصل بنیادی قومی امور میں زیادہ سے زیادہ اتفاق رائے پیدا کرنے کا نام ہے، مگر بدقسمتی سے آج ایک بھی ایشو ایسا نہیں جس پر قومی اتفاق رائے پایا جاتا ہو۔ یہی حال قانون کی حکمرانی کا ہے جس کی من مانی تشریح کی جارہی ہے۔ سیاست اور معیشت دو جڑواں بہنیں ہیں جنھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ غریب اور امیر کے درمیان ایک ہولناک معاشی تفاوت دیکھنے میں آرہا ہے۔ ہمارے وزیر خزانہ نے بڑے فخر سے قومی اسمبلی میں اعلان کیا کہ ہم نے مزدور کی اجرت تیرہ ہزار روپے ماہانہ مقرر کی ہے۔ ہمارے اندر سماجی استحکام کا یہ عالم ہے کہ اخلاقی اور معاشرتی قدریں جو کبھی قومی معاملات میں فیصلہ کن کردار ادا کرتی تھیں، وہ تیزی سے روبہ زوال ہیں۔ تعلیمی نظام کی خرابیوں نے انھیں شدید نقصان پہنچایا ہے۔ پنجاب کی بارہ جامعات کے احوال خاصے ناگفتہ بہ ہیں۔ ان حالات میں علاقائی استحکام کے ہدف تک آسانی سے نہیں پہنچا جاسکتا۔ بلاشبہ قوم کے اندر زبردست قوتِ مزاحمت پائی جاتی ہے اور اس نے انتہائی نامساعد حالات کا بڑی مردانگی سے مقابلہ کیا ہے، دہشت گردی پر قابو پانے میں اپنی حکومت اور فوج کے ساتھ عظیم قربانیاں دی ہیں اور ترقی کی منازل بھی طے کی ہیں، تاہم قابل اور دیانت دار قیادت کا فقدان بڑھتا جارہا ہے جس کے لیے ہمیں انسان سازی پر غیر معمولی توجہ دینا ہوگی۔

لیفٹیننٹ جنرل (ر) غلام مصطفیٰ صاحب

جنرل صاحب ٹی وی ٹاک شوز اور بین الاقوامی مذاکروں میں حصہ لیتے اور نپے تلے الفاظ میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہماری سوچ اپنے اپنے دائروں تک محدود ہو کے رہ گئی ہے۔ ہمارے دستور میں ایک اداراتی فریم ورک موجود ہے جس کے اندر کام کرتے رہنے سے قومی استحکام پیدا ہوسکتا ہے۔ جب ہم اداروں کے بجائے شخصیتوں کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں، تو سنگین مسائل پیدا ہوتے ہیں اور طاقت کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ میں اب فوج سے ریٹائر ہو چکا ہوں اور مجھے اعتراف ہے کہ ماضی میں غلطیاں ہوئی ہیں مگر پاکستانی افواج کی سوچ قومی ہے اور وہ پاکستان کی سالمیت، سلامتی اور خودمختاری کے تحفظ کو اولین اہمیت دیتی ہیں۔ ممکن ہے نواز شریف کے ساتھ انصاف نہ ہوا ہو، مگر انھیں گلیوں، سڑکوں اور جلسوں میں عدلیہ اور فوج پر نکتہ چینی نہیں کرنی چاہیے۔ اُن کے لیے مناسب یہی ہوگا کہ وہ سپریم کورٹ کے فیصلے پر عمل درآمد کریں اور اپنی ذات سے بالاتر ہوجائیں۔ میں نے ۲۰۱۳ء میں مسلم لیگ نون کو ووٹ دیا تھا اور میرے نزدیک پارٹی ہی اصل طاقت ہے۔ انھوں نے کہا میرے نزدیک سیاست دانوں کے لیے فوج کو ساتھ لے کر چلنا بڑا آسان ہے کہ اسے قومی مفادات بڑے عزیز ہیں۔

جنرل صاحب نے علاقائی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ مجھے گزشتہ دنوں ایک سیمینار میں شریک ہونے کا موقع ملا جس میں افغانستان کی مقتدر شخصیتیں آئی ہوئی تھیں۔ دوروزہ کانفرنس میں اس امر پر مکمل اتفاق پایا گیا کہ پاکستان کے تعاون اور اشتراکِ عمل کے بغیر افغانستان میں امن قائم نہیں ہوسکتا اور یہ کہ افغانستان اور پاکستان ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ انھیں الگ نہیں کیا جاسکتا۔ ان حقائق اور جذبات کی روشنی میں ہم ایک ایسی حکمت عملی وضع کرسکتے ہیں جو ہمارے داخلی استحکام کے لیے مضبوط عوامل فراہم کرتی رہے۔ ہمیں سی پیک کو اس زاویے سے بھی دیکھنا ہے کہ وہ پاکستان کا اپنا منصوبہ نہیں بلکہ چین کے اسٹریٹیجک اہداف پر مبنی ہے جس سے پورے خطے کو فائدہ پہنچ سکتا ہے، مگر ہمیں توازن اور دوربینی سے کام لینا ہوگا۔

جناب مجیب الرحمن شامی نے جنرل صاحب سے پوچھا سپریم کورٹ کے فیصلے پر تو عمل درآمد ہو چکا اور اب وہ مزید کیا چاہتے ہیں۔ ان کا جواب تھا کہ اداروں کا احترام ازبس لازم ہے اور کوئی ایسی روش اختیار نہیں کرنی چاہیے جو اداروں کے درمیان کشیدگی کا باعث بنے۔ عسکری قیادت نے چیئرمین سینیٹ میاں رضا ربانی کی طرف سے ''عظیم مکالمے'' کی جو تجویز آئی ہے، اُس کا خیر مقدم کیا ہے۔

جناب عبدالرؤف طاہر

پاکستان کے سینئر صحافی جو سیاسی تاریخ کے انسائیکلوپیڈیا سمجھے جاتے ہیں، انھوں نے کہا کہ برصغیر کی تاریخ میں سیاسی قائدین غیر معمولی اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس قدر ادارے اہم ہیں، اسی قدر وہ افراد بھی اہم ہیں جو ادارے چلاتے ہیں۔ قیادت کے بغیر کسی سیاسی جماعت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سیاسی زعما ہی تھے جنھوں نے ۱۹۵۶ء اور ۱۹۷۳ء کے دستور دیے اور ایک عمرانی معاہدے پر پوری قوم کو متحد کیا۔ سیاسی جماعتیں قومی اتفاق رائے پیدا کرنے اور عوام کو وحدت کی لڑی میں پرونے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ سیاسی قائدین اور عوامی نمائندوں کے احتساب کا حق ووٹر کو ہونا چاہیے۔ ووٹ کے تقدس کے لیے آواز اٹھانا ایک قومی ذمے داری ہے جو ایک قابل تحسین عمل ہے۔ انھوں نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ قومی ایکشن پلان کے تحت فرقہ واریت پر قابو پانے کے لیے گزشتہ چند برسوں میں جو اقدامات کیے گئے تھے، اُن کا زیادہ تر اثر حلقہ ۱۲۰ کے ضمنی انتخابات میں زائل ہو گیا ہے۔ مسلم لیگ نون کو شکست سے دوچار کرنے کے لیے جو فرقہ وارانہ تنظیمیں انتخاب میں اتاری گئیں، انھوں نے نفرت بھری تقریریں کیں اور فرقہ وارانہ تعصّبات کو ہوا دی ہے۔

جناب محمد مہدی

مہدی صاحب روزنامہ جنگ میں کالم لکھتے اور خارجہ امور میں ادراک رکھتے ہیں۔ وہ ادارہ ''سوچ'' کے سربراہ ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ حال ہی میں چین سے آئے ہیں جہاں وہ ایک بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ سیمینار کے شرکاء نواز شریف کے سیاسی مستقبل کے بارے میں سوالات پوچھتے اور پاکستان میں وقوع پزیر ہونے والے واقعات پر گہری تشویش کا اظہار کرتے رہے۔ اسلام آباد میں غیرملکی سفارت کار حلقہ این اے ۱۲۰ میں ظاہر ہونے والی انہونیوں کے بارے میں بہت متجسس ہیں۔ ہمیں سنجیدگی سے اس امر کا جائزہ لینا ہوگا کہ پاکستان کو درپیش چیلنجز کی سنگینی کس قدر ہے اور ہمارے اندر کا سیاسی انتشار کیا پیغام دے رہا ہے۔

جناب نجم ولی خاں

منجھے ہوئے کالم نگار ہیں اور جزئیات کی تلاش میں رہتے ہیں۔ انھوں نے پہلا نکتہ یہ اٹھایا کہ سیاسی جماعتیں بھی ہماری

ہیں اور فوج بھی ہماری ہے اور ہمیں گزارہ انہی کے ساتھ کرنا اور مل کر داخلی استحکام کو فروغ دینا ہے۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اداروں کو اپنی اپنی حدود و قیود میں کام کرنا چاہیے۔ پاناما کیس ایک سیاسی ایشو تھا جس کا فیصلہ پارلیمان میں ہونا اور عدلیہ کو الگ تھلگ رہنا چاہیے تھا۔ اسی طرح فوج کی خارجہ پالیسی میں حد سے بڑھی ہوئی مداخلت بھی محلِ نظر ہے کہ جنگ لڑنا اور سفارت کاری کرنا دو مختلف شعبے ہیں۔ تیسرا نکتہ یہ ہے کہ سپریم کورٹ کے رجسٹرار نے صحافیوں سے کہا کہ وہ کمرۂ عدالت میں نگاہیں نیچی کر کے بیٹھا کریں۔ رجسٹرار صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ ابھی کسی ادارے کا جھوٹا تقدس باقی نہیں رہا۔ سوشل میڈیا نے سارے حجاب اتار دیے ہیں۔ اُن کا مشورہ تھا کہ سیاسی اور عسکری قیادت کو ''عظیم مکالمے'' کی راہ اختیار کرنی چاہیے اور مجھے اُن کے اندر لچک بھی محسوس ہو رہی ہے۔

بریگیڈیئر (ر) ریاض احمد طور

طور صاحب قومی سیمینارز میں حصہ لیتے اور تحقیقی کام کرتے رہتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہمارے چند بنیادی مسائل ہیں:۔ (۱) کرپشن (۲) امن عامہ میں بگاڑ (۳) اداروں کی نااہلی (۴) مالیاتی بے راہ روی (۵) اعلیٰ مناصب کے لیے غلط افراد کا انتخاب (۶) غیر تسلی بخش طرز حکمرانی۔ ان بنیادی مسائل حل کرنے کے لیے اعلیٰ درجے کی سیاسی راہنمائی درکار ہوتی ہے جو پارلیمنٹ کو فراہم کرنی چاہیے۔ دونوں ایوانوں پر مشتمل ایک مختصر کمیٹی تشکیل دی جائے جو ایک واضح قومی ایکشن پلان ترتیب دے۔ اس پر عمل درآمد کے لیے ایک اپیکس کمیٹی قائم کی جائے۔ یہ کمیٹی ہر تین ماہ بعد صورت حال کا جائزہ لے اور اگر مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو رہے ہوں تو نئی تجاویز پر غور کرے۔ دونوں ایوانوں کی وہ کمیٹیاں جو خارجہ امور سے وابستہ ہیں، اُن کے تعاون سے خارجہ پالیسی کی صورت گری ہونی چاہیے۔ اسی طرح مالی معاملات کی نگرانی کے لیے قائم کمیٹیاں مالی امور میں فیصلہ سازی کرنے کی مجاز ہوں۔ لا اینڈ آرڈر کی کمیٹی داخلی استحکام کی نگہداشت کرے۔ ان کمیٹیوں کی اعلیٰ کارکردگی کے لیے انھیں تھنک ٹینکس کی معاونت فراہم کی جائے۔ یہ تھنک ٹینکس آزادانہ فضا میں کام کریں گے اور حکومت کے اثر و نفوذ سے آزاد بےلاگ تجزیے اور اپنی سفارشات پیش کریں گے۔ امریکہ میں زیادہ تر تھنک ٹینکس سی آئی اے اور دوسرے سرکاری اداروں کی امداد سے چلتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی آزادانہ تحقیقی کاوشوں کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ امریکہ میں اعلیٰ

مناصب پر تقرر کیے جانے والے افراد کی منظوری سینیٹ کی بارہ رکنی کمیٹی دیتی ہے۔ وہاں سماعت (Hearing) کے ذریعے حکومت کی طرف سے نامزد فرد کا کچا چٹھا سامنے آتا ہے۔ ہمیں بھی ایک ایسا نظام وضع کرنا چاہیے جس میں نیب کے چیئرمین اور اعلیٰ حکومتی عہدے داران کا انتخاب ایک اسپیکس کمیٹی کے ذریعے عمل میں لایا جائے۔

جناب ڈاکٹر ظفر معین ناصر وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی

ڈاکٹر صاحب کا شمار معاشی ماہرین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے داخلی استحکام کی جامع حکمت عملی کے سلسلے میں دو کلیدی تقاضوں کی نشان دہی کی۔ پہلا یہ کہ عوام کے اندر وطنیت کا جذبہ بیدار کیا جائے۔ ہمارے ہاں یہ جذبہ بڑی حد تک ناپید ہے۔ ہماری حکومتوں نے قومی یک جہتی کو فروغ دینے کی طرف کما حقہ توجہ نہیں دی۔ ہماری طرز حکومت اور ہمارا تعلیمی نظام لوگوں کو یہ احساس دلانے میں ناکام رہا ہے کہ ان کی شناخت ان کے وطن سے ہے جس کے مستحکم ہونے سے وہ خود بھی مستحکم ہوں گے۔ بدقسمتی سے ہمارا میڈیا بھی فکری ہم آہنگی پیدا کرنے کے بجائے معاشرے کو تقسیم کرتا جا رہا ہے۔ آپ کسی چینی، جاپانی، امریکی اور بھارتی شہری سے ملیں گے، تو وہ اپنے ملک اور وطن کا ذکر فخر سے کرے گا جبکہ ہم پاکستان میں کیڑے نکالنے سے نہیں تھکتے جو اللہ تعالیٰ کی بہترین نعمت ہے۔ ہماری اس نفسیات کی تشکیل میں غلامانہ ذہنیت نے سب سے زیادہ کردار ادا کیا ہے جو انگریزی دور حکومت میں پرورش پاتی رہی اور حصول آزادی کے بعد بھی اس کا اثر قائم رہا۔

ڈاکٹر صاحب نے اس عظیم حقیقت کی بھی نشان دہی کی کہ داخلی استحکام کے لیے ہمیں ایک مساوی اقتصادی ترقی کا اہتمام کرنا ہوگا۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد ہم نے مختلف شعبوں میں حیرت انگیز ترقی کی ہے اور اہل پاکستان کے معاشی حالات پہلے سے بہتر ہوئے ہیں، مگر یہ ترقی ناہموار اور غیر مساویانہ تھی۔ میں بلوچستان اور سندھ جاتا ہوں، تو ایسے علاقے دیکھنے میں آتے ہیں جہاں پس ماندگی کا وہی عالم ہے جو آزادی سے پہلے تھا۔ پیروں میں جوتے نہیں اور جسم پر پورے کپڑے نہیں۔ آج بھی پینے کا پانی پانچ پانچ چھ چھ میل سے لانا پڑتا ہے۔ آپ عوام تک ترقی اور خوشحالی یکساں طور پر پہنچائیں گے، تو انھیں احساس ہوگا کہ یہ نعمتیں مجھے میرے وطن نے دی ہیں اور مجھے اس کی حفاظت اور عظمت کے لیے خون پسینا ایک کر دینا چاہیے۔

جناب وائس چانسلر نے ''**پائنا**'' اور ''سوچ'' کے زیر انتظام ہونے والے سیمینار پر خوشی کا اظہار کیا اور بتایا کہ ہماری جامعہ میں بھی تھنک ٹینکس ہیں جو مسائل کا تجزیہ کرتے اور بیش قیمت سفارشات دیتے رہے ہیں، مگر حکومت کے منصوبہ ساز انھیں اہمیت نہیں دیتے، چنانچہ اس بے اعتنائی کے باعث تخلیقی اور تحقیقی عمل صحیح طور پر فروغ نہیں پا سکا جو بہت بڑا قومی

نقصان ہے کیونکہ نظم مملکت چلانے والے ادارے جدت اور تازگیٔ افکار سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔

جناب جاوید نواز

جاوید نواز گزشتہ تیس برسوں سے مسقط میں مقیم ہیں اور حکومت عمان نے انھیں بزنس لیڈر کا اعزاز عطا کیا ہے۔ انھوں نے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ حضرت قائداعظمؒ نے داخلی استحکام کے بنیادی اصول اپنی گیارہ اگست کی تقریر میں بیان فرما دیے تھے۔ ان اصولوں کے مطابق تمام شہری برابر ہوں گے اور ریاست ان کی جان، مال اور آبرو کے تحفظ کی ذمے دار ہوگی۔ ہر شہری کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انھوں نے ارشاد فرمایا کہ کرپشن قومی وجود کے لیے بہت بڑا چیلنج ہے جس کے خلاف جہاد کرنا ہوگا۔ قائداعظمؒ نے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے افتتاح کے موقع پر فرمایا کہ ہمیں ایک ایسا معاشی نظام قائم کرنا ہوگا جس میں صارف اور صانع دونوں کے مفادات میں ایک توازن قائم رکھا جا سکے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگر ہم قائداعظمؒ کے فرمودات پر عمل کرتے تو فرقہ ورانہ عصبیتیں جنم لیتیں نہ عدم استحکام کے عوامل طاقت ور ہوتے۔ ہمیں آج پورے عزم کے ساتھ نوٹ اور ووٹ کا رشتہ توڑنا ہوگا۔ ماضی میں جاگیردار، بعد ازاں سرمایہ دار سیاست پر غالب رہے اور اب جنات بھی سرگرم عمل ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ میں یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ میں تیس سال سے مسقط میں رہتا ہوں جہاں یہ طریقہ رائج ہے کہ اقامہ لیتے وقت ایک خانے میں تنخواہ کی رقم درج کرنا پڑتی ہے جو کبھی لی نہیں جاتی۔ میں نے اپنے قیام کے دوران یہ تنخواہ کبھی وصول نہیں کی۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ خود کمائیں اور ہم سے کچھ نہ لیں۔ اس حوالے سے سپریم کورٹ کا نواز شریف کے بارے میں فیصلہ کم علمی کا تاثر دیتا ہے۔

جناب ایس ایم ظفر

سیمینار کے صدر جناب ایس ایم ظفر نے اس امر پر بہت خوشی کا اظہار کیا کہ سبھی مقررین کی باتوں میں قوم کا درد نمایاں ہے اور ان کے دل حالات کی بہتری کے لیے دھڑک رہے ہیں۔

جب ہم اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں کا جائزہ لینے کا عمل شروع کرتے ہیں تو اصلاح احوال کی صورت نکلنے لگتی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب ہم دشمن کی تلاش میں نکلتے ہیں تو آخر میں پتا چلتا ہے کہ اصل دشمن تو ہم خود ہیں۔ تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک منصفانہ نظام ہی عوام کے اندر یہ گہرا شعور بیدار کرتا ہے کہ یہ وطن ہمارا ہے اور اس کی

پاسبانی ہماری ذمے داری ہے۔ اس نظام کے اندر یہ اہتمام کیا جانا چاہیے کہ عوام اپنے حکمران منتخب بھی کرسکیں اور انھیں اپنے ووٹ کے ذریعے ہٹا بھی سکیں۔ ہٹانے کا اختیار معاملات درست رکھنے کے لیے ازبس ضروری ہے۔ آپ اگر حکمرانوں کو غیر تسلی بخش کارکردگی پر اقتدار سے محروم کر دیتے ہیں تو آنے والے حکمران احتیاط سے کام لیں گے اور اچھی کارکردگی کا ثبوت دینے کی کوشش کریں گے۔ اسی مقدمے کا ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ آپ جو نظام بھی اختیار کریں' اس کے تمام تقاضے پورے کیے جانے چاہییں۔ چین' سنگاپور' شمالی کوریا نے ڈکٹیٹرشپ اختیار کی اور چین جو ہمارے بعد آزاد ہوا تھا' وہ آج ترقی کی بلندیوں پر فائز ہے۔ ہم نے درست طور پر جمہوری نظام اپنایا ہے' تو ہمیں ظاہری شکل وصورت سے آگے بڑھ کر اس کی عظیم خصوصیات کو اپنے نظام زندگی کا ایک ناگزیر حصہ بنالینا ہوگا۔

جناب ایس ایم ظفر کہہ رہے تھے کہ نظام کوئی بھی ہو' اس کا بنیادی ہدف انصاف کی فراہمی ہونا چاہیے۔ انصاف کے اداروں کا احترام سب پر لازم ہے۔ آج کی بحث وتمحیص سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آئین کی بالادستی' قانون کی حکمرانی' اتفاق رائے کی سیاست' انصاف کی بروقت فراہمی ایک منصفانہ معاشی نظام اور اتفاق رائے کی سیاست اور اداروں کے مابین اعتماد ہی داخلی استحکام کی ضمانت دے سکتے ہیں جو اندرونی اور بیرونی چیلنجز کا مقابلہ بھی کر سکے گا اور عالمی برادری میں ہمارا سر بھی بلند رکھے گا۔ میں حالات سے پُرامید ہوں اگرچہ بہتری کی رفتار قدرے سست ہے۔ توقع ہے کہ اس طرح کے سیمینار مہمیز کا کام کرتے رہیں گے۔

شاہ صاحب نے اپنا صدارتی خطبہ اس اہم نکتے پر ختم کیا کہ ہمارا کام لوگوں کے اندر حوصلہ پیدا کرنا' انھیں مایوسی سے نکالنا اور پاکستان میں پائی جانے والی خوبیوں کا تذکرہ کرتے رہنا ہے۔ بدقسمتی سے میڈیا ٹاک شوز اور پارلیمان میں ہونے والی بحثیں انتشار پیدا کرنے کا باعث بن رہی ہیں اور ان سے مستقبل کا روشن چہرہ دھندلا جاتا ہے۔ مذاکروں اور فکری نشستوں کا معیار بلند اور ایقان افروز ہونا چاہیے۔ اختلاف برائے اختلاف کے بجائے ہمیں اختلاف برائے تعمیر کا اصول اپنانا ہوگا۔ مجھے خوشی ہے کہ اس سیمینار میں بہت اچھی تجاویز سامنے آئی ہیں جو دوریوں کو قربتوں میں تبدیل کرسکتی ہیں۔ ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ جمہوریت ہی ہمارا مستقبل ہے اور باہمی احترام کے جذبے سے ہم اپنی غلطیوں کی تلافی کر سکتے ہیں۔

سیمینار کے اختتام پر غیر رسمی گفتگو میں حاضرین محفل اس یقین کا اظہار کرتے رہے کہ آزادانہ تبادلۂ خیال سے معاملات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور سوئی ہوئی صلاحیتیں بیدار ہونے لگتی ہیں۔ اس کے علاوہ اچھے خیالات کے ابلاغ سے نت نئے امکانات بھی جنم لیتے ہیں۔ یہ سیمینار ۲۲ ستمبر کی سہ پہر منعقد ہوا تھا جب ملکی حالات بہت کشیدہ تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ نواز شریف احتساب عدالتوں کا بائیکاٹ بھی کریں گے اور اداروں کے ساتھ محاذ آرائی کی پالیسی جاری رکھیں گے' مگر ایک ہفتے کے اندر اندر پورا سیاسی منظرنامہ تبدیل ہوگیا ہے۔ نواز شریف پاکستان واپس آگئے ہیں اور احتساب کی عدالت میں پیش ہو چکے ہیں۔ اُن کا دوٹوک اعلان سامنے آیا ہے کہ وہ اداروں کا احترام کریں گے اور آئین اور قانون کی سربلندی کے لیے کوشاں رہیں گے۔

چمکتے بھارت کا سیاہ چہرہ

سید عاصم محمود

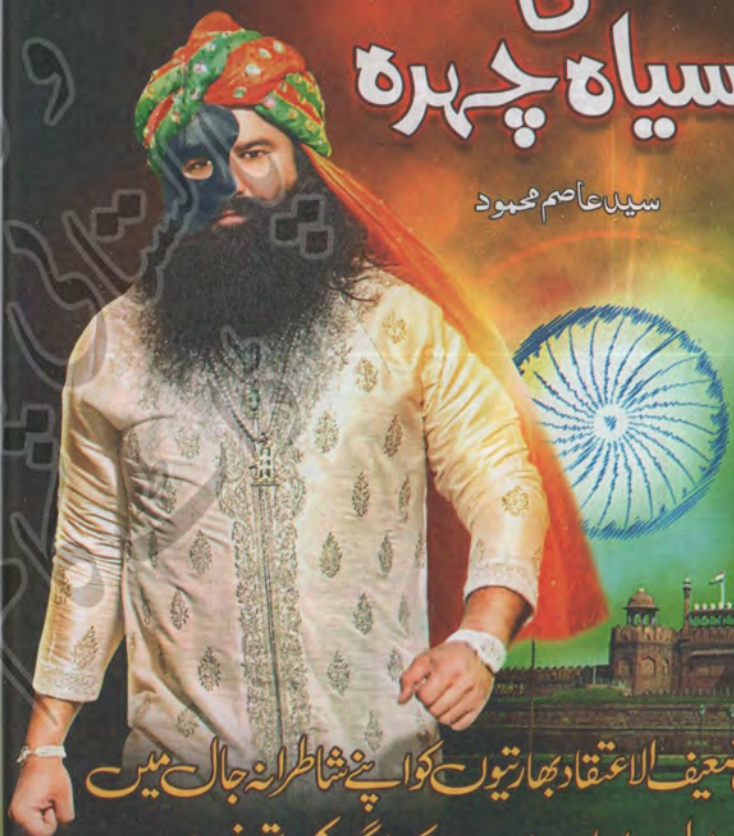

لاکھوں ضعیف الاعتقاد بھارتیوں کو اپنے شاطرانہ جال میں پھنسا لینے والے نام نہاد اور بدکردار گرو کی تحیر خیز داستان

حکومت سنبھال کر پچھلے تین برس سے بھارتی وزیراعظم نریندر مودی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں کہ عالمی سطح پر بھارت کو معاشی و سیاسی سپر پاور کے طور پر پیش کیا جائے۔ وہ اندرون و بیرون ملک بھارت کو ترقی یافتہ، جدید اور خوشحال مملکت بنانے کے بلند و بالا دعویٰ کرتے ہیں لیکن تلخ معاشی ترقی کے باوجود حقائق خاصی حد تک مختلف ہیں۔ وجہ یہ کہ بھارت میں معاشی ترقی سے مٹھی بھر طبقہ ہی مستفید ہو رہا ہے۔ سوا ارب بھارتیوں میں سے تقریباً ''۷۵ فیصد آبادی'' بدستور جہالت، غربت اور پس ماندگی کا شکار ہے۔

گرمیت سنگھ کی کئی فلموں میں سے ایک کا منظر

حال ہی میں سامنے آنے والا گرمیت رام سنگھ کا اسکینڈل اس امر کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

دماغ چکرا دینے والے انکشافات کا سلسلہ ۲۰۰۲ء میں شروع ہوا جب نام نہاد بھارتی گروہ' گرمیت رام رحیم سنگھ کے ظلم کا شکار ایک لڑکی نے بھارت میں برسراقتدار تب کے وزیراعظم، اٹل بہاری واجپائی کو ایک خط لکھا۔ خط میں بدنصیب لڑکی لکھتی ہے:

''میرا تعلق (بھارتی) پنجاب سے ہے۔ میں سرسہ (شہر) میں ڈیرا سچا سودا سے بہ حیثیت سدھوی (سادھو کی تانیث) منسلک ہوں۔ مجھے وہاں آئے پانچ سال ہو چکے۔ ڈیرے میں مجھ جیسی کئی لڑکیاں رہتی اور مختلف کام کاج کرتی ہیں۔ وہاں ہمارا جسمانی استحصال ہوتا ہے۔ ڈیرے کا ناظم، مہاراج گرمیت سنگھ لڑکیوں پر ظلم ڈھاتا ہے۔ میں گریجویٹ ہوں۔ تعلیم یافتہ ہونے کے ناتے مہاراج پر اندھا اعتماد نہیں رکھتی۔ مگر میرے ناخواندہ اہل خانہ اس کی اندھی تقلید کرتے ہیں۔ ان کے دباؤ پر ہی میں مجبوراً سدھوی بنی تھی۔

''دو سال قبل کی بات ہے۔ رات دس بجے مہاراج کی ایک قریبی مریدنی میرے پاس آئی اور بتایا کہ انھوں نے مجھے اپنی ''گپھا'' (اپنے کمرا استراحت) میں بلایا ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ مہاراج نے خود مجھے یاد کیا ہے۔ مجھے خیال آیا کہ شاید وہ مجھے خصوصی روحانی تعلیم سے آگاہ کریں گے۔

''جب میں ''گپھا'' میں گئی، تو دیکھا کہ مہاراج بستر پر بیٹھا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ریموٹ کنٹرول دبا ہے جبکہ پہلو میں رکھے تکیے پر پستول دھرا تھا۔ وہ ایک فحش فلم دیکھ رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میں حیران پریشان رہ گئی اور مجھے چکر سا آ گیا۔

مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

''میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ مہاراج ایک عیاش آدمی ہوگا۔ اس نے ٹی وی بند کیا، مجھے بستر پر بٹھایا اور پانی پلایا۔ پھر کہنے لگا' مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔ لہٰذا میں تمہاری قربت چاہتا ہوں۔ میری چیلی بن کر تم اپنا تن من دھن میرے نام کر چکی۔ لہٰذا تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

جب میں نے اس کی دست درازیوں کو روکنا چاہا تو وہ بولا' کیا تم مجھے بھگوان (خدا) نہیں سمجھتیں؟ میں نے کہا کہ بھگوان کبھی ایسی ذلیل حرکتیں نہیں کرتا۔ وہ بولا کہ شری کرشنا بھی بھگوان تھا۔ مگر وہ ۳۶۰ گوپیوں کا مالک تھا جن کے ساتھ وہ پیار کا ناٹک کھیلتا۔ لہٰذا میں کوئی انوکھا کام نہیں کر رہا۔

''مہاراج نے پھر پستول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، میں چاہوں تو تمہیں گولی مار کر تمہاری لاش غائب کرا سکتا ہوں۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ تم کہاں گئی۔ تمہارا خاندان میرا اندھا عقیدت مند ہے۔ میں ان کا آقا ہوں اور وہ میرے غلام! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تمہارا خاندان کبھی میری مخالفت نہیں کر سکتا۔

''اس نے یہ بھی بتایا، حکومتوں کے ساتھ میرے قریبی تعلقات ہیں۔ پنجاب اور ہریانہ کے وزرائے اعلیٰ اور وفاقی وزیر میرے چرن (پاؤں) چھوتے ہیں۔ سیاست دانوں کو میری حمایت درکار ہوتی ہے اور وہ مجھ سے پیسے بھی لیتے ہیں۔ وہ میرے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ میں چاہوں تو تمہارے باپ اور بھائیوں کی سرکاری ملازمتیں چٹکی بجاتے ہی ختم کرا دوں۔ میں انہیں قتل بھی کروا سکتا ہوں اور ان کی لاشوں کا نام و نشان بھی نہیں ملے گا۔''

''مہاراج پھر کہنے لگا، شاید تمہیں معلوم ہو میں نے ہی ڈیرے کے منیجر، فقیر چند کو قتل کرایا ہے۔ وہ بھی میرے حکم بجا لانے کو تیار نہ تھا۔ آج کوئی نہیں پوچھتا کہ فقیرا کہاں گیا۔ اس کے قتل کا ایک بھی ثبوت موجود نہیں۔ روپے کی طاقت سے میں پولیس، سیاست دانوں کو اور انصاف خرید سکتا ہوں۔''

''یوں اس نے دھونس دھمکی سے مجھے خوفزدہ کیا اور مجھے تباہ کر دیا۔ پچھلے تین ماہ سے یہ معمول ہے کہ ہر بیس پچیس دن بعد مجھے بلاتا اور اپنی خباثت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اب مجھے معلوم ہو چکا کہ وہ ڈیرے میں رہتی کئی لڑکیوں کی زندگیاں تباہ کر چکا۔''

''ڈیرے میں تقریباً چالیس سے زائد لڑکیاں پینتیس تا چالیس سال کی ہو چکیں۔ اب ان کی عمر شادی کی نہیں رہی۔ انہوں نے اپنی زندگیاں ڈیرے کے نام کر دی ہیں۔ اکثر

لڑکیاں تعلیم یافتہ ہیں۔ مگر ڈیرے پر ان کی زندگی جہنم بن چکی کیونکہ ان کے اہل خانہ انہیں گھر واپس نہیں لانا چاہتے۔ وہ سفید لباس زیب تن کرتی اور سروں پر چادر لیتی ہیں۔ مہاراج کا حکم ہے کہ ہم مردوں کی طرف نہ دیکھیں اور ان سے دس فٹ دور رہیں۔''

''ہم دوسروں کو دیوی دکھائی دیتی ہیں۔ مگر یہ ہمیں ہی معلوم ہے کہ ہماری حیثیت طوائفوں جیسی ہے۔ میں نے دو تین بار خاندان والوں کو بتانا چاہا کہ ڈیرے میں کیا قیامت برپا ہے، مگر وہ کچھ سننے پر تیار نہ تھے۔ میرا باپ تو غصّے میں آ گیا۔ کہنے لگا کہ تم دیوتا کے ساتھ خوش نہیں، تو تم کہاں سے خوشیاں پاؤ گی؟ لگتا ہے کہ تیرا دماغ خراب ہو چکا۔ توست گرو (مہاراج) کا نام جپا کر۔ گھر والوں نے جب مجھے دھتکار دیا، تو میں مجبوراً مہاراج کے ہر حکم کی تعمیل کرنے لگی۔''

''ڈیرے سے واپس جا کر کوئی لڑکی گھر والوں کو مہاراج کے ظلم کی داستان بتائے، تو پہلے کوئی اس کی باتوں پر یقین نہیں کرتا۔ پھر اکثر ڈیرے کے غنڈے لڑکی کو دھمکیاں دیتے ہیں کہ اس نے زبان کھولی، تو وہ اُسے مار ڈالیں گے۔ چنانچہ خوف کا شکار لڑکیاں تباہ ہونے کے باوجود خاموش رہتی ہیں۔

اگر میں نے بھی اپنا نام و پتا بتا دیا، تو ڈیرے کے غنڈے مجھ سمیت میرے پورے خاندان کو قتل کر دیں گے۔ میں مہاراج کے گھناؤنے کرتوت افشا کرنا چاہتی ہوں مگر قتل ہونے کے لیے تیار نہیں۔ میں نے خط میں سبھی انکشافات کر دیے ہیں۔ اگر میڈیا یا کوئی سرکاری ایجنسی ان کی چھان بین کرے، تو ڈیرے میں رہائش پذیر چالیس پینتالیس لڑکیاں سچ سامنے لے آئیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ مہاراج نے ہماری زندگیاں برباد کر دی ہیں۔''

گرمیت سنگھ اپنے پیروکاروں کے ساتھ موج مستی کرتے ہوئے

یہ ہے چمکتا بھارت!

بھارت ہزار ہا دیوی دیوتاؤں کا ملک ہے۔ زمانہ قدیم میں ہر گاؤں اپنے اپنے دیوی دیوتا رکھتا تھا۔ رفتہ رفتہ ہندوستان میں دو دیوتاؤں' وشنو اور شیو نے اہمیت اختیار کر لی۔ ان دونوں کے مختلف نام ہیں مثلاً رام، کرشن اور ہری وشنو ہی کے روپ ہیں۔

جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا، تو انہوں نے دیکھا کہ مملکت میں آباد بت پرستوں کی اکثریت مذہبی لحاظ سے تقسیم ہے۔ ہر دیوی دیوتا کے پیروکار ایک دوسرے سے نبرد آزما تھے۔ انگریز بت پرستوں کو مسلمانوں سے لڑانا چاہتے تھے تاکہ ملکی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر سونے کی چڑیا (ہندوستان) اپنے قبضے میں لے سکیں۔ اس ضمن میں ضروری تھا کہ ہندوستانی بت پرست متحد ہو جائیں۔

یہی مقصد پانے کی خاطر انگریز اور جرمن ماہرین یہ پروپیگنڈا کرنے لگے کہ ہندوستانی بت پرست ایک عظیم مذہب کے وارث ہیں۔ انہوں نے اپنے اس ایجاد کردہ مذہب کو ''ہندومت'' کا نام دیا۔ انگریز مؤرخین نے یہ پروپیگنڈا بھی کیا کہ ہندوستان کے مسلم سلاطین ہندوؤں پر ظلم و ستم ڈھاتے رہے ہیں۔ اس پروپیگنڈے کی مدد سے وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو باہم لڑانے میں کامیاب رہے۔ یہی نہیں، ہندوستان میں ایک نئے مذہب کا قیام عمل میں آ گیا۔

انیسویں صدی سے انگریزوں کے پروردہ بت پرستوں کے لیڈر ہندوستان میں بتوں کی پوجا کرنے والوں کو ہندومت کے پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی کوششیں کرنے لگے۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے لیکن ہندوستان میں کئی ہزار برس سے رائج ذات پات کا نظام ہندو لیڈروں کے سامنے راستے کی دیوار بن گیا۔

آج بھی بھارت میں خاص طور پر دیہی معاشرہ بالائی اور نچلی ذاتوں میں تقسیم ہے۔ نچلی ذات کے ہندوؤں کو یہ جرأت نہیں ہوتی کہ وہ بالائی ذاتوں سے تعلق رکھنے والے ہم مذہبوں حاکمیت اور اثر و رسوخ کو چیلنج کر سکیں۔ نچلی ذات کا کوئی ہندو اونچی ذات کے ظلم و ستم پر احتجاج کرے، تو عموماً اُسے اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔

قدیم زمانے میں بالائی ذاتوں (برہمن و کھشتری) کے بت پرست نچلی ذاتوں کے انسانوں سے نہایت ذلت آمیز سلوک کرتے تھے۔ ان کی معاشرے میں کوئی وقعت نہیں تھی اور حالت جانداروں سے بھی بدتر۔ ہندوستان میں مسلمان صوفیائے کرام وہ پہلی ہستیاں ہیں جنہوں نے نچلی ذاتوں کے بت پرستوں سے شفقت بھرا سلوک کیا اور انہیں احساس دلایا کہ وہ بھی عزت رکھنے والے انسان ہیں۔ صوفیا کی محبت و شفقت کے باعث ہی لاکھوں بت پرست مسلمان ہو گئے اور ہندوستان میں اسلام کا نور پھیلنے لگا۔

مسلم صوفیا کی تعلیمات نے نچلی ذاتوں سے تعلق رکھنے والے مذہبی راہنماؤں کو بھی متاثر کیا۔ تب وہ اس نظریے کی تبلیغ کرنے لگے کہ تمام انسان برابر ہیں اور یہ کہ بھگوان اور خدا ایک ہی خالق کے دو روپ ہیں۔ انسانیت پسندی کے پرستار ایسے غیر مسلم مذہبی راہنماؤں میں بھگت کبیر، گرو نانک، میرابائی، تلسی داس وغیرہ نمایاں ہیں۔

انوکھے فرقوں کا ظہور

رفتہ رفتہ خاص طور پر انگریزوں کی آمد کے بعد ہندوستان میں بت پرستوں کے مابین ایسے فرقے وجود میں آ گئے جن کی تعلیمات و نظریات ہندومت، اسلام، سکھ مت، عیسائیت کا ملغوبہ تھے۔ انہی میں رادھے سوامی اور سنت مت فرقے بھی شامل ہیں جنہوں نے اتر پردیش، ہریانہ اور پنجاب میں رواج پایا۔

آگرہ کا ہندو گرو، شیو دیال سنگھ (۱۸۷۸ء۔۱۸۱۸) سنت مت اور رادھے سوامی فرقوں کی مشہور ہستی گزرا ہے۔ اس کے پیروکاروں میں گورداسپور (پنجاب) کا جیمل سنگھ

(۱۸۳۹ء۔ ۱۹۰۳ء) بھی شامل تھا۔ اس نے اپنا ایک فرقہ، رادھے سوامی ست سنگ بیاس قائم کیا۔ قلات، بلوچستان میں پیدا ہونے والا کھیم مل اسی فرقے کا پیروکار تھا۔ فرقے کے دوسرے گروہ بابا ساون سنگھ نے کھیم مل کو ''شہنشاہ شاہ مستانہ بلوچستانی جی مہاراج'' کا خطاب دیا تھا۔

رادھے سوامی اور سنت مت کے پیروکار بھگوان تک پہنچنے کی خاطر تنہائی میں تپسیا (عبادت) کرتے ہیں۔ بھگوان کے شبدھ (نام) دہرانا ان فرقوں کا ایک اہم عمل ہے۔ ان فرقوں کے گرو وقتاً فوقتاً مجالس منعقد کرتے ہیں جن میں بھجن گائے اور شبدھ دہرائے جاتے ہیں۔

۱۹۳۰ء میں بابا ساون سنگھ نے مستانہ بلوچستانی کو ہندوستان کے مختلف حصّوں میں بھجوایا تا کہ وہ تنظیم کے نظریات کی تبلیغ کر سکے۔ مختلف جگہوں کی سیاحت کے بعد آخر وہ سرسہ میں قیام پزیر ہو گیا جو دہلی سے ۱۶۰ میل دور واقع ایک مشہور اور تاریخی شہر ہے۔ وہیں اس نے ۱۹۴۸ء میں ''ڈیرا سچا سودا'' نامی ایک مذہبی وسماجی تنظیم کی بنیاد رکھی۔ یہ بھی رادھے سوامی اور سنت مت فرقوں کے نظریات پر عمل کرنے والا فرقہ ہے۔

جب ۱۹۶۰ء میں مستانہ بلوچستانی چل بسا، تو شاہ ستنام سنگھ اس کا اگلا گرو مشہور ہوا۔ ۱۹۹۰ء میں بڑھاپے کے باعث وہ اپنے موزوں جانشین کو ڈھونڈنے لگا۔ ایک دن اسی نے یہ اعلان کر کے سبھی کو چونکا دیا کہ ۲۳ سالہ گرمیت سنگھ تنظیم کا نیا سربراہ بنے گا۔ ڈیرے (سچا سودا) کے اکثر پیروکاروں کا خیال تھا کہ ایک نوجوان ناظم بھاری بھرکم تنظیمی ذمے داروں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکے گا۔ اسی لیے گرمیت سنگھ کا انتخاب سبھی کو حیران کر گیا۔

چال باز گرو

گرمیت سنگھ ۱۹۶۷ء کو راجھستان کے دیہی علاقے میں پیدا ہوا۔ اس کا جاٹ سکھ باپ، مگھار سنگھ مقامی زمین دار اور ڈیرا سچا سودا کا پیروکار تھا۔ جب گرمیت سات سال کا تھا، تو باپ نے اُسے بھی ڈیرے کا رکن بنوا دیا۔ جب گرمیت نوجوان ہوا، تو وہ جب بھی سرسہ میں واقع ڈیرے کے صدر مقام جاتا، وہاں مختلف سماجی کام انجام دیتا۔ تاہم اُسے روحانیت وغیرہ سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔

جب شاہ ستنام سنگھ اپنا جانشین تلاش کر رہا تھا، تو اس کے ریڈار میں گرمیت سنگھ موجود نہ تھا۔ مگر گرجنت سنگھ راجھستانی نے حالات بدل ڈالے گرجنت سنگھ گرمیت سنگھ کا رشتے دار تھا۔ ۱۹۸۸ء میں وہ خالصتان لبریشن فورس کا سربراہ بن گیا جو ریاست پنجاب کو ہندو بھارتی حکومت سے آزاد کروانا چاہتی ہے۔ گرجنت سنگھ کو یقین تھا کہ اگر گرمیت سنگھ ڈیرا سچا سودا کا لیڈر بن جائے تو خالصتان لبریشن فورس کو تنظیم سے معقول رقم بطور امداد مل سکتی ہے۔ چنانچہ بندوق کی نوک پر اس نے ستنام سنگھ کو مجبور کر دیا کہ وہ گرمیت سنگھ کو اپنا جانشین مقرر کر دے۔ گرجنت کی بدقسمتی کہ اس کے ارمان پورے نہ ہو سکے اور وہ چند سال بعد ہی بھارتی فوج سے مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔

یوں ایک عام سیوادار طاقتور رشتے دار کی مدد سے اپنے ہی فرقے کا سربراہ بن گیا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ تب گرمیت سنگھ واقعی اپنے فرقے کو ترقی دینا چاہتا تھا یا وہ مذہب کو کاروبار بنا کر دولت، عزت اور شہرت پانے کا متمنی تھا۔ اگرچہ آج کی صورت حال گواہ ہے کہ گرمیت سنگھ کے عزائم نیک نہ تھے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ ابتدا میں اس کی نیت واقعی ٹھیک ہو۔ مگر جب تنظیم کی ساری طاقتیں اس کی ذات میں مرتکز ہوئیں، تو وہ گمراہ ہو گیا۔ یہ مشہور مقولہ ہے کہ کامل طاقت انسان کو کرپٹ بنا دیتی ہے۔ اسی مقولے کے ثبوت انسانی تاریخ میں جابجا نظر آتے ہیں۔ تب کوئی حکمران ہو یا کسی مذہبی فرقے کا سربراہ، کامل طاقت اُسے آوارہ، بدکار اور مغرور و متکبر بنا دیتی ہے۔

گرمیت سنگھ مذہب انسانیت کا پیروکار ہے۔ وہ تمام

مذاہب کو سچا جانتا ہے۔ اسی لیے اس نے اپنا نام ''گرمیت رام رحیم سنگھ انسان'' رکھ لیا تا کہ وہ بھارت کے سبھی بڑے مذاہب (ہندومت، اسلام اور سکھ مت) کا نمائندہ بن سکے۔ اس نے پہلے پہل سماجی خدمات انجام دے کر پنجاب، ہریانہ اور اردگرد کی ریاستوں میں شہرت پائی۔

وہ سب سے پہلے غریبوں اور محتاجوں میں مفت کھانا تقسیم کرنے لگا۔ متوسط طبقے کو دال آٹا سستے داموں فراہم کیا گیا۔ پھر اس نے ڈیرا سچا سودا میں اسپتال اور اسکول قائم

پاک و ہند میں کئی گرو اور پیر تقدس کا مصنوعی ہالہ رکھتے ہیں

کیے۔ یوں غریبوں کو مفت علاج ہی نہیں مفت تعلیم بھی ملنے لگی۔ ان اقدامات کے باعث تنظیم بہت مشہور ہو گئی اور لاکھوں لوگ گرمیت سنگھ کے پیروکار بن گئے۔

رفتہ رفتہ تنظیم کو مخیر مردوزن سے چندہ ملنے لگا۔ پیسا پا کر گرمیت سنگھ اس قابل ہو گیا کہ اپنی فلاحی سرگرمیوں کا دائرہ کار پھیلا سکے۔ آج سرسہ میں واقع ڈیرا سچا سودا کا ہیڈ کوارٹر ''۷۰۰'' ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں اسپتال، اسکول، دفاتر، ہاسٹل، رہائش گاہیں اور فارم وغیرہ واقع ہیں۔

گرمیت نے ڈیرے کی اس روایت کو برقرار رکھا کہ وہاں ذات پات کی کوئی تقسیم نہ تھی۔ پیروکار برہمن ہے، تو وہ مذہبی یا سوشل تقاریب میں اچھوتوں (دلتوں) کے ساتھ ہی اٹھتا بیٹھتا اور کھاتا پیتا۔ ہر تقریب میں گرمیت سنگھ ہندو، سکھ، مسلم اور عیسائی مذہبی نشانات کے نیچے براجمان ہوتا۔ ان نشانات کو اس طرح لگایا جاتا کہ ظاہر ہو، گرمیت سنگھ میں تمام مذاہب کی خصوصیات جمع ہو گئی ہیں۔

ڈیرا سچا سودا کی تبلیغ سے جب بھی طوائفیں اپنے قبیح پیشے سے تائب ہوتیں، تو تنظیم اجتماعی طور پر ان کی شادی کروا دیتی۔ اس موقع پر ہر دلہن کو ڈیڑھ لاکھ روپے بھی دیے جاتے۔ گرمیت سنگھ نے بیواؤں کی شادی کا بھی بندوبست کیا نیز سپریم کورٹ میں درخواست دی کہ ہیجڑوں کو تمام قانونی

حقوق عطا کیے جائیں۔

اور دماغ خراب ہوگیا

زبردست سماجی خدمات انجام دینے سے گرمیت سنگھ اور ڈیرا سچا سودا کی شہرت کو پر لگ گئے۔ ہریانہ، پنجاب، راجھستان، دہلی، اتر پردیش اور ہماچل پردیش کی ریاستوں میں لاکھوں لوگ اس سے وابستہ ہو گئے۔ پیروکاروں کی کثرت ہی نے شاید گرمیت سنگھ کا دماغ خراب کر دیا۔ وہ خود کو ''مہان'' سمجھنے لگا..... ایسا ارضی بھگوان جو ہر اخلاقی و قانونی اصول سے ماورا تھا۔

ایک اہم تبدیلی یہ آئی کہ ہریانہ اور پنجاب میں مقامی سیاست داں گرمیت سنگھ سے دوستی کی پینگیں بڑھانے لگے۔ ان کو دراصل ڈیرا سچا سودا کے پیروکاروں کی صورت بہت بڑا ''ووٹ بینک'' نظر آنے لگا۔ ظاہر ہے، گرمیت سنگھ اپنے لاکھوں پیروکاروں کو یہ حکم دیتا کہ فلاں سیاست داں ووٹ کا حق دار ہے، تو وہ اسی کے انتخابی نشان پر ٹھپے لگا دیتے۔

۲۰۰۰ء کے بعد پنجاب اور ہریانہ میں کانگریسی سیاست داں ہر الیکشن میں گرمیت سنگھ سے مدد مانگنے لگے۔ دونوں ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ مثلاً اوم پرکاش چھوٹالہ اور پرکاش سنگھ بادل ڈیرا سچا سودا کے دورے کرنے لگے۔ اس موقع پر لاکھوں روپے کی امداد کا اعلان بھی کیا جاتا نیز ڈیرے کو مختلف سہولیات فراہم کرنے کا پیغام بھی ملتا۔ جب ہندو قوم پرست جماعت 'بی جے پی' کا جھنڈا بلند ہوا، تو اس نے بھی گرمیت سنگھ سے دوستانہ بڑھانے کی پالیسی اختیار کر لی۔ رفتہ رفتہ سیاسی جماعتوں کے سیاست داں تنظیم کو لاکھوں روپے چندہ دینے لگے۔ حکومتوں سے بھی اُسے کئی سہولیات حاصل ہوگئیں۔

طاقت کا نشہ اور دولت کی ریل پیل اکثر انسانوں کو ایمان و اخلاق سے دور کر دیتی ہے۔ گرمیت سنگھ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ماجرا پیش آیا۔ اب وہ اپنی بڑائی ثابت کرنے کی خاطر عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگا۔ اس نے ایسی دیومالائی اور جادوئی فلمیں بنوائیں جن میں وہ ہیرو اور گلوکار کی حیثیت سے پیش ہوا۔ زرق برق ملبوسات پہن کر گانے گائے۔ گرمیت کے اردگرد داسیاں پھرنے لگیں۔ یوں وہ اکیسویں صدی کا ''ہائی ٹیک'' گرو بن گیا۔

۲۰۰۰ء کے بعد ہی کسی وقت بھارتی حکومت نے گرمیت سنگھ کو سرکاری طور پر ''زیڈ پلس'' (Z+) سیکورٹی فراہم کر دی۔ یہ سیکورٹی بھارت کی اعلیٰ ترین سیاسی و معاشرتی شخصیات کو دی جاتی ہے جن کی تعداد کبھی ۵۰ سے زیادہ نہیں بڑھی۔ یہ امر آشکارا کرتا ہے کہ بھارتی سیاست داں اور حکومت اُسے کتنی اہمیت دیتے تھے۔

گرمیت اب بیش قیمت گاڑیوں میں گھومنے لگا۔ ڈیرے پر جابجا کمانڈو نما گارڈ نظر آنے لگے۔ وہ ہر آنے جانے والے پر نظر رکھتے۔ جلد ہی ڈیرے پر ویڈیو کیمرے بھی لگ گئے۔ گویا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ گرمیت سنگھ نے بھارت کے اندر اپنی ایک علیحدہ ریاست قائم کر لی۔ اس ریاست میں وہ ایک بادشاہ یا آمر کی حیثیت رکھتا تھا۔

گرمیت سنگھ جب بھی مذہبی تقریب منعقد کرتا، تو ریاستی حکومتوں کے وزرا، ممتاز سیاست داں اور شوبز و سپورٹس سے تعلق رکھنے والی مشہور شخصیات اس میں شرکت کرتیں۔ یوں اس نے اپنے گرد تقدس کا ایسا ہالہ تخلیق کر لیا کہ کسی کو ہمت نہ ہوتی، گرمیت سنگھ کی ذلیل حرکتوں پر انگلی بھی اٹھا سکے۔ حتیٰ کہ وہ پیروکاروں کی بہنوں اور بیٹیوں کو نشانہ بنانے لگا، تب بھی اپنے گھرانوں کی جہالت اور توہم پرستی کے سبب وہ رو دھو کر خاموش رہتیں۔

لیکن کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ آخر وہ حرکت میں آ گئی۔ ایک نامعلوم لڑکی نے ہمت پکڑی اور وزیر اعظم بھارت کو خط لکھ کر گرمیت سنگھ کی عیاشیوں اور کرتوتوں کا بھانڈا پھوڑ دیا لیکن پاکستان کی طرح بھارت میں

بھی انصاف کا حصول جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ گرمیت سنگھ کے مظالم کا سلسلہ دراز رہا اور اُسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچتے پہنچتے پورے پندرہ سال گزر گئے۔

میڈیا اور عدلیہ کا عمدہ کردار

گرمیت سنگھ کو جیل تک پہنچانے میں سرسہ کے ایک دلیر صحافی نے اہم کردار ادا کیا۔ رام چندر شہر میں ''پورا سچ'' کے نام سے ایک ہفتہ وار رسالہ نکالتا تھا۔ گرمیت سنگھ کے کرتوتوں کا پردہ چاک کرنے کی خاطر نامعلوم لڑکی نے اس سے بھی رابطہ کیا۔ رام چندر نے مظلومہ لڑکی کی کہانی سنی، تو اُسے بہت افسوس ہوا۔ اس نے جعلی گرو کی سچائی سب کے سامنے لانے کا تہیہ کر لیا۔ چناں چہ رام چندر نے پورا خط اپنے رسالے میں شائع کر دیا۔

گرجنت سنگھ

جب یہ رسالہ گرمیت سنگھ تک پہنچا، تو وہ غصّے سے سلگ اٹھا۔ اس نے بیش میں آ کر رام چندر کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ چند ماہ بعد ڈیرا سچا سودا کے دو کارکنوں نے اسے گولی مار دی۔ رام چندر اپنے گھر کے دروازے پر ہی جاں بحق ہوگیا۔ مقتول کا بیٹا، انشول بھی صحافی تھا۔ اس نے بھی گرمیت سنگھ کے آگے ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ انشول نے باپ کے قاتلوں کے خلاف ایف آئی آر کٹوائی اور پولیس کی حفاظت میں رہنے لگا۔

نئی دہلی میں واقع وزیر اعظم ہاؤس نے تو گرمیت سنگھ کے ظلم کا شکار لڑکی کے خط کو نظر انداز کر دیا تھا۔ بدقسمت لڑکی کی خوش قسمتی رہی کہ اس نے پنجاب و ہریانہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس، آدرش کمار کو بھی خط کی ایک نقل بھجوا دی تھی۔ انھوں نے خط پر سوموٹو نوٹس لیتے ہوئے سرسہ کے ڈسٹرکٹ و سیشن جج کو ہدایت کی کہ وہ گرمیت سنگھ کی سرگرمیوں کے بارے میں خفیہ رپورٹ مرتب کرے۔

ڈسٹرکٹ و سیشن جج ایک قابل آدمی تھا۔ اس نے کئی دن ڈیرے کی چھان بین کرنے کے بعد ایک رپورٹ مرتب کر لی۔ اس رپورٹ نے افشا کیا کہ ڈیرا سچا سودا میں مشکوک سرگرمیاں جاری ہیں۔ چنانچہ جسٹس آدرش کمار نے بھارت میں اندرون ملک تفتیش کرنے والی سب سے بڑی خفیہ ایجنسی، سی بی آئی (سنٹرل بیورو آف انویسٹی گیشن) کو حکم دیا کہ وہ گرمیت سنگھ اور اس کی تنظیم کے خلاف تحقیقات کا آغاز کر دے۔ اس طرح میڈیا کے بعد عدلیہ نے ایک طاقتور و بااثر شخص کو کٹہرے میں لانے کا بیڑا اٹھا لیا۔ یہ ستمبر ۲۰۰۲ء کی بات ہے۔

فیصلہ آ گیا

ایک طرف عدلیہ کی زیر قیادت تحقیقات جاری رہیں، تو دوسری سمت گرمیت سنگھ ترقی و خوشحالی کی نئی منزلیں طے کرتا رہا۔ بھارت میں ناخواندہ اور توہم پرست بھارتیوں کی کمی نہیں لہٰذا ڈیرا سچا سودا کے پیروکاروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ یوں گرمیت سنگھ کے اثر و رسوخ میں اضافہ جاری رہا۔

سی بی آئی کی تحقیقات کا محور وہ سدھویاں تھیں جو وقتاً فوقتاً ڈیرا سچا سودا سے منسلک رہیں اور پھر اُسے چھوڑ گئیں۔ جلد ہی ایک اور لڑکی نے گرمیت سنگھ کو اپنی تباہی کا ذمے دار قرار دے دیا۔ تحقیقات کی رپورٹ آخر سی بی آئی کی خصوصی عدالت کو پیش کر دی گئی۔ ۲۵ اگست کو اسی رپورٹ کی بنیاد پر خصوصی عدالت نے گرمیت سنگھ کو مجرم قرار دے ڈالا۔

جیسے ہی یہ اعلان ہوا، پنجاب اور ہریانہ کے مختلف

مقامات پر ڈیرا سچا سودا کے پیروکار ہنگامہ آرائی کرنے لگے۔ انہوں نے سرکاری تنصیبات اور گاڑیاں جلا ڈالیں اور فائرنگ بھی کرنے لگے۔ جب پولیس ان کے مقابلے پر آئی، تو مسلح تصادم شروع ہو گیا جس میں تقریباً چالیس افراد مارے گئے اور تین سو سے زائد زخمی ہوئے۔

۲۸ راگست کو سی بی آئی کی خصوصی عدالت نے گرمیت سنگھ کو بیس سال قید بامشقت کی سزا سنا دی۔ ابھی اس پر رام چندر اور ڈیرا منیجر کے قتل والے مقدمے چل رہے ہیں۔ گرمیت کے وکیل سزا کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کر سکتے ہیں۔

بابا رام دیو کا ہاتھ

بھارت کے بعض ماہرین کا دعویٰ ہے کہ گرمیت سنگھ کی سزا میں مشہور ہندو گرو، بابا رام دیو کا نمایاں ہاتھ ہے اور اس کی وجہ کاروباری رقابت ہے۔ بابا رام دیو فی الوقت طاقت و اثر و رسوخ کے اعتبار سے بھارت کا سب سے بڑا ہندو گرو بن چکا۔ وہ ایک کاروباری کمپنی، پتنجلی آیورویدک کا مالک ہے جس کی بنیاد ۲۰۰۶ء میں رکھی گئی تھی۔

پتنجلی آیورویدک کمپنی روزمرہ استعمال کی ۹۰۰ سے زائد اشیائے صرف تیار کرتی ہے۔ ان میں ہار سنگھار کی اشیاء اور نباتاتی ادویہ نمایاں ہیں۔ پچھلے گیارہ برس میں کمپنی نے محیر العقول ترقی کی ہے۔ اس نے کروڑوں صارفین والی بھارتی مارکیٹ میں موجود کئی پرانے کھلاڑیوں کو پچھاڑ دیا۔ کمپنی میں فی الوقت دو ہزار ملازم ہیں۔ یہ سالانہ ۱٫۶ ارب ڈالر کی اشیائے صرف فروخت کرتی ہے۔

بابا رام دیو کی دیکھا دیکھی گرمیت سنگھ نے بھی فروری ۲۰۱۶ء میں ایم ایس جی آل ٹریڈنگ انٹرنیشنل پرائیوٹ لمیٹڈ نامی ایک صارف کمپنی کی بنیاد رکھ دی۔ یہ کمپنی ۱۵۰ سے زائد اشیائے صرف بنانے لگی جن میں اچار، چاول، بوتل والا پانی وغیرہ شامل ہے۔

گرمیت سنگھ کی یہ کمپنی تیزی سے ترقی کرنے لگی۔ اس نے خصوصاً پنجاب اور ہریانہ میں پتنجلی آیورویدک کی اشیاء کی فروخت بہت کم کر دی۔ بھارتی ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ دیکھ کر بابا رام دیو کو گرمیت سنگھ سے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ چنانچہ اس نے نریندر مودی پر دباؤ ڈالا کہ اس کی راہ سے گرمیت سنگھ کا کانٹا ہٹا دیا جائے۔ مودی نے پھر سی بی آئی کو حکم دے دیا کہ مقدمات کی آڑ لے کر گرمیت سنگھ اور اس کی تنظیم کا پتا صاف کر دو۔

ضعیف الاعتقادوں کا دیس

جیسا کہ بتایا گیا' گرمیت سنگھ سی بی آئی عدالت کے فیصلے کے خلاف پنجاب و ہریانہ ہائی کورٹ میں اپیل کرنے کا حق رکھتا ہے۔ ممکن ہے کہ آگے چل کر اعلیٰ عدالت میں مختلف قسم کا فیصلہ آئے، مگر گرمیت سنگھ کے انہونے اسکینڈل نے ہر کسی پر اجاگر کر دیا کہ دور جدید میں بھی کروڑوں بھارتی حتی کہ تعلیم یافتہ لوگ بھی جعلی گروؤں کے بچھائے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ بھارتی معاشرے میں وسیع پیمانے پر پھیلی جہالت اور ضعیف الاعتقادی ہے۔ عقل و دانش کی یہ طاقتور دشمن انسان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتے ہیں اور پھر اُسے راہ حق نظر آنی بند ہو جاتی ہے۔

حیرت انگیز بات یہ کہ پچھلے چند عشروں کے دوران بھارت میں جعلی گروؤں کے کئی کیس منظر عام پر آ چکے۔ کسی رشی نے اپنے پیروکاروں کی عزتوں پر ہاتھ ڈالا، تو کوئی ان کی رقوم لے کر اڑن چھو ہوا۔ کسی گرو نے پیروکاروں سے دان (خیرات) میں ملے سرمائے سے محل کھڑے کر لیے اور پُرآسائش زندگی گزارنے لگا۔ غرض بھارتی معاشرے میں ڈھونگی اور فراڈیے ہندو گرو یا مذہبی راہنما لیڈر بن کر پیروکاروں کو چکما دے کر اپنا الو سیدھا کرتے رہے۔ اس کے باوجود ہندو عوام نے ان سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا اور نہ ہی عبرت پکڑی۔ یہی وجہ ہے' کہ اس سائنسی دور میں بھی گرمیت

سنگھ اور بابا رام دیو جیسے گرو ہزاروں لاکھوں نہیں کروڑوں بھارتیوں کو اپنا پرستار بنا لیتے ہیں۔

ماہرین عمرانیات کہتے ہیں کہ بھارتی معاشرے میں ذات پات کا نظام جھوٹے سچے گروؤں کو جنم دیتا اور ان کی پرورش کرتا ہے۔ بھارت میں اونچی ذاتوں کے ہندو نچلی ذاتوں کے لوگوں سے آج بھی الگ تھلگ رہتے ہیں۔ روزمرہ زندگی میں کام کاج کے دوران اکثر نچلے طبقوں کے مرد و زن کو امیر و بارسوخ ہندو یہ باور کرواتے ہیں کہ وہ ان کے ہم پلہ نہیں اور ہر لحاظ سے کمتر ہیں۔

بھارت میں کروڑوں ہندو نچلے طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ذات پات کے روایتی نظام میں ان کی حیثیت غلاموں جیسی ہے۔ ان لوگوں کی شاید سب سے بڑی تمنا یہی ہے کہ وہ بھی اپنے ماحول اور رہن سہن میں سر اٹھا کر چل سکیں اور احساس کمتری سے چھٹکارا پا لیں۔ احساس کمتری کے باعث ہی برہمن و کھشتری ہندو ان کا استحصال کرتے ہیں۔

اس گمبھیر ماحول میں جب کوئی ہندو گرو نچلے طبقوں کا لیڈر بن جائے، تو قدرتاً اُسے بہت پزیرائی ملتی ہے۔ مثلاً گرمیت سنگھ ہی کو لیجیے۔ اس کے ڈیرے میں ذات پات کا نظام عنقا تھا۔ ڈیرے میں منیجر ''بھنگی داس'' کہلاتے تاکہ بھنگیوں کو احساس دلایا جا سکے کہ وہ بھی معاشرے میں اعلیٰ مقام کے حامل ہیں۔ روایتی ہندو مذہب اور ذات پات والے نظام کے خلاف بغاوت ہی نے گرمیت سنگھ کو نچلے طبقوں میں مقبول و محبوب بنا دیا۔ یہ اور بات ہے کہ شہرت نے گرمیت سنگھ کا دماغ خراب کر ڈالا اور وہ بدی کی راہ پر گامزن ہو گیا۔

نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے ہندو ہی نہیں سکھ اور جین مت کے لوگ بھی گرمیت سنگھ کو بھگوان سمجھنے لگے۔ یہی وجہ ہے، جب اُسے سزا ہوئی تو بے انتہا عقیدت کے باعث انہیں اتنا صدمہ پہنچا کہ وہ اپنے گرو کی خاطر جان کی پروا کیے بغیر پولیس سے نبرد آزما ہو گئے۔ ان طبقوں کی نظر میں گرمیت سنگھ

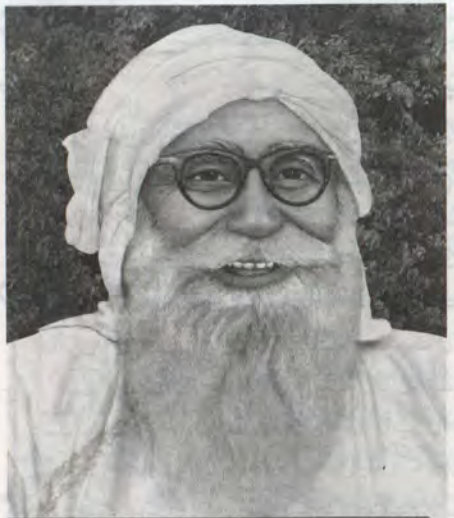

مستانہ بلوچستانی

ایک نجات دہندہ ہے جس نے انہیں معاشرے میں اونچا مقام عطا کیا اور عزت و احترام بخش دیا۔

بھارت میں جب تک عام آدمی کو انصاف نہیں ملتا، دولت کی تقسیم منصفانہ نہیں ہوتی اور ذات پات کا نظام ختم نہیں ہوتا، بھارتی معاشرے میں گرو، رشی، بابا، پنڈت وغیرہ جنم لیتے رہیں گے۔ بعض شاید واقعی دکھی انسانیت کی خدمت کرنا چاہتے ہوں، مگر ان کی اکثریت نے مذہب کو کاروبار بنا لیا ہے۔ یہ گرو نا خواندہ اور معصوم ہندوؤں کو ٹھگ کر راتوں رات عزت ہی نہیں دولت و شہرت بھی پا لیتے ہیں۔ ان کی زندگی شاہانہ انداز میں بسر ہونے لگتی ہے لیکن کوئی نہ کوئی غلطی ان کے فراڈ کا بھانڈا پھوڑ دیتی ہے۔

گرمیت سنگھ جیسے جعلی گرو بھارتی معاشرے کے دامن پر بدنما داغ کے مترادف ہیں۔ یہ خود ہی ذلیل نہیں ہوتے بلکہ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ہندومت اور بھارت کو بھی دنیا بھر میں بدنام کر دیتے ہیں۔

ڈیرا کیا ہے؟

ڈیرا ہندی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے لفظی معنی گھر یا مکان کے ہیں۔ اصطلاحی مفہوم میں بھارتی پنجاب اور ہریانہ ریاستوں میں کسی گرو یا رشی کی جائے رہائش ''ڈیرا'' کہلاتی ہے۔ اس مقام پر عموماً متوفی گرو کی یادگاریں بھی موجود ہوتی ہیں۔ گویا مسلمانوں کی درگاہوں اور مزاروں کی طرح بھارتی غیر مسلموں کے نزدیک ڈیرے بھی مقدس مقامات ہیں۔

ہندوستان (یا اب بھارت) میں ڈیرے قائم کرنے والے بیشتر غیر مسلم گرو بھگت، رشی وغیرہ بھگتی تحریک سے متاثر تھے۔ بھگتی تحریک تمام مذاہب کے خیالات و نظریات کا مجموعہ ہے۔ اس سے وابستہ لوگ مادی خواہشات سے دور رہتے، سادہ زندگی گزارتے اور انسان دوستی پر یقین رکھتے ہیں۔ مسلم صوفیا کے نظریات نے بھی اس تحریک پر گہرے اثرات ڈالے۔

انہی کا نتیجہ ہے کہ جو ہندو اور سکھ بھگتی تحریک میں شامل ہوئے، انہوں نے اپنے مذاہب کی فرسودہ رسوم و رواج کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ان میں ذات پات کی تقسیم، گھریلو تشدد، شراب نوشی اور غربت وغیرہ نمایاں ہیں۔ ان سکھ و ہندو گروؤں نے اپنے مذاہب کے بنیادی نظریات کو ہاتھ نہیں لگایا مگر خاص طور پر طبقاتی تقسیم کو آڑے ہاتھوں لیا۔

یاد رہے، سکھوں میں بھی ذات پات کی تقسیم خاصی حد تک موجود ہے۔ بھارتی پنجاب میں تمام تر طاقت اور اثر و رسوخ ''جاٹ سکھوں'' کے ہاتھوں میں ہے۔ جبکہ ریاست میں ۳۲ فیصد دلت (اچھوت) بھی آباد ہیں۔ یہ دلت ریاست کا نچلا ترین طبقہ ہے جسے کسی قسم کی سہولیات اور آسائشیں میسر نہیں۔ جاٹ سکھ روزمرہ زندگی میں ان دلتوں اور غریب سکھوں کا بھی استحصال کرتے ہیں۔

بھارتی پنجاب، ہریانہ، راجھستان، اتر پردیش وغیرہ میں مسلم صوفیائے کرام کی طرح بھگتی تحریک کے ہندو اور سکھ گروؤں نے نچلے طبقوں کے افراد کو گلے لگایا، انہیں تسلی و تشفی دی اور روحانی طور پر ان کی پریشانیوں اور مسائل کا علاج کرنے لگے۔ جب پسے لوگوں کو ان لیڈروں کی صورت سہارا ملا، تو قدرتاً وہ ان کی طرف کھنچنے لگے۔

یہی وجہ ہے، پچھلے چالیس پچاس برس میں شمالی بھارت میں سینکڑوں ڈیرے نمودار ہو چکے۔ ان ڈیروں کے گرو اپنے آپ کو بھگوان اور انسان کے درمیان رابطے کا ذریعہ بتاتے ہیں۔ چنانچہ وہ مروجہ مذاہب (ہندومت، سکھ مت اور جین مت) سے مختلف مذہبی گروہ بن چکے۔

ایک رپورٹ کی رو سے شمالی بھارت میں ''تین ہزار سے زائد'' ڈیرے کام کر رہے ہیں۔ ان میں سچا سودا، رادھے سوامی، سچ کھنڈ بالن، نرمھل، نرن کاری اور نام دھاری سب سے بڑے ڈیرے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ ڈیرے صنعتی و کاروباری گروپ میں تبدیل ہو چکے۔ ان ڈیروں میں پیروکاروں کو تعلیم و صحت کی خدمات سستے داموں فراہم ہوتی ہیں۔ اکثر ڈیرے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا روپ دھار چکے جہاں مقیم مرد و زن کو وہاں ہر شے میسر ہے۔ ◆◆◆

دین اسلام میں ایسے ڈھونگی مذہبی راہنماؤں کا کوئی وجود نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے سب مسلمان برابر ہیں۔ ان میں امیر غریب یا گورے کالے کے لحاظ سے کوئی تفریق موجود نہیں..... بڑائی کا معیار صرف تقویٰ ہے اور باتقویٰ مسلمان کبھی جعلی ہندو گروؤں جیسی سرگرمیاں نہیں اپنا سکتا۔ اس کی شخصیت و کردار تو معاشرے میں نیکی کی شمع روشن کرنے کے مترادف دوسروں کو سچ و حق کی راہ دکھلانے کا فریضہ انجام دینا ہے۔

بھارت.....ایشیا کا کرپٹ ترین ملک

جرمنی کا غیر سرکاری ادارہ، ٹرانسپرینسی انٹرنیشنل ۱۹۹۳ء سے حکومتی سطح پر کی جانے والی کرپشن کے خلاف سرگرم عمل ہے۔ یہ تنظیم دنیا کے تمام بڑے ممالک میں علاقائی دفاتر رکھتی ہے۔ چند ماہ قبل تنظیم نے فیصلہ کیا کہ ایشیا کے سولہ اہم ممالک میں سروے کر کے جانا جائے، وہاں کرپشن کی کیا صورت حال ہے۔ اسی سلسلے میں سولہ ممالک کے ''بائیس ہزار افراد'' سے بات چیت کی گئی۔

سروے کا نتیجہ پچھلے ماہ سامنے آیا اور اس نے سبھی کو چونکا دیا۔ اس کے مطابق بھارت ایشیا کا کرپٹ ترین ملک قرار پایا۔ بھارتیوں کی ۶۹ فیصد تعداد کو کبھی نہ کبھی کرپشن کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے نمبر پر ویت نام (۶۵ فیصد)، تیسرے پر تھائی لینڈ (۴۱ فیصد) اور چوتھے پر پاکستان (۴۰ فیصد) رہا۔

یوں ایک مستند عالمی تنظیم کی رپورٹ نے بھارتی وزیراعظم، نریندر مودی کے دعوؤں کے پول کھول دیے۔ موصوف کا کہنا تھا کہ بھارت کے سرکاری محکموں میں کرپشن بہت کم ہو چکی مگر تازہ رپورٹ افشا کرتی ہے کہ بھارتی سرکاری محکموں میں عوام کی خوب مٹی پلید ہوتی ہے۔

رپورٹ نے افشا کیا کہ بھارت میں پولیس، عدلیہ، محکمہ صحت اور محکمہ تعلیم میں سب سے زیادہ کرپشن ہے۔ ایک عام آدمی کا بھی انہی سرکاری خدمات سے زیادہ واسطہ پڑتا ہے۔

رپورٹ کی رو سے پاکستان میں پولیس کرپٹ ترین طبقہ ہے۔ جبکہ محکمہ صحت اور محکمہ تعلیم میں کرپشن کی شرح کم ہے۔

رپورٹ یہ بات بھی نمایاں کرتی ہے کہ بھارت میں رشوت دینے والے ''۷۵'' لوگ غریب اور نچلے طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ بااثر محکموں میں پھنسے کام کروانے کی خاطر مجبوراً رشوت دیتے ہیں۔ یہ سچائی اس حقیقت کو نمایاں کرتی ہے کہ مودی حکومت حکمران اور ذی اثر طبقات کے مفادات ہی پورے کر رہی ہے۔ مودی حکومت کے تین سالہ دور میں ایک عام بھارتی کی زندگی میں خاص تبدیلی نہیں آئی۔

رپورٹ کے مطابق براعظم ایشیا میں جاپان میں کرپشن کی شرح سب سے کم ہے یعنی ۰ء۲ فیصد۔ اس کے بعد جنوبی کوریا (۳ فیصد)، آسٹریلیا (۴ فیصد)، تائیوان (۶ فیصد)، سری لنکا (۱۵ فیصد) ملائیشیا (۲۳ فیصد) اور انڈونیشیا (۳۲ فیصد) کا نمبر آتا ہے۔

معاشیات اور عمرانیات کے ماہرین کی رو سے دور حاضر میں کرپشن قومی ترقی و خوشحالی کی سب سے بڑی دشمن بن چکی۔ خاص طور پر جس ملک کی حکومت میں کرپشن کا دور دورہ ہو، وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتا اور جس ملک نے کرپشن سے چھٹکارا پایا، وہ تیزی سے ترقی و خوشحالی کی منازل طے کرنے لگا۔

ٹرانسپرینسی انٹرنیشنل کی کرپشن سے متعلق تازہ ترین عالمی رپورٹ کے مطابق ڈنمارک کی حکومت میں سب سے کم رشوت موجود ہے۔ اس کے بعد نیوزی لینڈ، فن لینڈ، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، ناروے، سنگاپور، ہالینڈ، کینیڈا اور جرمنی کا نمبر آتا ہے۔ اس فہرست میں سپر پاور امریکا ۱۸ نمبر، چین ۷۹، بھارت بھی ۷۹ اور پاکستان ۱۱۶ نمبر پر فائز ہے۔ سب سے آخر میں خانہ جنگی، غربت اور عالمی تنہائی کا شکار ممالک آتے ہیں مثلاً صومالیہ (۱۷۶)، جنوبی سوڈان (۱۷۵)، شمالی کوریا (۱۷۴)، شام (۱۷۳) اور یمن (۱۷۰)۔ ◆◆◆

یہ ۲۰۱۴ء کی بات ہے، دانش وروں کے ایک مذاکرے میں دنیا کی ابھرتی معاشی طاقتوں پر بات ہو رہی تھی۔

عالم تمام

ایک صاحب کہنے لگے کہ برازیل مستقبل کی ایک بڑی طاقت بن سکتا ہے۔ تب برازیل کی معاشی شرح چھ سات فیصد کے آس پاس تھی لہٰذا لگتا یہی تھا کہ برازیل دنیا کی بڑی معاشی طاقت بننے والا ہے۔ تب تک وہ ابھرتے معاشی ملکوں کی تنظیم برکس کا رکن بن چکا تھا جس میں چین، روس، بھارت اور جنوبی افریقا بھی شامل ہیں۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ ۲۰۱۴ء ہی میں برازیل میں ایک ایسے زبردست اسکینڈل نے جنم لیا جو مملکت کی ساری معاشی ترقی ہی نہیں نیک نامی کو بھی کھا گیا۔ اس نے برازیل میں معاشی زوال پیدا کر ڈالا اور سیاسی و اخلاقی بحران بھی اس کے جلو میں سامنے آ گئے۔ ماہرین کے نزدیک برازیل کا کرپشن اسکینڈل تاریخ انسانی میں اپنی نوعیت کا سب سے بڑا اسکینڈل ہے۔

عالیہ شاہ

برازیل کا کرپشن اسکینڈل

دنیا کی اس اہم مملکت میں عدلیہ اور پولیس نے مل کر کرپٹ اور طاقتور مگرمچھوں کو جیل میں ٹھونس ڈالا اور یوں دیگر مُلکوں کے لیے مثال قائم کردی

اس کی مالیت ۱۵؍ارب ڈالر تک بتائی جاتی ہے۔

وطن عزیز بھی روز اول سے کرپشن کے نت نئے اسکینڈلوں کی زد میں ہے۔ انہی کی وجہ سے پاکستان بہترین وسائل ہوتے ہوئے بھی معاشی طاقت نہ بن سکا جبکہ سنگاپور، ملائیشیا اور جنوبی کوریا اس وجہ سے بھی ''معاشی دیو'' بن کر نمایاں ہوئے کہ ان ملکوں کا حکمران طبقہ معاشرے سے کرپشن خاصی حد تک ختم کرنے میں کامیاب رہا۔

آج برازیل میں کرپشن کی زبردست جنگ جاری ہے۔ ایک سمت عدلیہ اور پولیس کھڑی ہے۔ دوسرا محاذ کرپٹ سیاست دانوں، صنعت کاروں اور کاروباری افراد نے سنبھال رکھا ہے۔ فریقین کے مابین زوردار لڑائی جاری ہے۔ کبھی ایک فریق کا پلّہ بھاری ہو جاتا ہے اور کبھی دوسرے فریق کا! عوام الناس بے تابی سے منتظر ہیں کہ اس لڑائی کا انجام نجانے کیا ہوگا۔

غلامی سے آزادی تک

کرپشن اسکینڈل کی محیر العقول کہانی بیان کرنے سے قبل برازیل کے ماضی و حال پر کچھ گفت گو ہو جائے۔ یہ بہ لحاظ رقبہ دنیا کا پانچواں بڑا جبکہ آبادی کے لحاظ سے چھٹا بڑا ملک ہے۔ مملکت میں ۲۰ کروڑ ۳۷ لاکھ لوگ بستے ہیں۔ ان میں ۴۸ فیصد سفید فام ہیں، ساڑھے سات فیصد سیاہ فام اور ۴۳ فیصد ملی جلی نسل کے ہیں۔ ۹۷ فیصد آبادی عیسائی ہے۔

برازیل کا وسیع رقبہ جنگلات سے ڈھکا ہوا ہے جنہیں دریاؤں کا ایک بہت بڑا نظام سیراب کرتا ہے۔ انہی میں سے ایک دریائے ایمزن پانی کی مقدار کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا دریا ہے۔ ایمزن کے بارانی جنگلات ساڑھے پانچ لاکھ مربع کلومیٹر رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ کرۂ ارض پر آکسیجن کا سب سے بڑا منبع ہیں۔

برازیل میں قبائل اطمینان و سکون سے رہ رہے تھے کہ اپریل ۱۵۰۰ء میں یورپی استعماری طاقت، پرتگال کی فوج نے ان پر دھاوا بول دیا۔ پرتگالی فوج نے مقامی قبائل پر بہت ظلم ڈھائے اور برازیل پر قبضہ کر لیا۔ پرتگیزیوں نے ملک میں گنے کے کھیت لگائے تاکہ چینی حاصل کر سکیں۔ کھیتوں میں کام کرنے کی خاطر افریقا سے غلام منگوائے گئے۔ یوں سیاہ فام بھی برازیل کی آبادی کا حصّہ بن گئے۔

پرتگیزی آقا بہت ظالم تھے۔ وہ برازیل کے وسائل سے فائدہ اٹھا کر حاصل شدہ دولت پرتگال لے جاتے۔ وقتاً فوقتاً دیگر استعماری یورپی طاقتیں بھی برازیل پر حملہ آور ہوتی رہیں تاکہ اُسے اپنی نوآبادی بنا سکیں۔ تاہم پرتگالی فوج انہیں شکست دینے میں کامیاب رہی۔

رفتہ رفتہ برازیلی عوام اور پرتگالی آقاؤں میں اختلافات بڑھ گئے۔ برازیلی لیڈروں نے تحریک آزادی کا اعلان کر دیا۔ انیسویں صدی میں پرتگال معاشی و عسکری لحاظ سے خاصا کمزور ہو چکا تھا لہٰذا پرتگالی حکومت تحریک آزادی کا مقابلہ نہ کر سکی۔ برازیلی لیڈروں نے آخر ستمبر ۱۸۲۲ء کو مملکت کی آزادی کا اعلان کر دیا۔

آزادی کے بعد کچھ عرصے بادشاہت رہی پھر فوج نے شاہی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ یوں برازیل میں آمریت کے طویل دور کا آغاز ہو گیا۔ آخر ۱۹۸۵ء میں جمہوریت کا باب کھلا اور صدر برازیلی حکومت سنبھالنے لگے۔ ان میں سے بیشتر مغرب اور سرمایہ داری کے پرستار تھے۔ ان کے ادوار میں بیشتر ترقی پذیر ملکوں کی طرح برازیل میں بھی ایسا حکمران طبقہ پیدا ہو گیا جس میں طاقت اور دولت مرتکز ہونے لگی۔ یہ طبقہ قانون و اصول کی پروا کیے بغیر سرکاری و نجی سطح پر کرپشن کرنے لگا جو رفتہ رفتہ بڑھتی چلی گئی۔

تبدیلی آ گئی

ایک طرف برازیلی عوام تھے جن کی اکثریت کو زندگی کی بنیادی سہولتیں بھی میسر نہ تھیں اور دوسری سمت مٹھی بھر حکمران طبقہ جس پر ہن چھپر پھاڑ کر برس رہا تھا۔ دولت کی نامنصفانہ

تقسیم نے قدرتاً برازیلی عوام کو برسراقتدار حکمران سے متنفر کر دیا اور وہ معاصر سیاسی جماعتوں کی جانب متوجہ ہو گئے۔

تبدیلی ۲۰۰۲ء میں آئی جب بائیں بازو سے تعلق رکھنے والی سیاسی جماعت 'ورکرز پارٹی' کا امیدوار، لولا داسلوا صدارتی الیکشن جیتنے میں کامیاب رہا۔ لولا ایک مزدور کا بیٹا ہے۔ بچپن جوتے پالش کرتے گزرا تاکہ گھریلو آمدن میں اضافہ کر سکے۔ دوسری جماعت میں تھا، تو اسکول چھوڑ دیا۔ لڑکپن میں کارخانے میں ملازمت کر لی۔ وہیں یونین کی سیاست میں دلچسپی لینے لگا اور آہستہ آہستہ مزدوروں کا مشہور لیڈر بن گیا۔

لولا نے اقتدار سنبھال کر معاشی، سیاسی اور معاشرتی سطح پر اصلاحات متعارف کروائیں جن سے خوش آئند نتائج برآمد ہوئے۔ برازیل میں غربت گھٹ گئی اور متوسط طبقہ آمدن بڑھنے سے پھلنے پھولنے لگا۔ بین الاقوامی سطح پر صدر لولا نے کئی مواقع پر امریکی استعمار کو للکارا اور اُسے تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس بنا پر تیسری دنیا اور عالم اسلام میں صدر لولا کی مقبولیت بڑھ گئی۔

البرٹو یوسف

دو صدارتی الیکشن جیتنے کے بعد از روئے آئین صدر لولا نے عہدہ صدارت کو خیرباد کہہ دیا۔ چنانچہ ۲۰۱۰ء کے الیکشن میں اس کی دست راست، دیلما روسیف نے حصہ لیا اور جیتنے میں کامیاب رہی۔ دیلما بھی متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہے اور اس نے اپنے پیش رو کے معاشی و سیاسی نظام کو جاری رکھا۔ تاہم عوام دوست کہلائے جانے والے ان لیفٹسٹ حکمرانوں کے دور میں بھی کرپشن کا جن برازیل میں پلتا بڑھتا رہا۔ اس باعث اثر و رسوخ رکھنے والے برازیلی ڈیڑھ عشرے میں کروڑ پتی اور ارب پتی بن گئے جبکہ عوام الناس کی حالت نہ بدل سکی۔

اسکینڈل کا جنم

لیکن جرم سات پردوں کے پیچھے بھی چھپ جائے، تو ایک نہ ایک دن افشا ہو کر رہتا ہے۔ ہوا یہ کہ ۲۰۰۸ء میں ایک برازیلی کاروباری، ہرمیس ماگنس نے پولیس کو بتایا کہ بعض لوگ اس کی کمپنی کے ذریعے منی لانڈرنگ کر رہے ہیں یعنی کالے دھن کو سفید دھن میں تبدیل کرتے ہیں۔ ہرمیس ماگنس کوریتیبا شہر میں الیکٹرونکس مصنوعات بنانے والی ایک چھوٹی کمپنی کا مالک تھا۔

پولیس ہرمیس کے الزام کی تفتیش کرنے لگی۔ چھان بین سے معلوم ہوا کہ تمام بڑے برازیلی شہروں میں مخصوص جرائم پیشہ گروہ منی لانڈرنگ میں ملوث ہیں۔ اس انکشاف کے بعد تفتیش کا دائرہ کار پھیلتا چلا گیا۔ آخر پولیس نے چار گروہوں کے سرداروں کو گرفتار کر لیا۔ جب ان سے پوچھ گچھ ہوئی تو حیران کن انکشافات سامنے آئے۔

دو گروہوں کے سردار لبنانی عیسائی' البرٹو یوسف اور کارلوس حبیب تھے۔ انہوں نے ہی ایسے حقائق افشا کیے جنہوں نے برازیل میں ہلچل مچا دی۔ انہوں نے بتایا کہ سیاست داں، سرکاری افسر اور صنعت کار گٹھ جوڑ کر کے قومی خزانے کو اربوں ڈالر سے محروم کر چکے۔

حکمران طبقے سے تعلق رکھنے والے اس طاقتور کرپٹ گروہ کا طریق واردات یہ تھا کہ جب کسی سرکاری کمپنی کا ٹینڈر کھلتا تو وہ اس نجی ٹھیکے دار کو دیا جاتا جو متعلقہ علاقے کے اراکان پارلیمنٹ اور کمپنی کے افسروں کو سب سے زیادہ رشوت دیتا تھا۔ رشوت دینے کے صلے میں ٹینڈر کی حقیقی رقم میں تگنا چوگنا اضافہ کر دیا جاتا تاکہ ٹھیکے دار کو بھی مالی فائدہ ہو سکے۔ اس کرپٹ کھیل کے ذریعے سیاست دانوں، سرکاری افسروں اور صنعت کاروں و کاروباریوں پر مشتمل ٹگڈم نے اربوں ڈالر کما لیے۔

یہ ٹگڈم رشوت میں ملے سیاہ دھن کو البرٹو یوسف، کارلوس حبیب، نیلما فدومے، رول ہنریک وغیرہ کے جرائم پیشہ گروہوں کی مدد سے سفید دھن میں تبدیل کرواتا تھا۔

ان گروہوں نے کارواش (گاڑیاں دھونے والے) اسٹیشن، شوروم اور دیگر کاروبار چلا رکھے تھے تاکہ منی لانڈرنگ کی جا سکے۔ چونکہ البرٹو یوسف بھی ایک کارواش اسٹیشن کا مالک تھا لہٰذا کرپشن اسکینڈل کو ''کارواش'' کا نام مل گیا۔

<footer>

</footer>

بہادر برازیلی جج، سرگیو مورو

پولیس اور جج کا اتحاد

کہتے ہیں کہ تاریکی چاہے کتنی ہی پھیل جائے، وہ روشنی کو کبھی نابود نہیں کر سکتی۔ برازیل کے کارواش اسکینڈل نے یہی سچائی نمایاں کر دی۔ اس اسکینڈل کی تفتیش برازیلی وفاقی پولیس کے ذمے تھی۔ جب چھان بین سے بڑے بڑے نام سامنے آنے لگے، تو وفاقی پولیس کے افسر اعلیٰ پر نامی گرامی سیاست داں دباؤ ڈالنے لگے کہ یہ تفتیش روک دی جائے۔ تاہم آئی جی پولیس نے کرپٹ ٹولے کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔

فرض شناس اور محب وطن پولیس افسروں کو عدلیہ میں موجود ایک نوجوان وفاقی جج، سرگیو مورو کی طرف سے بھی اخلاقی مدد ملی۔ جب پولیس نے اپنی تفتیش جج مورو کی عدالت میں پیش کی، تو اس نے حکم دیا کہ چھان بین کا دائرہ کار بڑھا دیا جائے۔ یوں پولیس اور عدلیہ نے برازیل میں کرپٹ مگرمچھوں کو بے نقاب کرنے کی خاطر ہاتھ ملا لیے۔

تفتیش سے انکشاف ہوا کہ ارکان پارلیمنٹ کی نصف سے زیادہ تعداد کرپشن میں ملوث ہے۔ حتیٰ کہ سابق صدر لولا بھی ''کک بیکس'' لینے کا مجرم قرار پایا۔ اس نے عدالتی فیصلے کے خلاف برازیلی سپریم کورٹ میں اپیل کر رکھی ہے جس نے اُسے ساڑھے نو برس قید کی سزا سنائی تھی۔

فرڈیننڈ کولر ۱۹۹۰ء تا ۱۹۹۲ء برازیل کا صدر رہا ہے۔ یہ بھی کرپشن کے مقدمے میں ماخوذ ہے۔ اس نے بھی مختلف صنعت کاروں سے بھاری رقم لے کر انہیں سرکاری ٹھیکے دیے اور خوب رقم سمیٹی۔ کرپشن کا سیاہ دھن لگژری کاریں، بیش قیمت تصاویر اور ایک کشتی خرید کر سفید بنایا گیا۔

وفاقی پولیس اب تک ''ایک سو سے زائد سیاست دانوں'' کو اپنے شکنجے میں جکڑ چکی۔ ان پر اب کرپشن کرنے کے مقدمے چل رہے ہیں۔ پولیس کو اس لیے کامیابی ملی کہ اُسے بہت سے گواہ مل گئے جو سچ عیاں کرنے کے لیے تیار تھے۔ ان کی مدد سے وہ طاقتور اور بارسوخ شخصیات کے ہاتھوں میں

<footer>

</footer>

ہتھکڑیاں ڈالنے میں کامیاب رہی۔

آپریشن کارواش کی وجہ سے برازیلی حکومت ہی نہیں پورا معاشرہ ہل گیا۔ عوام نے کرپٹ سیاسی لیڈروں کے خلاف زبردست مظاہرے کیے۔ حالات کی وجہ سے ہر شعبہ حیات متاثر ہوا اور مجموعی طور پر برازیل زوال پذیر ہوگیا۔ صدر دیلما روسیف کرپٹ ارکان اسمبلی کے خلاف کارروائی کرنے کے حق میں تھی۔ اُسے مخالف پا کر ارکان اسمبلی صدر دیلما کے خلاف تحریک مواخذہ لے آئے اور اُسے ایوان اقتدار سے نکال باہر کیا۔

لیکن اب برازیلی عوام کو احساس ہو رہا ہے کہ آپریشن کارواش کئی لحاظ سے ملک وقوم کے لیے مبارک بھی ثابت ہوا۔ اس کی وجہ سے حکمران طبقے میں بیٹھے کرپٹ سیاست دانوں اور سرکاری افسروں کا صفایا ہوگیا۔ برازیل میں قانون کی حکمرانی مضبوط ہوئی۔ کرپٹ افراد کو احساس ہوا کہ وہ چاہے کتنے ہی طاقتور اور بارسوخ ہوں، قانون کے لیے ہاتھ ان کی گردنوں تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔

اکثر ترقی پذیر ممالک کے مانند برازیل میں بھی طاقت ور ہستیاں کبھی جیل نہیں جاتی تھیں لیکن اب زمانہ بدل چکا۔ برازیلی پولیس اور عدلیہ تمام بارسوخ مجرموں کے تعاقب میں ہیں۔ وہ اپنے ملک کو کرپشن سے پاک کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔

آپریشن کارواش نے ایک کرشمہ یہ بھی کر دکھایا کہ برازیلی حکمران طبقے نے عمدہ انتظام المعروف گڈ گورننس کو اپنا لیا۔ تمام سرکاری ٹھیکوں میں شفافیت آگئی۔ وہ اہل اور باصلاحیت کمپنیوں کو دیے جانے لگے۔ نئے صدر، مائیکل تیمر حکومت میں کسی قسم کی کرپشن قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ غرض بدی سے نیکی کی کونپل پھوٹی اور آپریشن کارواش برازیل کے سنہرے مستقبل کی نوید بن گیا۔

پروفیسر ڈینی روڈرک ہارورڈ یونیورسٹی سے منسلک مشہور معاشیات داں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کرپشن کے باعث برازیل کو عالمی سطح پر جس ذلت کا سامنا کرنا پڑا تھا، وہ اب تعریف وستائش میں تبدیل ہو چکی۔ وجہ یہ کہ برازیلی پولیس اور عدلیہ نے قانون کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے کرپشن کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے صرف ملک وقوم کی بھلائی ذہن میں رکھی اور کسی سیاسی جماعت سے منسلک نہ ہوئے۔

پاکستان میں بھی قانون نافذ کرنے والے ادارے، کرپشن سے نبرد آزما سرکاری اور نجی ایجنسیاں اور جج برازیل کی مثال سے سبق لے سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر پاکستان میں کرپشن کا جن بوتل کے اندر چلا جائے، تو یہ مملکت محض اپنے قدرتی وسائل کی بدولت علاقائی سپر پاور بننے کی طاقت رکھتی ہے۔

کرپشن کے خاتمے سے حکومتی نظام میں میرٹ پر ہر کام ہوگا۔ یوں صرف باصلاحیت، اہل اور دیانت دار لوگ ہی آگے آئیں گے...... ایسے پاکستانی جو قانون کی حکمرانی اور انصاف کی ضروری فراہمی پر یقین رکھتے ہیں۔ جب بھی ایسے نئے پاکستان نے جنم لیا، وطن عزیز میں مثبت انقلاب آجائے گا۔ تب عام پاکستانی بھی ترقی کے ثمرات سے فائدہ اٹھا کر خوشحال ہو سکے گا۔ ●●●

آپ نے غور کیا؟

جب انسان بوڑھا ہو جاتا ہے، تو وہ جُھک جاتا ہے...... نظریں زمین پر پڑتی ہیں، جیسے کچھ تلاش کر رہا ہے۔

حقیقت میں وہ اپنی جوانی ڈھونڈ رہا ہوتا ہے۔

کینیا میں سپریم کورٹ کا تاریخی فیصلہ

ابو صارم

قانون اور انصاف کا بول بالا کرتے ہوئے طاقتور حکومت کا فراڈ الیکشن کالعدم قرار پاگیا

شرقی افریقا میں واقع مملکت، کینیا کا نام ذہن میں آتے ہی وسیع وعریض چراگاہیں سامنے آجاتی ں جہاں شیر، ہرن، زیبرے دوڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس ک میں تقریباً پانچ کروڑ انسان بھی آباد ہیں جو چالیس سے ائد قبائل میں تقسیم ہیں۔ ماضی میں یہ علاقہ مسلمانوں کی کلوہ لانت (دسویں تا سولہویں صدی) میں شامل رہا ہے۔ اسی ران اسلام کینیا میں پھلا پھولا۔ چنانچہ آج مسلمان کینیا میں سب سے بڑی اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی تعداد کل آبادی کا ۱۱ء۱۱ فیصد (تقریباً چوالیس لاکھ) ہے۔

۱۸۸۸ء میں برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے کینیا پر قبضہ کر لیا۔ اس نے جی بھر کر ملک کے قدرتی وسائل لوٹے۔ البتہ اپنے مفادات پورے کرنے کی خاطر ریل پٹڑیاں اور سڑکیں بھی تعمیر کروائیں۔ بیسویں صدی میں کینیائی باشندوں نے انگریزوں کے خلاف تحریک آزادی چلائی اور ۱۹۶۲ء میں

آزادی حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔

کینیا میں صدارتی طرز حکومت قائم ہے۔ اب تک چار صدر حکومت سنبھال چکے، مگران کے عہد کرپشن، نااہلی اور فساد کی داستانیں اپنے جلو میں لیے ہوئے ہیں۔ بیشتر ترقی پذیر ممالک کی طرح کینیا کا بھی یہی المیہ ہے کہ اُسے اہل اور دیانت دار قیادت میسر نہ آسکی۔ جو بھی حکمران آیا، وہ اپنے چیلے چانٹوں کو تو فیض یاب کرتا رہا، مگر عوام کی حالت نہ سدھر سکی لہٰذا کینیا میں بھی دولت وسہولیات مٹھی بھر طبقے تک محدود ہیں جبکہ نصف سے زیادہ آبادی غربت کی آغوش میں زندگی گزار رہی ہے۔

۲۰۱۳ء میں صدارتی الیکشن پچپن سالہ سیاست داں، ابورو کینیاٹا نے جیت لیے تھے۔ یہ پہلے کینین صدر، موجو کینیاٹا کا بیٹا ہے۔ دوسرے نمبر پر رایلا اور ینگار ہا جو مملکت کے پہلے نائب صدر، جاراموگی اور ینگا کا بیٹا ہے۔ جاراموگی پہلے موجو کینیاٹا کا ساتھی تھا لیکن بعد ازاں ان کی راہیں جدا ہوگئیں اور دونوں میدان سیاست میں معاصر بن گئے۔ ان کی دشمنی بیٹوں میں بھی منتقل ہوگئی۔

ابورو کینیاٹا

ابورو کینیا کے سب سے بڑے قبیلے، کیکویو (آبادی کا ۲۲ فیصد حصہ) سے تعلق رکھتا ہے۔ رایلا کا تعلق تیسرے بڑے قبیلے، لو (۱۳ فیصد) سے ہے۔ کئی ترقی پزیر کی طرح کینیا میں بھی نسلی وقبائلی وفاداریاں ہر الیکشن میں کسی امیدوار کی ہار یا جیت میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ۷۲ سالہ رایلا کینین مسلمانوں میں زیادہ مقبول ہے جن کی بیشتر تعداد مغربی ساحلی علاقوں میں قیام پزیر ہے جبکہ وسطی کینیا کے باشندے ابورو کی حمایت کرتے ہیں۔

جاراموگی اور رایلا اور ینگا، دونوں بائیں بازو (لیفٹ) کے سیاست داں ہیں۔ یہی وجہ ہے، مغرب پسند اسٹیبلشمنٹ انہیں ناپسند کرتی ہے۔ رایلا کینین سیاست میں ایک دیو ہیکل شخصیت ہے۔ اس نے عوام کو سیاسی حقوق دلوانے کی خاطر سرگرم کردار ادا کیا ہے۔

یہ رایلا کی طویل کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ۲۰۱۰ء میں نیا آئین وجود میں آیا۔ اس آئین کے ذریعے عوام کو ایسے کئی حقوق مل گئے جو پہلے انہیں حاصل نہ تھے۔ اسی لیے کینیا میں اسے ''دوسری تحریک آزادی'' کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

اس نے پہلے پہل ۱۹۹۲ء کے صدارتی الیکشن میں حصّہ لیا مگر جیت نہ سکا۔

صدارتی الیکشن ۲۰۱۷ء میں یہ قوی امکان تھا کہ رایلا جیت جائے گا، مگر اسٹیبلشمنٹ نے انتخابات میں دھاندلی کرڈالی۔ یوں معاصر امیدوار، ماوائی کیبکی دس لاکھ جعلی ووٹوں کی مدد سے جیت گیا۔ رایلا نے یہ فراڈ الیکشن مسترد کردیا۔ تاہم اس نے الیکشن کالعدم کروانے کی خاطر قانونی راستہ اختیار نہیں کیا۔ وجہ یہ کہ وہ کینین سپریم کورٹ اسٹیبلشمنٹ کی ''ربڑ اسٹمپ'' سمجھتا تھا۔

الیکشن ہار جانے پر رایلا کے حامی چراغ پا ہوگئے۔ کئی علاقوں میں انہوں نے کیکویو باشندوں پر حملہ کرکے انھیں مار ڈالا۔ جواباً کیکویو نے بھی یو قبیلے کے بہت سے مرد وزن مار ڈالے۔ کینیا کئی ماہ تک قبائلی فساد کا نشانہ بنا رہا جس میں تقریباً ایک ہزار لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ جب کہ لاکھوں گھرانے بے گھر ہوگئے۔ یہ فساد بھی ختم ہوا جب رایلا اور بقیہ صفحہ نمبر ۲۷ پر

طالب ہاشمی

نیکی کی طاقت

تاریخ اسلام سے سبق آموز واقعات کا جامع انتخاب

کفار مکہ رسولِ پاک ﷺ کے سخت دشمن تھے لیکن جب وہ دیکھتے کہ آپ ﷺ ہمیشہ سچ بولتے ہیں، نیکی کے کاموں میں سب سے آگے رہتے ہیں اور جو بات آپ ﷺ کے منہ سے نکلتی ہے پوری ہو کر رہتی ہے تو وہ دل میں ڈرتے کہ کہیں آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے اُن کے بارے میں کوئی ایسی بات نہ نکل جائے کہ وہ کسی مصیبت میں پھنس جائیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک یتیم لڑکا جس کے بدن پر کپڑے تک نہ تھے، روتا ہوا آپ ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ میرے باپ نے مرتے وقت مجھے ابوجہل کے سپرد کیا تھا لیکن اس نے میرے باپ کے چھوڑے ہوئے سارے مال پر قبضہ جما لیا ہے اور مجھے اس میں سے کچھ دینے سے انکاری ہے۔ میں قریش کے دوسرے سرداروں کے پاس فریاد لے کر گیا لیکن انہوں نے میری کوئی مدد نہیں کی اور مجھے آپ ﷺ کے پاس بھیج دیا۔

ابوجہل قریش کا مانا ہوا سردار تھا اور آپ ﷺ کا جانی دشمن۔ کسی کو یہ خیال تک نہ آسکتا تھا کہ وہ آپ ﷺ کی بات مان لے گا لیکن آپ ﷺ یتیم لڑکے کی بات سُن کر فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کو ساتھ لے کر سیدھے ابوجہل کے پاس تشریف لے گئے۔ وہ آپ ﷺ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ آپ ﷺ نے اس سے اور کوئی بات نہ کی، صرف یہ فرمایا:

''اس بچّے کا حق اسے دے دو۔''

یہ نیکی کی بات تھی اور نیکی میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ ابوجہل کو انکار کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور اس نے فوراً اس لڑکے کا مال لاکر اس کو دے دیا۔

قریش کے جن سرداروں نے اس لڑکے کو آپ ﷺ کے پاس بھیجا، وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ ابوجہل حضور ﷺ سے لڑ پڑے گا اور ان کو یہ لڑائی دیکھ کر بڑا مزا آئے گا مگر جب ان کو معلوم ہوا کہ ابوجہل نے آپ ﷺ کے کہنے پر یتیم لڑکے کا مال فوراً اس کو دے دیا تو وہ بھاگے بھاگے اس کے پاس گئے اور اس کو طعنہ دیا کہ تم نے بھی اپنا مذہب چھوڑ دیا۔ اس نے کہا،

خدا کی قسم، میں نے اپنا مذہب نہیں چھوڑا۔ بات یہ ہوئی کہ جب محمد ﷺ نے مجھ سے اس لڑکے کا مال دینے کے لیے کہا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ اُس کے دائیں بائیں ایک ایک ہتھیار رکھا ہے جو مجھے چیر کر رکھ دے گا اگر میں نے اس کی بات نہ مانی۔ اس لیے میں اس لڑکے کو مال دینے پر مجبور ہو گیا۔

❁❁

ایک دفعہ ایک شخص کہیں دور سے اونٹ لے کر مکّہ آیا اور ان کو بیچنا چاہا۔ ابوجہل نے یہ سارے اونٹ اس سے لے لیے۔ جب اس نے قیمت مانگی تو وہ ٹال مٹول کرنے لگا۔ اس شخص نے کعبہ میں جا کر قریش کے دوسرے سرداروں کے سامنے فریاد کی۔ رسولِ پاک ﷺ بھی کعبہ کے ایک گوشے میں تشریف رکھتے تھے۔ ان سرداروں نے فریادی سے کہا کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے پھر حضور ﷺ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے، دیکھو وہ آدمی جو اس کونے میں بیٹھا ہے، اُس کے پاس جاؤ وہ تمہارا روپیا دلوا دے گا۔ فریادی رسولِ پاک ﷺ کی طرف چلا تو قریش کے سرداروں نے آپس میں کہا ''آج بڑا مزا آئے گا۔''

فریادی نے جا کر حضور ﷺ کے سامنے ابوجہل کے ظلم کا حال بیان کیا تو آپ ﷺ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے ساتھ لے کر ابوجہل کے گھر کی طرف چل پڑے۔ جب وہاں پہنچے تو دروازے کی کُنڈی کھٹکھٹائی۔ ابوجہل نے اندر سے پوچھا، ''کون؟''

آپ ﷺ نے جواب دیا: ''محمدؐ۔''

وہ حیران ہو کر باہر نکل آیا۔ آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: ''اس شخص کے اونٹوں کی قیمت دے دو۔''

ابوجہل نے کہا، ''ابھی دیتا ہوں۔'' پھر وہ اندر گیا اور اونٹوں کی قیمت لا کر فریادی کے ہاتھ پر رکھ دی۔

قریش کے سرداروں نے اپنا ایک آدمی حضور ﷺ کے پیچھے بھیج دیا تھا تاکہ وہ جو کچھ دیکھے ان کو آ کر بتائے۔ اس آدمی نے ابوجہل کو حضور ﷺ کی بات مانتے دیکھا تو دوڑتا ہوا قریش کے سرداروں کے پاس گیا اور کہنے لگا:

''خدا کی قسم آج میں نے جو کچھ دیکھا ہے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ابوالحکم بن ہشام (ابوجہل) جب گھر سے نکلا تو محمد (ﷺ) کو دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور جب محمد (ﷺ) نے اس سے کہا کہ اس شخص کا حق دے دو تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ ابوجہل کے جسم میں جان نہیں ہے۔''

ایک اور روز کا واقعہ ہے کہ رسولِ پاک ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص کعبہ شریف میں تشریف رکھتے تھے۔ ایک دیہاتی آدمی (بدّو) آیا اور کہنے لگا: ''اے قریش کے لوگو! تم باہر سے آنے والوں کو لُوٹ لیتے ہو۔ اب تمہارے پاس اپنی کوئی چیز بیچنے کون آئے گا؟''

اس نے کہا: ''ابوالحکم (ابوجہل) نے میرے تین سب سے اچھے اونٹ خریدنے کی خواہش ظاہر کی اور ان کی قیمت بہت کم لگائی۔ اب کوئی اور شخص اس کے ڈر سے زیادہ قیمت پر اونٹ خریدنے کے لیے تیار نہیں۔ اگر اس کی لگائی ہوئی قیمت پر بیچ دوں تو مجھے سخت نقصان ہوتا ہے۔''

حضور ﷺ اس کے ساتھ چل پڑے اور تینوں اونٹ مناسب قیمت پر اس سے خود خرید لیے جس سے وہ خوش ہو گیا۔ ابوجہل دور بیٹھا ہوا ان اونٹوں کو پکتے دیکھ رہا۔ آپ ﷺ اس کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا: ''اگر تم نے آئندہ کسی کے ساتھ ایسی حرکت کی جو اس غریب کے ساتھ کی ہے تو تمہارے لیے اچھا نہ ہوگا۔''

ابوجہل بولا: ''آئندہ میں کبھی ایسا نہیں کروں گا۔''

یہ دیکھ کر دوسرے کافر اس کو شرم دلانے لگے کہ تم محمد (ﷺ) کے سامنے بھیگی بلّی بن گئے۔ معلوم ہوتا ہے تم ان کا دین قبول کرنے والے ہو۔

ابوجہل نے کہا، ''خدا کی قسم میں کبھی ان کا دین قبول نہیں

کروں گا مگر مجھے یوں نظر آیا کہ جب وہ مجھ سے بات کر رہے تھے تو ان کے دائیں اور بائیں کچھ لوگ نیزے تانے کھڑے تھے۔ میں ڈرا کہ اگر میں نے ان کی بات نہ مانی تو وہ نیزوں سے میرا سینہ چھید دیں گے۔''

خوفناک اونٹ

رسولِ پاک ﷺ نے لوگوں کو اللہ کے سچے دین کی طرف بُلانا شروع کیا تو مکہ کے کافر آپ ﷺ کے سخت دشمن بن گئے۔ ان دشمنوں کا سردار ابوجہل تھا۔ ایک دن اُس نے قریش کے کافروں کو جمع کیا اور ان سے کہنے لگا:

''اے قریش کے لوگو! تم نے دیکھ لیا ہے کہ محمدؐ کو ہم نے بہتیرا کہا کہ وہ مذہب اور ہمارے بُتوں کو بُرا نہ کہیں اور نہ ہمارے باپ دادا کو گمراہ کہیں لیکن انہوں نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ ایسا ضرور کریں گے۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ کل ایک پتھر لے کر بیٹھوں گا اور جب وہ نماز میں سجدہ کریں گے تو اس پتھر سے ان کا سر کچل ڈالوں گا۔''

دوسرے روز وہ پتھر لے کر کعبہ گیا اور آپ ﷺ کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ رسولِ پاک ﷺ ہر روز کی طرح کعبہ تشریف لائے اور نماز پڑھنے لگے۔ قریش کے لوگ بھی یہ دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے کہ ابوجہل کیا کرتا ہے۔

رسولِ پاک ﷺ جب سجدے میں گئے تو ابوجہل آپ ﷺ کو پتھر مارنے کے لیے آگے بڑھا مگر یکایک وہ آپ ﷺ کے قریب پہنچ کر پیچھے کی طرف بھاگا۔ خوف سے اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا تھا اور پتھر بھی اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ قریش کے لوگوں نے اس سے پوچھا:

''یہ تمہیں کیا ہو گیا؟''

اس نے کہا:

''میں پتھر مارنے کے لیے محمدؐ کے قریب پہنچا تو میرے سامنے ایک ایسا زبردست اونٹ آ گیا کہ میں نے کبھی اتنے بڑے سر اور ایسی گردن اور ایسے نوک دار دانتوں والا اونٹ نہ دیکھا تھا اور وہ مجھے چبا ڈالنا چاہتا تھا۔ اسی لیے میں اپنی جان بچانے کے لیے پیچھے ہٹ گیا۔''

بعد میں رسولِ پاک ﷺ نے لوگوں کو بتایا کہ وہ جبریل علیہ السلام تھے۔

وعدہ ضرور پورا کرو

رسولِ پاک ﷺ بدر کی لڑائی کے لیے روانہ ہوئے تو مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اور آپ ﷺ کو ایک ایک آدمی کی سخت ضرورت تھی۔ لڑائی سے پہلے دو مسلمان حضرت حُسَیل رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے حضرت حُذَیفہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

''اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم مکّہ سے آ رہے تھے کہ راستے میں کافروں نے ہمیں پکڑ لیا اور پھر اس شرط پر ہمیں چھوڑا کہ ہم لڑائی میں مسلمانوں کا ساتھ نہیں دیں گے مگر یہ مجبوری کا وعدہ تھا اگر ہم ایسا نہ کرتے تو وہ ہمیں کبھی نہ چھوڑتے۔ اب ہمارا ارادہ ہے کہ ہم کافروں کے خلاف لڑیں۔''

آپ ﷺ نے فرمایا:

''ہرگز نہیں، تم اپنا وعدہ ضرور پورا کرو اور لڑائی میں حصہ نہ لو۔ ہمیں صرف اللہ کی مدد چاہیے۔''

اسی طرح آپ ﷺ کے ایک صحابی حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ جس زمانے میں اسلام نہیں لائے تھے، مکّہ کے کافروں نے ان کو کوئی پیغام دے کر رسولِ پاک ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ وہ آپ ﷺ کو دیکھتے ہی اسلام قبول کرنے پر تیار ہو گئے اور آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا:

''اے اللہ کے رسول ﷺ! میں اب کافروں کے پاس واپس نہیں جاؤں گا۔''

آپ ﷺ نے فرمایا:

''میں نہ تو وعدہ توڑتا ہوں اور نہ پیغام لانے والوں کو اپنے پاس روکتا ہوں۔ تم اس وقت واپس جاؤ۔ بعد میں چاہو تو میرے پاس آ جانا۔''

چنانچہ حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ واپس چلے گئے اور کچھ مدّت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔

دُشمنوں سے بھی اِنصاف

ایک دفعہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک پیارے ساتھی، حضرت عبداللہ بن سہل انصاری رضی اللہ عنہ کھجوروں کی بٹائی کے لیے خیبر گئے۔ اُن کے چچازاد بھائی حضرت مُحیّصہ رضی اللہ عنہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ حضرت عبداللہؓ شہر خیبر کی ایک گلی سے گزر رہے تھے کہ کسی نے ان کو شہید کر ڈالا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ کام کسی یہودی کا ہے کیونکہ یہی لوگ مسلمانوں کے دشمن تھے۔

حضرت مُحیّصہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ واپس آ کر رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے مُقدّمہ پیش کیا اور عرض کیا، ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میرے بھائی کو یہودیوں نے شہید کیا ہے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''تم قسم اٹھا سکتے ہو کہ عبداللہؓ کو یہودیوں نے شہید کیا''

حضرت مُحیّصہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''تو پھر یہودیوں سے قسم لی جائے کہ انہوں نے عبداللہؓ کو قتل نہیں کیا۔''

حضرت مُحیّصہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ان لوگوں کا کیا اعتبار، یہ تو سَو جھوٹی قسمیں کھالیں گے۔''

خیبر میں صرف یہودی آباد تھے اور وہی حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے قاتل ہو سکتے تھے لیکن موقع کا گواہ کوئی نہیں تھا اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گواہی کے بغیر اسلام کے ان دشمنوں پر بھی الزام نہ لگایا اور حضرت عبداللہؓ کے خون کے بدلے ان کے وارثوں کو سو (۱۰۰) اونٹ بیت المال سے دلا دیے۔

معلمِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

امام احمد اور امام نسائی رحمہما اللہ تعالیٰ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت نقل کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''بلاشک وشبہ مجھے اللہ تعالیٰ نے جھڑکنے والا بنا کر مبعوث نہیں فرمایا بلکہ مجھے آسانی کرنے والا معلم بنا کر بھیجا ہے۔''

امام نووی رحمۃ اللہ اپنی کتاب ''تہذیب'' میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اخلاق وعادات کی تمام خوبیوں اور کمالات اور اعلیٰ صفات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی میں جمع فرما دی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اوّلین وآخرین کے علوم سے جو آپ کے شایانِ شان تھے، بہرہ ور فرمایا تھا حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''اُمّی'' تھے، کچھ لکھ پڑھ نہ سکتے تھے۔ نہ انسانوں میں سے کوئی آپ کا معلّم تھا۔ اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسے علوم عطا فرمائے گئے جو اللہ تبارک تعالیٰ نے تمام کائنات میں کسی اور کو نہیں دیے۔''

امام الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا ہر لمحہ اور ہر گوشہ تعلیم وتعلم سے پُر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خلوت وجلوت دونوں میں اس سلسلے کو جاری رکھا۔ کبھی منفرد کے ساتھ تو کبھی اجتماع میں اور صحابہ اور صحابیات دیوانہ وار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعلیم و تربیت حاصل کرتے اور عمل میں لاتے رہے۔ رضی اللہ عنہم وعنہا۔

مرسلہ: حفصہ محمد فیصل، کراچی

قومی ترانے کے خلاف سازش

شاہد لطیف

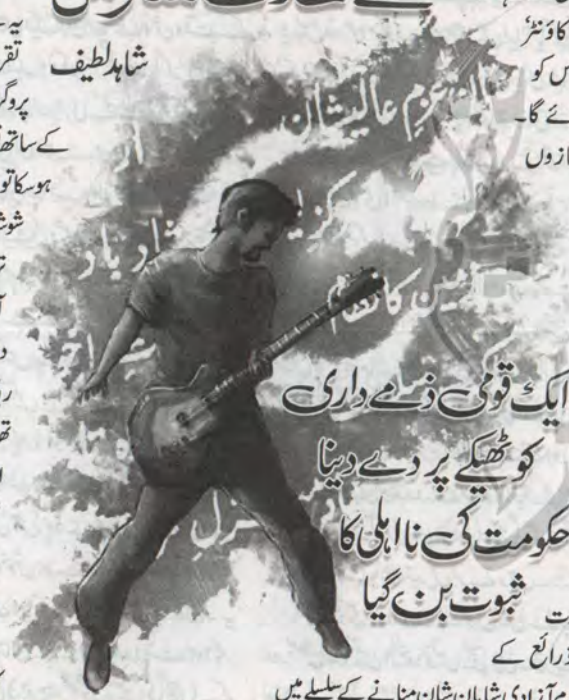

وزارتِ اطلاعات، نشریات وقومی ورثہ، حکومتِ پاکستان کی جانب سے ۲۰/اگست کے قومی اخبارات میں آدھے صفحے کا اشتہار شائع ہوا۔ اس کا لبِ لباب یہ ہے کہ پاکستان کا قومی ترانہ اب دوبارہ نئے سازوں اور آوازوں کے ساتھ صدا بند کیا جانے والا ہے۔ اِس میں کیا ساز ہوں؟ ان کی تفصیل بھی درج ہے۔ یہ بھی واضح لکھا ہے کہ اب آوازوں کے 'کاؤنٹر' کا استعمال کروا کر اس کو مغربی رنگ دیا جائے گا۔ موسیقاروں اور فلمسازوں سے تکنیکی اور مالی بنیاد پر پیشکشیں مانگی گئی ہیں۔

ترانے کی ویڈیو ریکارڈنگ کی تفصیل اس کے علاوہ ہے۔

اس اشتہار سے کئی سوال پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ اِس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ذرائع کے مطابق ۷۰واں یومِ آزادی شایانِ شان منانے کے سلسلے میں مذکورہ وزارت میں ایک اعلیٰ سطحی میٹنگ ہوئی۔ سیکریٹری انفارمیشن کی موجودگی میں اور باتوں کے علاوہ یہ بھی طے ہوا کہ پاکستان کا قومی ترانہ اور اُس کا سازینہ نئے زمانے اور تقاضوں کے تحت دوبارہ نئی آوازوں اور سازوں سے ریکارڈ کیا جائے۔ پھر ایک نہایت خوبصورت ویڈیو بنائی جائے۔

۱۴/اگست ۲۰۱۷ کے پس منظر میں باقی تمام پروگراموں پر عمل کروالیا گیا لیکن ''کسی'' وجہ سے اِس منظور شدہ کام کو ''مناسب وقت'' کے لیے اُٹھا رکھا گیا۔ سوال یہ ہے کہ ۱۴/اگست کی تقریبات کے لیے ایک پروگرام ''نئے ساز وآواز کے ساتھ قومی ترانہ'' اگر پیش نہیں ہو سکا تو اب کس بنیاد پر اس کا شوشا چھوڑا گیا؟ اگر قومی ترانے کو ۷۰ویں یومِ آزادی کے سلسلے میں دوبارہ سرکاری طور پر ریکارڈ کروانا بہت ضروری تھا تو یہ کام وزارتِ اطلاعات ونشریات کے ماتحت سرکاری اداروں سے کروالیا جاتا جن میں پاکستان ٹیلی وژن، پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن، شالیمار ریکارڈنگ کمپنی، ڈیپارٹمنٹ آف فلم اینڈ پبلیکیشنز، ٹوارزم اور کلچرل ڈیپارٹمنٹ وغیرہ شامل ہیں۔

کیا یہ سرکاری ادارے سفید ہاتھی ہیں؟ اگر ان میں قابل لوگ موجود نہیں تو ان اداروں کا فائدہ کیا ہے؟ اداروں کی

موجودگی میں بھی اگر ٹینڈر مانگے جا رہے ہیں تو پھر انہیں بھی نجی شعبے کے سپرد کر دیا جانا چاہیے۔

لگتا ہے اس اشتہار کے پیچھے اصل محرکات کچھ اور ہیں۔ بات اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی ہے لیکن مثال دینا مجبوری ہے۔ ریڈیو، فلم اور ٹیلی ویژن کی مشہور شخصیت سہیل رعنا کو کون نہیں جانتا۔ موسیقی وجہ شہرت ہے لیکن قسمت اور بخت کے لحاظ سے ہمارے ملک میں ان جیسا کوئی اور نہیں۔ میں پاکستان ٹیلی وژن کراچی مرکز میں شعبہ پروگرامز سے منسلک تھا۔

۱۹۸۰ء کے اوائل میں ایک دِن اچانک اُس وقت کے پروگرامز منیجر صاحب نے ایک انوکھا حکم سنایا کہ پی ٹی وی کے منیجنگ ڈائریکٹر، ضیا نثار جالندھری کے لکھے ایک قومی نغمے کو فوراً ریکارڈ کروا کر نشر بھی کروانا ہے۔ میرے ذہن میں فوراً مہدی ظہیر، سہیل رعنا اور عالی صاحب والا مشہور نغمہ ''اللہ اکبر'' آ گیا۔ سہیل رعنا سے اس نغمے کی دھن بنانے کی تجویز پیش کی جو منظور ہو گئی۔ میں نے تمام ماجرا سنا کر نغمے کے بول بتائے۔

اُنہوں نے کسی تبصرے کے بغیر کہا کہ نمایاں گلوکار حبیب ولی محمد کو رکھ لو، باقی تیس چالیس لڑکے لڑکیاں اور کراچی مرکز پر جو بھی گلوکار/ گلوکارائیں ہیں، سب کو آج ریہرسل پر بُلوا لو۔ دو تین دِن میں نغمہ ریکارڈ ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ سب کچھ سات گھنٹوں کے اندر ہو سکتا ہے لیکن تیس چالیس لڑکیاں اور لڑکوں کے سُر تال میں پورے ہونے کا امتحان کون لے گا؟ اس جواب سے وہ خوش ہوئے، پھر مشورہ ہوا کہ تعداد یہی ہو اور مجھ کو اختیار دے دیا کہ یہ امتحان میں خود لوں۔ یہ انتظام کیسے ہوا؟ یہ الگ داستان ہے۔ وہ نغمہ صدابند ہوا پھر ویڈیو ریکارڈنگ اور تدوین (جو چند گھنٹوں میں کی گئی) کے بعد مقررہ وقت سے کہیں پہلے نشر بھی ہو گیا: نغمے کے بول ہیں:

؎ روشن و رخشاں، نیرّ و تاباں، پاکستان رہے......

جب خاکسار نے معاون پروڈیوسر کی حیثیت سے ایک نغمہ دِنوں میں واجبی بجٹ میں تیار کروا لیا تو وزارت اتنی بڑی فوج کو استعمال میں کیوں نہیں لا پائی۔ یہ اُس کی نااہلی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

اشتہار میں اس کا کوئی ذکر نہیں کہ کون پیشکش دینے کا اہل ہے؟ اب اگر بھارت سے کسی نامور فلمساز یا موسیقار نے نہایت مناسب بجٹ میں یہ کام کرنے کی پیشکش کر دی، تو کیا یہ قومی کام اُس کے سپرد کر دیا جائے گا؟ کیا یہ ہماری غیرت پہ تازیانہ نہیں ہو گا کہ ہم اپنے دشمن سے قومی ترانہ بنوائیں۔ اس قدر اہم قدم اٹھانے سے پہلے کیا وزارت اطلاعات نے قومی پریس اور عوام کو اپنے اعتماد میں لیا؟ یا کوئی پریس کانفرنس کی کہ ہم یہ کرنے جا رہے ہیں؟ کیا سیاسی جماعتوں کا موقف جاننے کی کوشش ہوئی؟ کیا متعلقہ وفاقی وزیر نے قومی اسمبلی یا سینٹ میں ایسے کسی کیے جانے والے اقدام کا ذکر تک کیا؟

ایسے قومی اہم معاملے پر تو ایک عام پاکستانی کی بھی رائے معلوم کرنا بہت ضروری ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ ایک میٹنگ ہوئی اور بالا ہی بالا سب کچھ طے کر لیا۔ قومی اہمیت کی چیزوں کو اتنی آسانی سے نہیں چھیڑا جا سکتا۔ یہ تو بری مثال قائم ہو جائے گی اور اس کو کھیل بنا لیا جائے گا۔ اس طرح تو بالفرض کل کو کسی میٹنگ میں یہ بھی طے کیا جا سکتا ہے کہ قائدِ اعظم رحمتہ اللہ علیہ کا مزار گرا کر دوبارہ نئے دور اور نئے تقاضوں کے تحت اوپن ٹینڈر دے کر بنوایا جائے! یوں ہر آنے والی حکومت کے لیے راہ ہموار ہو جائے گی کہ وہ قومی اہمیت کی چیزوں کو حسبِ منشاء تبدیل کرتے رہیں۔

اکثر قومی معاملات عدالتوں میں لے جائے جاتے ہیں اور بعض عدالتیں از خود نوٹس لیتی ہیں۔ حیرت ہے اتنے اہم معاملے پر کوئی سیاسی قائد نہیں بولا۔ دینی پارٹیاں بھی خاموش ہیں۔ یہاں تو سرے سے موسیقی ہی حرام ہے تو کروڑوں روپے اِس مد میں حکومتِ پاکستان کیوں لگا رہی ہے؟ آخر ہے کوئی پوچھنے والا؟

وزارتِ اطلاعات کی ذمہ داری عوام کو اطلاعات دینا

ہے، مگر بڑے افسوس سے لکھنا پڑ رہا ہے کہ مذکورہ اشتہار میں ایک غلط اطلاع موجود ہے: ''آڈیو'' کے عنوان تلے بارہویں سطر میں تحریر ہے:

''نسوانی آوازیں جو موجودہ قومی ترانے میں مفقود ہیں، انہیں بھی شامل کیا جائے گا''۔

پڑھنے والوں اور حکومت کی ''اطلاع'' کے لیے عرض ہے کہ ۱۹۵۴ء میں محترمہ کوکب جہاں، محترمہ رشیدہ بیگم، محترمہ نجم آراء اور محترمہ نسیمہ شاہین اُن خوش نصیبوں میں شامل تھیں جنہیں ریڈیو پاکستان کراچی میں قومی ترانہ صدابند کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ قارئین! میں یہ بات وثوق سے کہتا ہوں کیوں کہ خاکسار نے محترمہ کوکب جہاں، محترمہ رشیدہ بیگم اور محترمہ نسیمہ شاہین سے خود اس بارے میں پوچھا تھا۔ جناب مہدی ظہیر، احمد بھائی المعروف احمد رشدی اور جناب اختر وصی علی (گلوکارہ مہناز کے والد) بھی اُس صدابندی میں شامل تھے۔ وہ بھی اِن خواتین کا نام احترام سے لیا کرتے تھے۔

نئے قومی ترانے کی ویڈیو کے حوالے سے آخری گزارش ہے کہ وزارتِ سیاحت، ڈیپارٹمنٹ آف فلم اینڈ پبلیکیشنز کے ہوتے ہوئے دوسروں سے کام کروانا کیا معنی رکھتا ہے؟ شمالی علاقہ جات، کوئٹہ، زیارت اور دیگر خوبصورت اور تاریخی علاقوں میں ان اداروں کے ریسٹ ہاؤس موجود ہیں نیز ہر طرح کے ذرائع آمد و رفت اور سہولیات میسر ہیں بشمول قومی ایئر لائن۔

برسبیلِ تذکرہ بتاتا چلوں کہ دوسرے پی ٹی وی ایوارڈ (غالباً ۱۹۸۲ء) میں پورے پاکستان سے تمام فنکار، تکنیکی ماہرین اور پروڈیوسر اسلام آباد میں تین روز تک ٹھہرے تھے۔ یہ سب حکومتی خرچے پر ہوا۔ کیا حکومت اب اتنی کنگال ہو چکی کہ اپنے سرکاری کام ٹینڈر کے بل بوتے پر کروانے لگی ہے؟

پی ٹی وی میں تکنیکی ماہرین جیسے کیمرہ مین، آڈیو مین، ایڈیٹر اور پروڈیوسر وغیرہ موجود ہیں۔ حکومت اگر چاہے تو اُس کا ایک حکم بغیر کسی اضافی خرچے کے ان سے بہترین پروڈکشن لے سکتا ہے۔ سرکاری اداروں میں پہلے بھی جوہرِ قابل موجود تھے اور اب بھی ہیں۔ آزمائش شرط ہے۔ ●●●

سفید کاغذ

پروفیسر صاحب نے بلیک بورڈ پر ایک سفید کاغذ چسپاں کرنے کے بعد اس کے درمیان میں ایک سیاہ نقطہ لگا دیا۔ پھر اپنا رخ کلاس کی طرف کرتے ہوئے طلبہ سے پوچھا آپ کو کیا نظر آ رہا ہے؟ سب نے کہا سیاہ نقطہ۔

پروفیسر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا حیرت ہے اتنا بڑا سفید کاغذ تمہاری نظروں سے اوجھل ہے مگر چھوٹا سا ایک سیاہ نقطہ تمہیں صاف دکھائی دے رہا ہے۔ یاد رکھنا زندگی میں کیے گئے لاتعداد اچھے کام سفید کاغذ کی طرح ہوتے ہیں جب کہ کوئی غلطی یا خرابی محض ایک نقطے کی مانند ہوتی ہے۔ لوگوں کی اکثریت دوسروں کی غلطیوں پر توجہ زیادہ دیتی ہے لیکن اچھائیوں کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ آپ کی ساری زندگی کی اچھائیوں پر آپ کی کوئی ایک کوتاہی یا کسی غلطی کا ایک سیاہ نقطہ ان کو صاف دکھائی دیتا ہے، اسی طرح آپ آدھا گلاس پانی بھر کر اگر لوگوں سے پوچھیں تو کم از کم 80% کہیں گے آدھا گلاس خالی ہے اور 20% کہیں گے کہ آدھا گلاس پانی ہے۔ دونوں صورتوں میں بظاہر فرق کچھ نہیں پڑتا لیکن درحقیقت یہ دو قسم کے اندازِ فکر کی نمائندگی کرتے ہیں ایک منفی ذہن کے لوگ ہر چیز میں خیر تلاش کر لیتے ہیں۔ آپ ہمیشہ مثبت سوچ اپنانے کی کوشش کریں آپ کو بھی ہر چیز میں خیر نظر آئے گی اس میں شخصیت کا نکھار ہے اور اچھی سوچ کی پہچان بھی۔

مہم جوئی

اُن جی داروں کا مہماتی قصہ جو آزادی و امن کی تلاش میں جنگ کے جہنم سے نکلنا چاہتے تھے

ڈاکٹر جمیل انور

ویت کانگ گوریلوں کے قیدی

قسط اول

رات بارہ بجے سے اس اندھے کنویں میں قید تھے فضا میں ڈیزل اور سمندری پانی کی ملی جلی بُو رچی ہوئی تھی۔ یہ ایک پینتالیس میٹر لمبی اور تقریباً آٹھ میٹر چوڑی کشتی تھی جو دریائے میکانگ کے کنارے درختوں کے جھنڈ میں چھپائی گئی تھی۔ دریا اس جگہ بل کھاتا ہوا دائیں جانب مڑ جاتا تھا جس کے بعد پیدا ہونے والے کٹاؤ نے ایک جھیل کی شکل اختیار کرلی تھی۔ کنارے پر اگے ہوئے بے شمار جنگلی درختوں نے دھانے کو اس طرح گھیر رکھا تھا کہ بادی النظر میں یہ جھیل نظر بھی نہ آتی تھی۔ کشتی چھپانے اور ویت کانگ گوریلوں کی نظروں سے بچے رہنے کے لیے کسی نے بہترین جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ دریا میں پٹرولنگ کرتی ہوئی شمالی ویت نامی سپاہیوں کی کشتیوں سے یہ جگہ اوجھل تھی۔

کشتی میں تقریباً سوا سو افراد سوار تھے جن میں شیر خوار بچوں سے لے کر ستر سال کے بوڑھے شامل تھے۔ یہ سب لوگ آزادی اور امن کے خواہاں دنیا کے کسی کونے میں پرسکون زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ ویت نام گذشتہ دس برس سے جنگ کی آگ میں جل رہا تھا۔ اپنے مادرِ وطن کو کوئی بھی ذی شعور انسان چھوڑنا نہیں چاہتا مگر جب ہر طرف سے آہن و آتش کی بارش شروع ہوجائے بازاروں میں خوراک نایاب ہو اور تقریباً ہر روز ہی کسی نہ کسی عزیز کو لحد میں اتارنا پڑے تو اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی انسانی جبلت وطن کی محبت پر غالب آجاتی ہے۔ تب انسان وطن سے ہجرت پر مجبور ہوجاتا ہے

کشتی میں سوار یہ سوا سو کے قریب لوگ بھی ایسے ہی حالات کا شکار اور ویت نام کی جہنم سے نکل جانا چاہتے تھے۔ کشتی میں سوار لوگوں میں سے تقریباً ہر ایک نے اپنے دو چار قریبی عزیزوں کو موت کے گھاٹ اترتے دیکھا تھا۔ چند لوگ تو اپنے خاندان کے آخری زندہ افراد تھے۔

کشتی کا انجن فی الحال خاموش تھا۔ مجھے اور میرے دوست ہانا کو انجن روم کے قریب جگہ ملی تھی۔ ہانا کی دستی گھڑی رات کے تین بج رہے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ میرے پاس بھی ایک گھڑی ہوا کرتی تھی جو برسوں پہلے ایک ویت کانگ گوریلے نے چھین لی تھی۔ فضا میں عجیب سی اداسی اور ماحول پر افسردگی چھائی ہوئی تھی اگرچہ ہم میں سے ہر کوئی گذشتہ کئی ہفتوں سے اس دن کا منتظر تھا مگر اب ملک چھوڑنے کا لمحہ جوں جوں قریب آرہا تھا دلوں پر چھانے والی اداسی گہری ہوتی جا رہی تھی۔

ہانا نے پچھلے آدھے گھنٹے سے کوئی بات نہیں کی تھی اور میرا بھی دل خاموش رہنے کو چاہ رہا تھا۔ ہم کشتی کے جس حصے میں بیٹھے ہوئے تھے یہ وسط میں بنا ہوا ایک پانچ فٹ اونچا ہال نما کمرا تھا جس کی چوبی چھت پر ریلنگ لگا کر عرشے کا کام لیا گیا تھا۔ اس میں داخل ہونے کا واحد راستہ عرشے میں وہ بڑا سا سوراخ تھا جس کے نیچے ایک سالخوردہ سیڑھی لگی ہوئی تھی۔ ہم لوگ اسی سوراخ اور سیڑھی کے ذریعے اس قبر نما ڈھانچے میں داخل ہوئے تھے۔ عرشے پر پڑا ہوا ایک تختہ بوقتِ ضرورت اس سوراخ یا دروازے کو بند کرنے کے کام آتا تھا۔

کشتی کے اس سٹور روم یا تہ خانے میں غالباً مچھلی ذخیرہ کی جاتی تھی کیونکہ اس کی بساند فضا میں موجود تھی۔ کمرے کے تقریباً وسط میں چھت کے ساتھ ایک زنگ آلود لالٹین لٹک رہی تھی جس کی زرد روشنی میں کشتی میں سوار لوگوں کے چہرے مزید زرد اور لاغر دکھائی دیتے تھے۔ اسی اندھیرے کمرے کے ایک کونے میں کشتی میں سوار لوگوں کے لیے خوراک اور پانی کے کنستر رکھے ہوئے تھے کشتی کی منزل کیا تھی اس بارے میں شاید صحیح طور پر ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ بعض لوگ تھائی لینڈ بتاتے۔ کچھ کا خیال تھا کہ فلپائن جائیں گے۔ بعض لوگ انڈونیشیا یا ملائیشیا کی طرف جانے کی بات کررہے تھے صحیح منزل کا کسی کو بھی علم نہیں تھا۔ کشتی والوں نے لوگوں کو مختلف منزلیں بتا کر دام کھرے کرلیے تھے۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ ہماری طرح کے بے یارومددگار لوگوں کو کھلے سمندر میں گزرتے ہوئے بحری جہاز اٹھا کر کسی محفوظ ملک پہنچا دیتے ہیں۔ دراصل ویت نام کے حالات اس قدر خراب ہوچکے تھے کہ فرار ہونے والوں کا اصل مقصد ملک سے نکلنا ہوتا تھا۔ انہوں نے پہنچنا کہاں ہے اس بارے میں وہ اس وقت سوچتے جب کشتی ویت نام کی سمندری حدود سے نکل جاتی۔

سقوط سائیگان کے بعد جنوبی ویت نام میں زندگی عام شہریوں کے لیے جہنم بن چکی تھی۔ روسی سٹین گنوں سے مسلح ویت کانگ گوریلے جب چاہتے کسی گاؤں کو گھیر لیتے۔ تمام مردوں کو گاؤں کے وسط میں اکٹھا کرلیا جاتا۔ جو ذرا سی مزاحمت کرتا اسے موقع پر ہی گولی مار دی جاتی۔ کسی نوجوان پر ذرا سا بھی شک گزرتا کہ وہ جنوبی ویت نام کی طرف سے لڑتا رہا ہے اس نے کسی موقع پر امریکیوں کی مدد کی تھی یا ویت کانگ گوریلوں کو پناہ دینے سے انکار کیا تھا اس کا انجام بھی سرِعام موت ہوتا۔ ہر گاؤں سے پانچ چھ افراد ایسے ضرور علیحدہ کرلیے جاتے جنہیں شک یا مزاحمت کی بنیاد پر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔

تیس برس سے کم عمر توانا اور تندرست لوگوں کو کیمپوں میں لے جانے اور بیگار کروانے کے لیے علیحدہ کرلیا جاتا۔ نوجوان عورتوں کو بھی ٹرکوں میں لاد کر کیمپوں میں بھیج دیا جاتا۔ گاؤں والوں کو حکم ملتا کہ وہ اناج کی بوریاں ٹرکوں پر لدوا دیں۔ گاؤں میں آسودہ حال لوگوں کی تلاشی لی جاتی۔

اسی بہانے گھر سے ملنے والی ہر قیمتی چیز جبراً لے لی جاتی۔ ان حالات سے تنگ آئے ہوئے لوگ ویت نام سے نقل مکانی کرنے لگے مگر اس جہنم سے فرار ہونا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ویت کانگ کی موٹر بوٹس سمندر میں ہر وقت گشت پر رہتیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ سمندری راستے سے فرار کی دس کوششوں میں سے صرف ایک یا دو کوششیں کامیاب ہو پاتیں۔

کشتی کے مسافروں میں موجود چھوٹے بچوں کو خواب آور گولیاں دے کر سلا دیا گیا تھا مگر کبھی کبھار کوئی بچہ جب رونے لگتا تو ماں باپ اسے جلد از جلد دوبارہ سلانے کی کوشش کرتے۔ سطح آب پر موجود کشتی ہلکے ہلکے ہچکولے کھا رہی تھی جس کے باعث نیند نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ خبر نہیں کہ میں کتنی دیر سویا رہا۔ آنکھ اس وقت کھلی جب ہانا میرا بازو پکڑے مجھے زور زور سے جھنجوڑ رہا تھا۔ کشتی کا انجن پوری رفتار سے چل رہا تھا اور اس سے نکلنے والی بو اور ڈیزل کے بخارات پورے تہ خانے میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود آدھے سے زیادہ لوگ سوئے ہوئے تھے۔

چھت پر لگی لالٹین نجانے کب کی بجھ چکی تھی۔ چھت کے قریب نصب پورٹ ہولز کے دبیز اور گندے شیشوں سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی جس کا مطلب تھا کہ صبح کی آمد آمد ہے۔ اندر بیٹھے بیٹھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ کشتی ایک خاص سمت تیز رفتاری سے بھاگی چلی جا رہی ہے۔ ہانا نے قریبی سیڑھی پر چڑھ کر چھت پر لگے دروازے کو دو تین مرتبہ کھٹکھٹایا۔ اسے ڈیزل کی بو سے سخت کھانسی آ رہی تھی اور وہ عرشے پر جانا چاہتا تھا۔ دروازہ اوپر سے کسی نے کھول دیا۔

ہانا نے مجھے بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں سیڑھی چڑھ کر عرشے پر نکل آئے۔ چاروں طرف سمندر پھیلا ہوا تھا۔ سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ صبح کی ہوا میں خوشبو اور تازگی تھی جس سے طبیعت کا بوجھل پن یکدم ختم ہوتا محسوس ہوا۔ کشتی کے اگلے حصے میں عملے کے دو آدمی کھڑے تھے۔ قریب ہی عرشے پر دو آدمی سو رہے تھے۔ ایک تندرست و توانا اور چوکنا شخص کشتی کا رخ متعین کرنے والے سٹیرنگ پر کھڑا تھا اس کی نگاہیں افق پر لگی تھیں جس طرف کشتی بھاگی چلی جا رہی تھی۔

کشتی خاصی پرانی مگر مضبوط لکڑی سے بنی ہوئی تھی۔ عرشے پر چاروں طرف تقریباً تین فٹ اونچی ریلنگ تھی جس پر نیلا رنگ کیا گیا تھا۔ میں اور ہانا ریلنگ کے سہارے عرشے پر کھڑے ہو گئے۔ ہمیں عرشے پر آتے دیکھ کر کچھ اور لوگ بھی تہ خانے سے نکل آئے اور اب تازہ ہوا میں لمبے لمبے سانس لے رہے تھے۔ کشتی انجانی منزل کی طرف تیزی سے رواں دواں تھی مگر مسافروں کے چہروں کی طمانیت ظاہر کرتی تھی کہ انہیں منزل کی کوئی پروا نہیں تھی، وہ صرف ویت نام سے فرار چاہتے تھے۔ یہی ان کی پہلی منزل تھی جسے پانے میں وہ شاید کامیاب ہو چکے تھے مگر خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ ابھی ہم ویت نام کی سمندری حدود میں تھے۔ سمندر میں گشت کرتے ہوئے ویت کانگ گوریلوں سے کسی وقت بھی مڈھ بھیڑ ہو سکتی تھی۔

کشتی کے اگلے سرے پر کھڑے دونوں افراد وقفے کے بعد دوربین سے اردگرد کا جائزہ لے رہے تھے۔ اب سورج نکل آیا تھا۔ اس کی روپہلی کرنیں جب سمندر پر پڑتیں تو لہریں نارنجی رنگ کی دکھائی دینے لگتیں۔ نارنجی رنگ سے مجھے اسی رنگ کا وہ کمبل یاد آ گیا جو میری ماں ہم بچوں پر اوڑھایا کرتی تھیں تاکہ ہمیں سردی نہ لگے۔ ماں کا خیال آتے ہی میری آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ میرے بارے میں وہ کتنی فکر مند ہو گی! اسے ہمیشہ اپنے بچوں کی فکر رہتی تھی۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر وہ ہر بچے کے پاس جاتی اور اسے کمبل یا چادر ٹھیک طرح سے اوڑھانے کے بعد واپس اپنے بستر پر آ لیٹتی۔

ہم ویت نام کے ساحل سے کافی دور آ چکے تھے۔ کھلے سمندر میں سفر کرنے کا میرا یہ پہلا تجربہ تھا۔ ”ہم تھائی لینڈ جائیں گے۔“ ہانا نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ وہ یہ اطلاع عملے کے کسی فرد سے لے کر آیا تھا۔ اب کافی لوگ

عرشے پر آ چکے تھے۔ بچوں پر خواب آور دوائی کے اثرات ختم ہو رہے تھے۔ اب وہ خوراک اور پانی کے لیے رو رہے تھے۔ مائیں انہیں چپ کروانے میں مصروف تھیں۔ سورج خاصی بلندی پر آ گیا تھا۔ دھوپ کی حدت ناقابل برداشت ہونے لگی مگر تاریک تہ خانے کی نسبت عرشے پر ٹھہرنا بہتر تھا۔ کئی آدمیوں نے اپنی قمیصیں اتار کر ریلنگ سے باندھ دیں تاکہ قریب لیٹے بچے پر دھوپ نہ پڑ سکے۔

دوپہر کے وقت کشتی والوں نے ہر ایک کو دو مٹھی چاول اور چند گھونٹ پانی کے دیے۔ ہمیں راستے میں ملنے والی خوراک کی مقدار کا اندازہ ہو گیا۔ کئی لوگوں نے اپنے حصے کے چاول بھی بچوں کو کھلا دیے۔ سورج سر پر آ چکا تھا۔ دھوپ سے بچنے کے لیے کئی لوگ تہ خانے میں اتر گئے تھے جو اب عرشے کی نسبت کافی ٹھنڈا تھا۔ میرا دل بھی سائے میں جانے کو چاہ رہا تھا مگر ہانا عرشے پر رہنے پر بضد تھا۔ سہ پہر کے وقت سمندر کے تیور بدل گئے اور لہروں کی بلندی بڑھنے لگی۔

کشتی ایک لہر سے اترتی تو دوسری لہر اسے اٹھا لیتی۔ بیشتر لوگ خوفزدہ ہو گئے مگر ملاح پرسکون تھے۔ ان کے لیے شاید یہ معمول کی بات تھی۔ طوفانی لہریں جب کشتی کو اٹھاتیں تو کلیجہ منہ کو آتا۔ اکثر مسافروں کو سمندری سفر کا کوئی تجربہ نہ تھا، وہ بار بار قے کر رہے تھے۔ کشتی کے ایک کونے میں پردے کے پیچھے رفع حاجت کرنے ایک کموڈ رکھا گیا تھا۔ اس کو استعمال کرنے والوں کی قطار لگ گئی۔

تقریباً دو گھنٹے بعد سمندر پرسکون ہوا تو ہم لوگوں کی جان میں جان آئی۔ شام کو پھر دو مٹھی چاول اور چند گھونٹ پانی کے ملے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھ کر ہمیں اندازہ ہوا کہ کشتی کا رخ جنوب مغرب کی طرف ہے۔ اب سب کو یقین ہو گیا تھا کہ ہم تھائی لینڈ ہی جا رہے ہیں۔ ڈوبتے سورج کی ملگجی روشنی میں ہمیں دائیں ہاتھ دور افق پر چند پہاڑ نظر آئے۔ ملاح سے پوچھنے پر پتا چلا کہ وہ ویت نام کے ساحلی قصبے ”دات موئی“ کے پہاڑ تھے۔ گویا ابھی ہم ویت نام کی سمندری حدود سے نہیں نکلے تھے۔ دراصل ہماری کشتی کھلے سمندر میں جانے کی بجائے ساحل کو دائیں ہاتھ رکھتے ہوئے خاص فاصلے پر رواں دواں تھی۔

اگر ہمیں تھائی لینڈ کی خلیج تک پہنچنا تھا تو کم از کم ۴۰۰ میل کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ میرا دل چاہ کہ کچھ دیر تہ خانے میں جا کر سو جاؤں مگر وہاں بچوں کی قے اور پیشاب کی بو اس قدر زیادہ تھی کہ چند منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہر سکا اور دوبارہ عرشے پر آ کر لیٹ گیا۔ سمندر کی ٹھنڈی ہوا نے جلد ہی مجھے نیند کی وادی میں دھکیل دیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو کشتی سمندر میں رکی ہوئی تھی۔ ہانا میرے قریب ہی عرشے پر بے خبر سو رہا تھا۔ ملاحوں کی بھاگ دوڑ سے اندازہ ہوا کہ کشتی کے انجن میں کوئی خرابی ہو گئی تھی۔ انجن کو بار بار سٹارٹ کرنے کی کوشش کی گئی مگر ہر دفعہ چند لمحے غرانے کے بعد بند ہو جاتا۔ خدا خدا کر کے سحری کے وقت انجن کا نقص دور ہوا۔ ہمیں کشتی پر سوار ہوئے چوبیس گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ اس دوران ہم نے چند لقمے چاول اور دو کپ پانی پیا۔ دوسرا دن نکل آیا۔ کشتی میں صفائی کی حالت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ ہر طرف پھیلی قے اور پیشاب کی بو سے کئی لوگ بیمار ہو چکے تھے۔ باقی آدھے خوراک کی کمی اور پیاس کی وجہ سے نقاہت کا شکار تھے۔

دوپہر کے وقت کشتی پر دھوپ سے بچاؤ کا کوئی بندوبست نہ تھا مگر سب لوگ بہتر اور محفوظ مستقبل کی خاطر تمام تکلیفیں خاموشی سے جھیل رہے تھے۔ کشتی کے عملے کا کہنا تھا کہ ہم ویت نام کی حدود سے باہر آ چکے اور کمبوڈیا کے ساحل کے متوازی سفر کر رہے تھے۔ کمبوڈیا کی کمیونسٹ حکومت اور ویت کانگ گوریلوں کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ کسی بھی کمبوڈین ساحلی بستی میں پہنچ کر ہم دوبارہ گرفتار ہو سکتے تھے۔

☆☆

سمندر میں سفر کرتے ہمیں تیسرا دن تھا۔ آج آسمان پر بادلوں کی ٹکڑیاں تیر رہی تھیں اس لیے دھوپ کی شدت نسبتاً کم تھی۔ ملاحوں کا اندازہ تھا کہ چوبیس گھنٹے بعد ہم تھائی لینڈ کی سمندری حدود میں داخل ہو جائیں گے۔ فی الحال زمین کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ کشتی پر اسہال میں مبتلا ایک چار سالہ بچے نے دم توڑ دیا تھا جس کی لاش کپڑے میں لپیٹ کر سمندر کے حوالے کر دی گئی تھی۔ بچے کی موت نے کشتی کے ماحول کو مزید سوگوار کر دیا۔ جب سے بچے نے دم توڑا تھا اس کی ماں متواتر روئے جا رہی تھی۔ اس کا جواں سالہ شوہر اسے چپ کروانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

دن کے ڈھائی بجے تھے جب ہمیں سمندر میں دور ایک کشتی نظر آئی۔ ملاحوں کا خیال تھا کہ یہ تھائی لینڈ کے ماہی گیروں کی کشتی تھی۔ تمام لوگوں کے چہرے خوشی سے دمک اٹھے۔ ہمارے ملاحوں نے اپنی کشتی کی رفتار احتیاطاً کم کر دی۔ دونوں کشتیوں کا فاصلہ تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ مطلب یہ کہ دوسری کشتی تیز رفتاری سے ہماری طرف آ رہی تھی۔ تمام لوگوں کی نگاہیں آنے والی کشتی پر جمی ہوئی تھیں۔

وہ جب قریب پہنچی تو سب لوگ یہ دیکھ کر دم بخود رہ گئے کہ اس پر سرخ ستارے والا ویت کانگ کا مخصوص مونوگرام بنا ہوا تھا۔ عرشے پر چار ویت کانگ گوریلے ہماری طرف سٹین گنیں تانے کھڑے تھے۔ آخر وہی ہوا جس سے ہم گذشتہ تین دنوں سے خوفزدہ تھے۔ دوسری کشتی لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھی۔ اس سے میگافون پر بار بار یہ اعلان ہونے لگا ”کشتی روک دو اور ہتھیار پھینک دو۔ تم اب ویت کانگ کی قید میں ہو۔“

ہماری کشتی پر چند عورتیں اونچی آواز میں رونے لگیں۔ ماؤں کو روتا دیکھ کر ان کے بچے بھی رونے لگے۔ ہماری کشتی تقریباً رک چکی تھی۔ کشتی چلانے والے عملے نے کشتی روک کر ہاتھ ہوا میں بلند کر دیے تھے۔ میں اور ہانا ریلنگ کے قریب ہی کھڑے تھے۔

ہانا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے سمندر میں کود جانے کا اشارہ کیا مگر میں نے اسے سختی سے منع کر دیا۔ ساحل سے اس قدر دور بغیر کسی سہارے کے کھلے سمندر میں کودنا سراسر موت کو دعوت دینا تھا۔ پھر اب ہم گوریلوں کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی سٹین گنوں کی رینج میں تھے۔ سٹین گن کا ایک برسٹ بھی ہم دونوں کو لاشوں میں بدلنے کے لیے کافی تھا۔

گوریلوں کی کشتی ہماری والی کے ساتھ آن لگی۔ عرشے پر کھڑے چاروں مسلح گوریلے آن واحد میں ہماری کشتی میں پھلانگ آئے۔ ان میں سے دو نے اپنی سٹین گنیں سہمے مسافروں پر تان لیں اور دو بھاگتے ہوئے انجن والے کیبن میں جا گھسے۔ جاتے ہی انہوں نے ہمارے دونوں ملاحوں کو جو اس وقت کیبن میں موجود تھے، گھونسوں اور لاتوں پر رکھ لیا۔ پھر ان کے ہاتھ پشت پر باندھ کر انہیں اوندھا لٹا دیا۔ عملے کے باقی دو ارکان جو کیبن کے پہلو میں فرش پر سو رہے تھے، اٹھ بیٹھے اور کیبن میں اپنے ساتھیوں کا حشر دیکھ کر سراسیمہ ہو گئے۔ کیبن کے اندر سے فارغ ہو کر گوریلوں نے باہر والوں کا بھی وہی حشر کیا۔ ایک گوریلا تہ خانے کا تختہ ہٹا کر اندر موجود چند مسافروں کو نہایت کرخت آواز میں عرشے پر آنے کا حکم دینے لگا۔

چند مرد اور عورتیں جو گرمی سے بچنے کے لیے تہ خانے میں لیٹے ہوئے تھے، ہاتھ فضا میں بلند کیے عرشے پر نکل آئے۔ انہیں باقی مسافروں کے ہجوم میں شامل کر دیا گیا۔ گوریلوں کو یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ ہم کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ ہماری بے بسی کی داستان ہمارے چہروں پر لکھی ہوئی تھی۔ ہماری بدقسمتی کا باعث بننے والی ویت کانگ گوریلوں کی یہ کشتی کمبوڈیا کی کسی بندرگاہ سے واپس ویت نام جا رہی تھی کہ راستے میں اس کی مڈبھیڑ ہمارے قافلے سے ہو گئی۔ اس پر صرف پانچ سپاہی

سوار تھے۔ ایک کشتی کے وہیل پر کھڑا رہا اور چار ہماری کشتی پر کود آئے تھے۔ ہمیں عددی برتری تو حاصل تھی مگر انہوں نے جدید بندوقیں پکڑی ہوئی تھیں جو ایک منٹ میں سو گولیاں نکال سکتی تھیں۔

طے یہ ہوا کہ ہماری کشتی دوسری کے ساتھ باندھی جائے گی۔ ہمیں واپس سائیگون لے جا کر سنٹرل کمانڈر کے حوالے کر دیا جائے گا۔

ہم آناً فاناً دشمن کے نرغے میں آ گئے تھے۔ بشمول ہمارے ناخداؤں کے کسی کو سوچنے یا فرار ہونے کا موقع ہی نہ ملا۔ چند منٹ پہلے جو لوگ اپنے حسین اور محفوظ مستقبل کے بارے میں سوچ رہے تھے، اب وہ آنے والے لمحوں سے خوفزدہ تھے۔ ویت نام کے بیگار کیمپوں میں جو کچھ ہوتا تھا، وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ بعض اوقات ویت کانگ کے سپاہی بربریت میں نازیوں کو پیچھے چھوڑ جاتے تھے۔ ان کیمپوں میں عورتوں کی بے عزتی، بچوں سے بدفعل اور نوجوانوں کو گولیوں سے اڑا دینا روز کا معمول تھا۔ جو مختصر سی خوراک جاتے ہوئے ملی تھی، واپسی میں وہ بھی میسر نہ رہی۔ گوریلوں نے خوراک اور پانی کے کنستر اپنی کشتی میں منتقل کر لیے۔ ہماری کشتی میں بچے بھوک اور پیاس سے بلبلا رہے تھے مگر پتھر دل محافظوں کا دل نہ پسیجا۔

پیاس سے ہلکان ہوتے ایک بچے کے والد نے سٹین گن تانے سپاہی سے پانی مانگنے کی کوشش کی مگر اس نے اس کی کنپٹی پر سٹین گن رکھ کر اسے اپنی جگہ واپس بٹھا دیا۔ اس کے بعد مسافروں میں سے کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ خوراک یا پانی کا لفظ بھی زبان پر لا سکے۔ البتہ اس واقعے کے تھوڑی دیر بعد کشتی میں موجود ہر بچے کو تھوڑے سے چاول اور دو چمچ پانی دے دیا گیا۔ جبکہ بڑے لوگوں کو صرف دو گھونٹ پانی ہی مل سکا۔ دن کی سفیدی رات کے اندھیرے میں بدل گئی۔ آگے پیچھے چلتی ہوئی کشتیاں ویت نام کی طرف بھاگی چلی جا رہی تھیں۔ کشتی میں موجود ہر شخص آنے والے لمحوں کے خوف سے وسوسوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

میں اور ہانا ریلنگ سے ٹیک لگائے عرشے پر بیٹھے تھے۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ میری جیب میں چند ایسے کاغذات ہیں جو میرے لیے مصیبت کا باعث بن سکتے تھے۔ ان میں سے سب سے خطرناک وہ سرٹیفکیٹ تھا جو مجھے سائیگان کی میونسپلٹی کے میئر نے دیا تھا۔ اس سرٹیفکیٹ میں یہ درج تھا کہ میں ایک محبِ وطن شہری ہوں جو ہمیشہ جنوبی ویت نام کا وفادار رہا ہے اور کیمونزم کی مخالفت کی ہے۔ آج سے دو برس قبل میں نے یہ سرٹیفکیٹ اس لیے لیا تھا کہ کامیاب فرار کی صورت یہ تحریر میرے کام آئے مگر کیمونسٹوں کے لیے مجھے فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کرنے کو کافی تھا۔

میں نے آہستگی سے اندر کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کاغذات والا لفافہ باہر نکال لیا۔ اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے کاغذات میں سے اپنا پاسپورٹ علیحدہ کر کے دوبارہ جیب میں رکھا اور لفافہ باقی کاغذات سمیت سمندر کی جانب اچھال دیا۔ شومئی قسمت عین اسی لمحے سمندر سے اٹھتی ایک لہر کشتی کی جانب آئی۔ میرا پھینکا ہوا لفافہ کشتی کے عین کنارے لہر سے ٹکرایا اور واپس کشتی میں آن گرا۔ خیریت یہ رہی کہ میرے علاوہ کسی نے بھی اس واقعے کا نوٹس نہیں لیا۔ حتیٰ کہ میرے قریب بیٹھا ہانا بھی اپنے خیالوں میں گم تھا۔

میرے لیے اب صورتِ حال پہلے سے زیادہ خطرناک ہو گئی۔ پہلے تو صرف تلاشی کی صورت میں ہی ان کاغذات کے پکڑے جانے کا احتمال تھا، اب لفافے کی صورت میں میری بربادی کا سامان عرشے اور کشتی کے کنارے کے درمیانی فرش پر پڑا تھا۔ اُسے کسی وقت کوئی بھی شخص اٹھا کر سٹین گن والے محافظ کو اٹھا کر دے سکتا تھا۔ ریلنگ کے قریب ٹہلتے محافظ کی نظر بھی اس لفافے پر پڑ سکتی تھی۔

خوش قسمتی سے عارضی بیت الخلا کو جاتے ہوئے اسی تنگ

راستے سے گزرنا پڑتا تھا جہاں میرے کا غذات والا لفافہ گرا پڑا تھا۔ میں نے اوسان بحال رکھے اور حفاظت پر کھڑے سپاہی سے رفع حاجت کی اجازت طلب کی جو اس نے سر کے خفیف سے اشارے سے دے دی۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ عرشے سے اتر کر اس مقام تک پہنچا۔ گندے اور گیلے چوبی فرش پر مجھے شفاف پلاسٹک کا لفافہ اور اس کے اندر تہ کیے ہوئے سفید کاغذات دور سے نظر آ گئے۔

عین اسی جگہ عرشے کے اوپر سٹین گن تھامے محافظ کھڑا تھا مگر اب میری طرف اس کی پشت تھی۔ میں نے نہایت سرعت کے ساتھ جھک کر لفافہ اٹھایا اور سیدھا ہوتے ہوئے اسے دوبارہ سمندر میں پھینک دیا۔ اس عمل کو بمشکل ایک سیکنڈ لگا ہو گا۔ بیت الخلا سے واپس آ کر میں ہانا کے قریب لیٹ گیا ۔ میرے ذہن سے بہت بڑا بوجھ ہٹ چکا تھا۔ جلد ہی ٹھنڈی ہوا کی تھپکیوں نے مجھے سونے پر مجبور کر دیا۔ میں مستقبل کے اندیشوں کو بھول کر نیند کی وادی میں اتر گیا۔ رات کے نجانے کس پہر میری آنکھ کھل گئی۔ کشتی کو متواتر جھٹکے لگ رہے تھے۔ غالباً انجن میں پھر کوئی نقص واقع ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد انجن مکمل رک گیا۔ اگلی کشتی بھی روک لی گئی۔ ہماری کشتی کے عملے اور ویت کانگ گوریلوں کی مشترکہ کوششوں کے باوجود انجن کا نقص دور نہ ہو سکا۔

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ گوریلوں کی کشتی ہماری والی کو گھسیٹ کر منزل مقصود پر پہنچاتی۔ کشتیاں ایک دفعہ پھر چل پڑیں مگر اب ان کی رفتار بے حد کم تھی۔ ہماری کشتی اور اس میں موجود ایک سو تیس افراد کو گھسیٹنا آسان کام نہیں تھا۔ ہماری کشتی کے دونوں محافظ اب انجن روم کے قریب بیٹھے گپیں لگا رہے تھے۔ بھوک اور پیاس سے نڈھال آدھے سے زیادہ مسافر سو رہے تھے۔ بیگار کیمپوں اور فائرنگ اسکواڈ سے لرزاں کچھ جاگتے ہوئے لوگ بدھ کی تعلیمات کا ورد کر رہے تھے۔

حالات موافق دیکھتے ہوئے میرے اندر فرار کا جذبہ پھر بیدار ہو گیا۔ مجھے تیل کے اس مضبوط خالی کنستر کا خیال آیا جو بیت الخلا کے قریب پڑا ہوا تھا۔ فوراً ہی فرار کا منصوبہ میرے ذہن میں ترتیب پانے لگا۔ میرے اندازے کے مطابق کشتیاں ویت نامی ساحل سے پانچ چھ میل دور سمندر میں میکانگ ڈیلٹا کی طرف دوڑ رہی تھیں۔ اگر میں کشتی سے کود جاتا تو پلاسٹک کے اس کنستر کے سہارے بہ آسانی ساحل تک پہنچ سکتا تھا۔ بصورت دیگر میرا مقدر بیگار کیمپ یا فائرنگ اسکواڈ تھا۔

اس منصوبے میں کنستر کے علاوہ پانچ چھ گز ڈوری کی ضرورت تھی۔ اتفاق سے عرشے پر جہاں میں لیٹا ہوا تھا' چند فٹ کے فاصلے پر ریلنگ کے ساتھ مجھے پلاسٹک کی ڈوری کا گچھا لٹکتا ہوا نظر آ گیا۔ ڈوری کے ایسے گچھے مچھلی پکڑنے والی کشتیوں اور جہازوں پر جا بجا لٹکے اکثر نظر آتے ہیں۔ میں خاموشی سے ڈوری کی جانب سرکنے لگا۔ ہانا ہر بات سے بے خبر سو رہا تھا اور میں نے اسے اپنے ارادوں سے باخبر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ میں خاموشی سے سرکتا رسی کے قریب جا پہنچا۔ بصد مشکل اسے ریلنگ سے کھولا اور عرشے اور کشتی کے درمیانی خلا میں پھینک دیا۔ اب میں اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے تیار تھا۔

میں اٹھا اور ایک دفعہ پھر پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گپیں لگاتے محافظ سے بیت الخلا جانے کی اجازت چاہی۔ اس نے اپنا ہاتھ جھٹکتے ہوئے مجھے اجازت دی اور دوبارہ دوسرے سپاہی سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ میں عرشے کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں ڈوری گرائی تھی۔ ادھر ادھر دیکھے بغیر میں نے ڈوری کا گچھا اٹھایا اور کشتی کے کونے میں پڑے پلاسٹک والے خالی کنستر تک پہنچا۔ خالی کنستر کا ڈھکن ساتھ ہی لٹک رہا تھا۔ آہستگی سے اسے بند کیا اور کنستر کو رسی سے باندھ کہ سمندر کے حوالے کر دیا۔

اب میری باری تھی۔ کشتی کا کنارہ فرش سے بمشکل چار فٹ اونچا تھا۔ رسی کا سرا تھامے میں بآسانی پہلو کے بل افقی لیٹنے پر لیٹ گیا اور کروٹ بدلتے ہوئے خود کو سمندر میں گرا دیا۔ خالی کنستر مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر تیر رہا تھا۔ رسی کو تھامے کنستر تک پہنچا اور اپنے آپ کو اس کے اوپر گرا لیا۔ کشتیاں دور جا چکی تھیں۔ پچھلی کشتی کے کیبن میں جلتی روشنی آہستہ آہستہ مدھم ہو رہی تھی۔ اب میں آزاد تھا۔ سمندر کا پانی مجھے نیم گرم لگا جس سے میرے بدن کو سکون ملا۔

اپنے آپ کو آزاد پا کر میرا دل خوشی سے سرشار ہو گیا۔ بیگار کیمپ' مشقت اور بلا جواز تشدد کے وسوسے میرے ذہن سے نکل گئے مگر جب میں نے اپنی موجودہ حالت پر غور کیا تو خوشی جلد ہی مایوسی میں بدل گئی۔ نئے خطرات اور وسوسوں نے میرے ذہن کو گھیرے میں لے لیا۔ رات کے وقت میں کھلے سمندر میں ایک پلاسٹک کے کنستر پر پڑا تھا۔ ساحل نہ جانے وہاں سے کتنی دور تھا۔ میں ساحل پر پہنچ بھی سکوں گا یا سمندر ہی میں میری موت واقع ہو جائے گی؟ گہرے سمندر میں تیرتے ہوئے میں کسی وقت بھی شارک کا لقمہ بن سکتا تھا۔ منفی خیالات ذہن سے جھٹکتے ہوئے میں نے مثبت انداز میں سوچنا شروع کیا۔ ساتھ ہی اندازے سے اپنا رخ ساحل کی طرف رکھتے ہوئے کنستر پر لیٹے لیٹے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

چار دن کی بھوک اور پیاس میری توانائی نچوڑ چکی تھی۔ جلد ہی تھکاوٹ مجھ پر غالب آ گئی اور میں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ میں نے رسی اپنے اور کنستر کے اردگرد لپیٹ لی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ غنودگی کے عالم میں کہیں کنستر سے لڑھک ہی نہ جاؤں۔ پلاسٹک کے اس بڑے کنستر کا یہ فائدہ ہوا کہ بغیر کسی تگ و دو کے سمندر کی سطح پر تیر رہا تھا۔ میرا ذہن آہستہ آہستہ غنودگی کی طرف مائل ہو رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو بیدار رکھنے کے لیے اونچی آواز میں ماں باپ' بہن بھائیوں اور رشتے داروں کے نام لینے لگا۔ جب وہ ختم ہو گئے تو سو سے الٹی گنتی گننا شروع کر دی مگر میرا ذہن ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ نقاہت کی وجہ سے میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ غنودگی آہستہ آہستہ میرے ذہن کو لپیٹ میں لے رہی تھی۔

عدو کو پیغام

دین حق تھا اے وطن تیرے حصول کا مقصد
ہم جو بھولیں گے تو اسی خاک میں مل جائیں گے
اس کی حفاظت پہ مامور ہیں راشد و شبیر
بری نیت سے جو آئیں گے اسی خاک میں مل جائیں گے

محمد شعیب پرویز

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میرے بائیں جانب لہروں کا شور اس قدر نہیں جتنا دائیں طرف ہے لاشعوری طور پر میں نے اپنا رخ بائیں جانب موڑ لیا اور رہی سہی طاقت جمع کر کے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے۔ کچھ دیر بعد مجھے واضح طور پر محسوس ہوا کہ میں جس طرف جا رہا تھا' اس طرف سے آنے والی لہروں میں وہ طاقت نہیں جو مجھے پیچھے سے دھکیلنے والی لہروں میں موجود ہے۔ میں کنستر پر پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا مگر اب چھٹی حس کے تحت اُسے بازوؤں کی لپیٹ میں لیتے ہوئے جسم کو سمندر میں لٹکا لیا۔

تھوڑی دیر بعد میرے پاؤں کسی ٹھوس شے سے ٹکرائے۔ میرے حواس یکلخت بیدار ہو گئے۔ میں ساحل پر پہنچ چکا تھا۔ اب میں دونوں پاؤں زمین پر رکھ کر چل سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ میں پانی سے باہر آیا اور ریت پر چلنے لگا۔ یہ کوئی بے آباد ساحل تھا جو رات کے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ میری طاقت آہستہ آہستہ جواب دے رہی تھی مگر میں مطمئن تھا کہ کشتی سے کامیاب فرار کے بعد میں زمین تک پہنچ گیا ہوں۔ آخر میں ایک جگہ گر گیا اور میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

(اس دلچسپ داستان کا اگلا حصہ شمارہ نومبر میں ملاحظہ فرمائیے)

سسلی کا چیف جسٹس

حبیب اشرف صبوحی

سچائی و سادگی کو سربلند کرنے والے عظیم قاضی کی روح پرور داستان

تیونس کی بندرگاہ پر آج لوگوں کا بے پناہ ہجوم ہے۔ یہ لوگ اپنے محبوب اور ہر دلعزیز جسٹس (قاضی) ابوعمر محمد کی ایک جھلک دیکھنے اور انہیں سسلی کے لیے الوداع کہنے جمع ہوئے ہیں۔ ان کی انصاف پسندی، خدا خوفی اور سادہ اسلامی زندگی سے لوگ بے حد متاثر ہیں۔ وہ ان سے دلی محبت رکھتے اور جان چھڑکتے ہیں۔

یہ ۲۷۹ھ کا زمانہ ہے۔ تیونس پر اس وقت بنو اغلب حکمرانی تھی جو خلافتِ عباسیہ کی بالادستی قبول کرتے تھے۔ قاضی ابوعمر کئی سال تیونس میں اپنے منصب پر فائز رہنے کے بعد آج قاضی القضاۃ یعنی چیف جسٹس کی حیثیت سے سسلی روانہ ہو رہے تھے۔ قاضی ابوعمر الوداع کہنے والوں کا جم دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور شکر بجالائے۔ جہاز پر سوار ہو

سے پہلے اُنہوں نے اہل تیونس کا شکریہ ادا کیا کہ وہ دور دراز علاقوں کا سفر طے کر کے انہیں اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت کرنے تشریف لائے۔ پھر اُنہوں نے تمام حاضرین کو گواہ بناتے ہوئے کہا:

''میرے مسلمان بھائیو! تم سب گواہ رہنا کہ اس وقت میرا کل اثاثہ یہ چار چیزیں ہیں:

ایک حبشن کنیز جو اس وقت میرے پاس کھڑی ہے۔

دوسرا میرا کمبل جو کنیز کے پاس ہے۔

تیسرا میرا چوغہ جو میں نے اس وقت بھی پہن رکھا ہے اور

چوتھا یہ تھیلا جس میں میری کتابیں ہیں۔

ان کے علاوہ میرا کوئی اثاثہ نہیں۔ میں یہی چار چیزیں لے کر سسلی جا رہا ہوں۔ ان شاء اللہ جب میں واپس آؤں گا تو آپ دیکھیں گے کہ یہی چار چیزیں میرے ساتھ ہوں گی۔ میں اسلامی احکام کے مطابق ذمہ داری کا یہ منصب سنبھالنے سے پہلے اپنے کل اثاثے کا اعلان کر رہا ہوں۔ آپ سے میری گزارش ہے کہ سب میری سلامتی ایمان کے لیے دعا کریں اور میرے اس بیان پر گواہ بھی رہیں۔ اگر میں سسلی جا کر خدانخواستہ دنیاوی لالچ میں پھنس گیا اور میرے اس اثاثے میں اضافہ ہو گیا تو آپ لوگوں کو پورا حق ہے کہ میرا گریبان پکڑیں اور مجھے سزا دینے کے بعد وہ سب کچھ بیت المال میں جمع کر لیں۔''

اپنے محبوب اور خدا ترس جسٹس کی زبان سے یہ باتیں سن کر حاضرین کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ قاضی القضاۃ ابوعمر محمد بھی ان کی محبت سے متاثر ہوئے اور حاضرین کے حق میں دعائے خیر کے بعد جہاز میں سوار ہو گئے۔

جب سسلی کے ساحل پر جہاز سے اُترے تو وہاں بھی لوگوں کا بے پناہ ہجوم تھا۔ سسلی کے لوگ ان کی نیک نامی اور انصاف پسندی کی دھوم سُن چکے تھے۔ یہاں بھی قاضی ابوعمر محمد نے لوگوں کے سامنے مختصر سا خطاب کیا اور اُن کے سامنے اپنے کل اثاثے کا اعلان فرمایا۔

فارغ ہوتے ہی انہیں ان کی سرکاری رہائش گاہ پر پہنچا دیا گیا۔ رہائش گاہ کیا تھی، ایک محل نما عمارت تھی۔ قاضی صاحب کو ایک ایک کمرے کا معائنہ کروایا گیا جو بیش قیمت قالینوں سے آراستہ و پیراستہ تھا۔ اس کے بعد انہیں ملازمین کی فوج ظفر موج سے ملایا گیا جو ایک لمبی قطار کی صورت میں جمع تھے۔

قاضی ابوعمر نے ان سب پر ایک نظر ڈالی اور پھر اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ جب یہ معائنہ ہو چکا تو اُنہوں نے فیصلہ کن انداز میں فرمایا'' مجھے اپنی رہائش کے لیے کسی بڑی عمارت کی ضرورت نہیں۔ میرے لیے ایک چھوٹا سا مکان کافی ہے۔ مجھے ان ملازمین کی بھی ضرورت نہیں۔ میرا کھانا پکانے کے لیے حبشن کنیز کافی ہے جو تیونس سے میرے ساتھ آئی ہے۔ آخر ایک آدمی کے لیے اتنے سارے خدمت گاروں کا کیا جواز ہے؟

اسلام کے اولین چیف جسٹس تو خود رسول اللہ ﷺ تھے جو انتہائی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ سادگی ایمان کا حصہ ہے۔ ان شاء اللہ میں بھی اپنے آقا حضرت محمد ﷺ کی پیروی کروں گا۔ اسی میں میرے دین و دُنیا کی بھلائی ہے۔

آخر چیف جسٹس ایک چھوٹے سے مکان میں رہائش پذیر ہو گئے۔ سسلی کے لوگوں نے قاضی ابوعمر محمد کی انصاف پروری اور دیانت کی باتیں تو بہت سنی تھیں لیکن اب ان کی سادگی اور خدا پرستی کا مشاہدہ کر کے وہ انگشت بدنداں رہ گئے۔ چیف جسٹس کا منصب سنبھالنے کے بعد عام لوگوں نے جن کی زندگی جرائم پیشہ لوگوں کی سرگرمیوں کے باعث اجیرن ہو کر رہ گئی تھی، اطمینان اور سکھ کا سانس لیا کیونکہ انصاف پر مبنی چیف جسٹس صاحب کے فیصلوں نے تمام بدکردار اور بدقماش لوگوں کی طنابیں کھینچ دیں۔

ایک ماہ کے بعد چیف جسٹس کی خدمت میں تنخواہ پیش کی

گئی تو وہ ڈھیر ساری رقم دیکھ کر حیران رہ گئے۔ یہ مشاہرہ ان کی ذاتی ضروریات سے کہیں زیادہ تھا۔ سوچ بچار کے بعد اُنہوں نے اس میں سے ایک قلیل رقم اپنے پاس رکھی اور باقی یہ کہہ کر واپس کر دی ''ان فالتو پیسوں پر عام مسلمانوں کا حق ہے۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ معاشرے میں کچھ لوگ تو بہت زیادہ غریب اور نادار ہوں اور کچھ لوگ انتہائی امیر اور دولتمند۔ میں سمجھتا ہوں کہ بے محابا امارت اور دولت مندی انسانوں کو بالآخر سرکش بنا دیتی ہے۔''

جب بہت زیادہ اصرار کیا گیا کہ وہ مشاہرہ کے طور پر کچھ زیادہ رقم قبول کر لیں تو اُنہوں نے فرمایا ''دنیاوی آسائشوں اور دلچسپیوں میں پھنس کر اپنے فرائض کی ادائیگی اور اللہ اور اُس کے رسولِ پاک ﷺ کے احکام سے غافل نہیں ہونا چاہتا۔ میں نے جو تنخواہ اپنے لیے تجویز کی ہے، وہ بہت مناسب ہے۔''

چیف جسٹس ابوعمر محمد کئی سال سسلی میں اپنے فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔ وہ دن بھر لوگوں کے مقدمات سنتے۔ اگر فیصلے میں کچھ دقت محسوس کرتے تو رات کو اپنی شب بیداری میں سے وقت نکال کر قرآن و حدیث اور فقہ و قانون کی کتابوں سے ضرور راہنمائی حاصل کرتے۔ وقت اسی طرح گزرتا رہا لیکن پھر یکا یک ان کا دل بعض باتوں اور دنیاوی جھمیلوں سے گھبرا گیا۔ ان کے پاس مجرموں کے لیے بااثر لوگوں کی سفارشیں آنے لگیں۔ سرکاری اہل کار بدکردار لوگوں کی پشت پناہی کرنے لگے۔

شروع شروع میں تو چیف جسٹس نے ان سفارشوں کی پروا نہ کی لیکن ایک وقت آیا کہ یہ لوگ دھمکیوں پر اُتر آئے۔ ان حالات میں چیف جسٹس ابومحمد عمر نے فیصلہ کیا کہ وہ اب استعفا دے کر تیونس واپس چلے جائیں اور پھر اُنہوں نے ایسا ہی کیا۔ سسلی کی بندرگاہ پر جہاز میں بیٹھنے سے قبل اُنہوں نے حاضرین کو اپنا کل اثاثہ دکھایا اور کہا: ''سسلی کے مسلمانو! گواہ رہنا کہ میں وہی چار چیزیں اپنے ساتھ واپس لے کر جا رہا ہوں جو میں تیونس سے ساتھ لایا تھا۔ دیکھ لو میرے پاس ایک جشن کنیز، ایک کمبل، ایک چوغہ اور کتابوں کے تھیلے کے سوا کچھ نہیں۔''

سسلی کے چند جرائم پیشہ اور بدقماش لوگ تو آج چیف جسٹس ابوعمر محمد کے جانے سے بہت خوش تھے کہ اب انہیں کھل کھیلنے کا موقع ملے گا لیکن ان کی رخصتی کے موقع پر عامۃ المسلمین رو رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جس معاشرے میں انصاف کی حکمرانی نہ ہو، وہاں حکمران سے لے کر چپراسی تک ہر سرکاری اہل کار اپنی من مانی کرتا ہے۔ اس عالم میں عوام کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا۔ ایسے معاشرے میں غریب عوام کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ یہی سوچ آج سسلی کے عوام کو رُلا رہی تھی۔

چیف جسٹس نے خود بھی بھیگی آنکھوں سے حاضرین پر ایک نظر ڈالی اور فرمایا:

''میرے مسلمان بھائیو! میں جتنا عرصہ تمہارے درمیان رہا میں نے انصاف کا دامن ہاتھوں سے نہیں چھوڑا۔ اگرچہ یہ بہت مشکل کام تھا لیکن جب مجھ سے میرے منصب سے فروتر کام کا تقاضا کیا گیا تو میرے ضمیر نے مشورہ دیا کہ میں اپنے گھر تیونس واپس چلا جاؤں۔ دوستو! ہر شخص کو مشکل مرحلے میں اپنے ضمیر سے مشورہ کرنا چاہیے..... ضمیر زندہ ہو تو انسان کو غلط مشورہ کبھی نہیں دیتا۔''

حیرانی کی بات.....!

نئی روشنی میں پرانے علوم پڑھائے جا رہے ہیں۔

راؤ محمد شاہد اقبال

گوگل سے جان چھڑائیں

یہ امریکی کمپنی اپنی شیطان صفت حکومت کی خفیہ آلہ کار بن چکی

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ گوگل دنیائے انٹرنیٹ کا بلاشرکتِ غیرے حکمران ہے۔ ہم میں سے ہر شخص گوگل سرچ، جی میل، کروم، گوگل میپس، یوٹیوب اور اینڈرائیڈ میں سے کم از کم کوئی ایک سروس روزانہ کئی بار لازمی استعمال کرتا ہے۔ ہم لاشعوری طور پر اس خیال کے زیرِ اثر انٹرنیٹ استعمال کرتے ہیں کہ گوگل سے زیادہ، سہل، نتیجہ خیز اور جدید خدمات کوئی نہیں فراہم کر سکتا مگر کیا یہ پورا سچ ہے؟ کیا واقعی گوگل سے زیادہ بہتر انداز میں اپنی خدمات انٹرنیٹ پر کوئی کمپنی پیش نہیں کرتی؟

حقیقت ہمارے خیالوں کے بالکل برعکس ہے کیونکہ بہت سی ایسی کمپنیاں موجود ہیں جو نام اور شہرت کے حساب سے بھلے گوگل سے چھوٹی ہوں مگر ان کی فراہم کردہ سروسز کی بعض خصوصیات زیادہ بہتر، جدید، نتیجہ خیز، تیز رفتار، محفوظ ترین اور انتہائی اعلیٰ معیار کی ہیں۔ شاید آپ کو ہماری اس بات پر حیرانی ہو لیکن ذیل میں ان کا تقابلی جائزہ حقائق سامنے لے آئے گا۔

گوگل سرچ اب کیوں فائدہ مند نہیں رہا؟

آپ گوگل سرچ جب بھی استعمال کریں، تو یہ آپ کی خفیہ طور پر بھرپور نگرانی کرتا ہے۔ آپ کی پسند ناپسند سے متعلق تمام تر معلومات جمع کر کے دنیا کی بڑی بڑی اشتہاری کمپنیوں کو فروخت کر دیتا ہے۔ گوگل کا یہ متنازعہ طرزِ عمل ہمیشہ سے دنیا بھر میں کڑی تنقید کا سامنا کرتا رہا ہے۔ یہ ہی نہیں بلکہ حال ہی میں یورپی یونین بھی اپنی کئی برس کی کڑی تحقیقات کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ گوگل سرچ انتہائی

منظم انداز میں یورپی صارفین کی نجی معلومات بیچ کر پیسے کمارہا ہے۔ اس پر یورپین یونین کی طرف سے گوگل پر ۲٫۱ بلین یورو جرمانہ کیا گیا۔ جو پاکستانی روپے میں ۲ کھرب ۹۷ ارب ۶۰ کروڑ روپے بنتا ہے۔ اس کے علاوہ گوگل سرچ اپنے پہلے صفحہ پر دکھائی دینے والی ویب سائیٹس بھی اپنی مرضی اور مالی مفاد کو خاطر رکھ کر پیش کرتا ہے۔

نعم البدل

مائیکروسافٹ بنگ (www.bing.com) بلحاظ مقبولیت تیزی سے ترقی کرتا ہوا سرچ انجن ہے۔ وہ وقت کے ساتھ ساتھ اپنے اعلیٰ معیار کی وجہ سے گوگل سرچ کے نزدیک پہنچ رہا ہے۔ مائیکروسافٹ کے مطابق بنگ سرچ انجن عالمی سطح پر ۹ فیصد شیئر حاصل کر چکا جبکہ انگریزی بولنے والے ملکوں میں یہ شرح اور بھی زیادہ ہے، مثلاً برطانیہ میں ۲۶ فیصد اور امریکا میں ۳۳ فیصد۔ اگر آپ بھی اس سرچ انجن کو آزمانا چاہتے ہیں تو ابھی (www.bingiton.com) اپنے ویب براؤزر پر ٹائپ کریں اور ساتھ ہی گوگل سرچ کو بھی۔ پھر ان دونوں سرچ انجنوں میں چھ سات بار سرچنگ کریں اور نتائج کا تقابل کریں۔

یقیناً آپ حیران ہوئے بغیر نہیں رہیں گے کیونکہ جیت کا سہرا اس بار گوگل سرچ انجن کے بجائے بنگ سرچ انجن کے سر پر ہی سجے گا۔ ایک اور وجہ بھی لوگوں کو تیزی سے بنگ سرچ انجن کی طرف متوجہ کررہی ہے۔ بنگ سرچ کی انتظامیہ نے اعلان کیا ہے کہ وہ اپنے صارفین کو اشتہارات سے ہونے والی کمائی کا مخصوص حصہ بھی دے گی۔ کئی ملکوں میں بنگ سرچ نے اس عمل کا آغاز بھی کردیا ہے۔ یہ دائرہ وہ بہت جلد دنیا بھر میں پھیلانے کا خواہشمند ہے۔ ایک اور اہم وجہ بنگ ہوم پیج کا خوب صورت اور دل موہ لینے والی نت نئی تصویروں سے مزین ہونا بھی ہے جسے وہ روزانہ تبدیل کرتا ہے تاکہ صارف اکتاہٹ کا شکار نہ ہو۔

اگر آپ کی خواہش ہے کہ آپ کی نجی معلومات کوئی استعمال نہ کرے تو پھر گوگل سرچ کے مقابل ایک اور سرچ انجن آپ کا انتخاب بن سکتا ہے۔ اس کا نام ڈک ڈک گو (www.DuckDuckGo.com) ہے۔ اس سرچ انجن کا اپنے صارفین کے ساتھ یہ وعدہ ہے کہ یہ کبھی اُن کی ذاتی معلومات کو جمع نہیں کرتا اور نہ ہی اپنے مشتہرین کو ان کی پسند نہ پسند کے بارے میں کسی قسم کی آگاہی فراہم کرتا ہے۔ اس کی تلاش کا نظام بھی بہت سہل اور تیز رفتار ہے۔ ساتھ ساتھ یہ ۹۴۰۰ سے زائد مختلف کمانڈز بھی فراہم کرتا ہے جس سے آپ روشنی کی رفتار سے اپنی مطلوبہ معلومات تلاش کرسکتے ہیں۔ بس ایک بار آزمائش شرط ہے۔

گوگل سروسز استعمال کرنے کے نقصانات

گوگل ڈاکس (Docs) اور گوگل ڈرائیو آن لائن آفس سوئیٹ اور اسٹوریج استعمال کے حوالے سے بہترین پروگرام گردانے جاتے ہیں، مگر ان کی پرائیویسی پالیسی صارفین کے لیے لمحۂ فکریہ ہے کیونکہ آپ اپنا جو بھی اہم ترین تخلیقی مواد یا فائلیں ان پر محفوظ کرتے یا ان کے ذریعے کسی کو بھیجتے یا پھر وصول کرتے ہیں، ان کے تمام تر استعمال کے مالکانہ حقوق گوگل کمپنی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منتقل ہوجاتے ہیں۔ اس کے بعد یہ گوگل کی مرضی ہے کہ وہ آپ کے اس مواد کی جیسے چاہے تدوین کرے، تشہیر کرے، فروخت کردے یا ختم کرے۔ آپ اس کے خلاف کوئی بھی نقطہ اعتراض نہیں اُٹھا سکتے۔

گوگل کا نعم البدل کیا ہے؟

مائیکروسافٹ ون ڈرائیو (www.onedrive.live.com) ونڈوز ٹین کے ساتھ مفت دستیاب ہے۔ نیز آپ اس کی ویب سائیٹ پر رجسٹر ہوکر بھی ۵ گیگا بائیٹ اسٹوریج مفت میں حاصل کرسکتے ہیں۔ یہ آپ کو آن لائن اپنے مقبول زمانہ پروگرام مائیکروسافٹ آفس، ایکسل، پاور پوائنٹ اور ون نوٹ بھی استعمال کرنے کی سہولت فراہم کرتی ہے۔

زوہو ڈاکس (www.Zoho.eu/docs) مائیکروسافٹ ون ڈرائیو سے ملتا جلتا آن لائن اسٹوریج فراہم کرنے والا ایک اور بہترین پروگرام ہے جو ۵ گیگا بائیٹ تک مفت اسٹوریج کی سہولت مہیا کرتا ہے۔ اسے بھی آپ گوگل ڈاکس یا گوگل ڈرائیو کے متبادل کے طور پر آنکھ بند کرکے استعمال کرسکتے ہیں۔

گوگل جی میل کیوں فائدہ مند نہیں رہا؟

گوگل جی میل بھی آپ کی نجی معلومات اور پسند ناپسند کی تفصیلات جمع کرکے اپنے مشتہرین کو فراہم کرنے کے حوالے سے دنیا بھر میں خاصا بدنام ہے۔ ایک اور وجہ سے بھی یہ فائدے کا سودا نہیں رہا۔ یہ صرف ۱۵ جی بی تک کی ای میل ذخیرہ کرنے کی گنجائش فراہم کرتا ہے۔ اگر آپ کو بہت زیادہ ای میلیں اور وہ بھی بڑی اٹیچمنٹ کے ساتھ وصول ہوتی ہوں تو پھر آپ بہت جلد اس کی طرف سے دی گئی گنجائش استعمال کربیٹھیں گے۔ جی میل کے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر آپ ای میل کے ساتھ اعلیٰ معیار کی تصاویر یا فائلیں اٹیچمنٹ کرکے کسی کو بھیجنا چاہتے ہیں تو یہاں بھی جی میل اپنے ہاتھ ہوا میں بلند کردیتا ہے۔ جی میل ۲۵-ایم بی سے زیادہ کی گنجائش اٹیچمنٹ کے لیے فراہم نہیں کرتا۔ اس وجہ سے آپ کو اپنی تصاویر یا فائلوں کے معیار پر سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔

متبادل کیا ہے؟

جی ایم ایکس (www.gmx.com/mail) گوگل جی میل کا بہترین متبادل ہے۔ یہ آپ کو ای میل محفوظ کرنے کے لیے لامتناہی جگہ مفت فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ آپ کو ای میل کے ساتھ تصاویر یا فائلیں اٹیچمنٹ کے لیے جی میل سے دوگنی گنجائش بھی فراہم کرتا ہے۔ جی ایم ایکس آپ کی ای میل محفوظ ترین بنانے کے لیے ایک انتہائی طاقتور اینٹی وائرس، اسپیم فلٹر، میل ویئر اسکینر بھی رکھتا ہے۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا ویب ہوسٹنگ پرووائڈر بھی ہے جو ۲۰۰۸ء سے مسلسل دنیا بھر کے کروڑوں صارفین کو اپنی خدمات فراہم کررہا ہے، اس لیے آپ اس پر بھروسہ کرسکتے ہیں۔

یوٹیوب استعمال کرنا کیوں بند کریں؟

آج یوٹیوب ویڈیوز کی کائنات کہلاتا ہے جس میں ہر منٹ میں ۵۰۰ گھنٹوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ بدقسمتی سے اس میں کثیر تعداد ایسی ویڈیوز کی ہوتی ہیں جو غیر اخلاقی، تشدد آمیز یا چربہ ہوتی ہیں۔ یوٹیوب انتظامیہ ان غیر معیاری ویڈیوز کو ہٹانے میں انتہائی سست اور غیر ذمہ دار واقع ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے یوٹیوب غیر معیاری ویڈیوز کا قبرستان بنتا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ ویڈیوز دیکھنے کے دوران غیر معیاری اشتہارات دکھانا جنہیں آپ روک بھی نہیں سکتے، ایک اور بڑا مسئلہ ہے۔

متبادل کیا ہے؟

اعلیٰ معیار کے حوالے سے ویمیو (www.vimeo.com) یوٹیوب کے مقابلے کی سروس خیال کی جاتی ہے لیکن اس میں آپ کو یوٹیوب کی طرح غیر معیاری ویڈیوز بالکل نظر نہیں آئیں گی۔ ویمیو پر دستیاب ویڈیوز کا بڑا حصہ ایسی دستاویز پر مشتمل ہے جسے انتہائی اعلیٰ درجہ کے ماہر فلمساز اور ویڈیوگرافر زنے بنایا ہے۔ ویمیو انتظامیہ بھی ویڈیوز کے معیار کے حوالے سے کافی سخت واقع ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے ویمیو کے ساتھ دنیا بھر کی انتہائی سنجیدہ اور قابل کمیونٹی وابستہ ہے۔

اس کے علاوہ ویمیو ویڈیوز کے دوران زبردستی کے اشتہارات بھی نہیں دکھاتا کیونکہ پیسے کمانے کے لیے یہ کمپنی دیگر ذرائع رکھتی ہے۔ آپ ایک بار اس ویب سائیٹ پر ویڈیوز کے معیار کو ملاحظہ فرمائیں، خود مان جائیں گے۔ ویمیو ویڈیوز دیکھنے کی بہترین جگہ ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ یوٹیوب کا استعمال بالکل ترک کردیں مگر ویمیو پر بھی کچھ وقت گزاریں تاکہ ویڈیوز کے معیار کی اہمیت کا درست احساس ہوسکے۔

گوگل میپ کو کیوں ترک کریں؟

گوگل میپ کمپیوٹر ہو یا اسمارٹ فون، اپنی نوعیت کی سب

سے زیادہ استعمال ہونے والی سروس ہے لیکن شاید آپ اس بات سے بے خبر ہوں کہ گوگل میپ آپ کی تمام حرکات وسکنات کو چاہے آپ گاڑی میں ہوں یا بس میں، سائیکل پر ہوں یا پیدل، یہ تمام ڈیٹا اپنے سرور پر محفوظ کرتا رہتا ہے۔ تشویش ناک بات یہ کہ آپ کی یہ ذاتی نوعیت کی معلومات اپنے باقی صارفین کے ساتھ تفصیل کے ساتھ شیئر بھی کرتا ہے جس سے بہت سے لوگوں کو دنیا بھر میں نقصانات بھی ہوئے ہیں۔

متبادل کیا ہے؟

وی گو (www.wego.here.com) گوگل میپ کے مقابلے میں انتہائی قابل بھروسہ سروس ہے جسے آپ اپنے کسی بھی موبائل، اسمارٹ فون پر باآسانی گوگل میپ کے مانند استعمال کر سکتے ہیں۔ وہ بھی اس خوف کے بغیر کہ کوئی آپ کی حرکات وسکنات کی جاسوسی کر رہا ہے۔ اوپن اسٹریٹ میپ (www.OpenStreetMap.org) نامی سروس بھی آپ گوگل میپ کے متبادل کے طور پر جب چاہیں استعمال کر سکتے ہیں۔

گوگل نیوز کو ترک کریں

گوگل نیوز کتنی اکتا دینے والی سروس ہے، آپ کو اس حقیقت کا اندازہ تبھی ہوتا ہے جب آپ کوئی اور ویب نیوز چینل استعمال کریں۔ گوگل انٹرنیٹ پر اتنی زیادہ رنگا رنگ خدمات فراہم کر رہا ہے کہ شاید اُسے یہ یاد ہی نہیں رہا، گوگل نیوز بھی اسی کی پیش کردہ سروس ہے۔ گوگل نیوز انتہائی عامیانہ انداز میں خبریں بغیر کسی درجہ بندی کے پیش کرتا ہے۔

متبادل کیا ہے؟

ویسے یہاں تو یہ جملہ ہونا چاہیے' کون ہے جو گوگل نیوز کا متبادل نہیں کیونکہ آپ بی بی سی، سی این این، دی ٹیلیگراف، ڈیلی میل، دی انڈیپنڈنٹ یا کسی بھی ویب نیوز چینل کی سائیٹ پر چلے جائیں' ہمیں یقین ہے کہ آپ کو گوگل نیوز سے بہرحال زیادہ اچھی، معیاری اور بہتر انداز میں ہی خبریں ملیں گی۔

گوگل کروم ترک کرنا لازمی ہے

گوگل کروم ایک ایسا ویب براؤزر ہے جو آپ کے کمپیوٹر کی زندگی کم کرتا ہے' خاص طور لیپ ٹاپ، ٹیبلٹ، اور اسمارٹ فون کی میموری اور بیٹری کا یہ خاص دشمن ہے۔ اسے بیٹری کا قاتل بھی کہا جاتا ہے۔

متبادل کیا ہے؟

موزیلا فائرفوکس (www.getfirefox.com) ایک بہترین براؤزر ہے۔ یہ آپ کے کمپیوٹر کے لیے انتہائی سود مند ہے۔ یہ استعمال میں سہل ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت دیدہ زیب ماحول کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ اوپیرا (www.opera.com) بھی آپ انتہائی اعتماد کے ساتھ گوگل کروم کی جگہ استعمال کر سکتے ہیں اگر آپ حسن پرست واقع ہوئے ہیں تو پھر ایک بار وائی ولدی (www.vivaldi.com) ضرور استعمال کر کے دیکھیں۔ یقین ہے کہ آپ اس کی خوبصورتی کے گرویدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

ادبی دنیا

پنڈت ہرچند اختر اور عبدالحمید عدم سے سالہا سال بعد ایک مشاعرے میں اکھٹے ہوئے تو اختر صاحب عدم کو پہچان نہ سکے، کیوں کہ عدم صاحب بہت موٹے ہو چکے تھے۔ عدم صاحب یہ جان کر کے کہ اختر صاحب اُنہیں پہچان نہ سکے، اُن سے مخاطب ہو کر بولے، ''پنڈت جی! مجھے پہچانا؟ میں ہوں عدم۔''
پنڈت ہری چند اختر کے منہ سے بے ساختہ نکلا، ''اگر تم عدم ہو تو وجود کیا ہو گا؟''

میرے آباؤاجداد کا تعلق چنگا بنگیال تحصیل گوجر خان، ضلع راولپنڈی سے ہے، جو گوجر خان سے کلر سیّداں جانے والی سڑک پر سات میل کے فاصلے پر واقع اور سترہ ڈھوکوں پر مشتمل ہے۔ اس نواح میں بنگیال قوم کے پانچ گاؤں واقع ہیں۔

میں ۲۲ رنومبر ۱۹۳۴ء کو راولپنڈی میں راجہ عبدالرؤف خان اور ان کی اہلیہ امۃ العزیز بیگم کے ہاں پیدا ہوا۔ دادا جان مولوی محمد فضل خان نے، جو صاحبِ کشوف والہامات

ڈاکٹر منیر الدین احمد

میں ایک قادیانی تھا

ایک سابق احمدی اُن لالچی و مکار راہنماؤں کے پول کھولتے ہیں جنہوں نے مذہب کو ذاتی مفادات پورے کرنے کا وسیلہ بنا لیا اور سادہ لوح پیروکاروں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے رہے

تھے، میرا نام محمد یحییٰ تجویز کیا۔ اس دوران اماں نے اپنے روحانی پیشوا، مرزا بشیر الدین محمود احمد، امام جماعتِ احمدیہ کو قادیان نومولود کا نام تجویز کرنے کے لیے لکھ دیا تھا۔ چنانچہ چند روز بعد قادیان سے خط آیا کہ بچے کا نام منیر الدین احمد رکھا جاتا ہے۔ اسی دن سے مجھے یہ نام دے دیا گیا۔

دادا جان، مولوی محمد فضل خان عربی زبان کے عالم اور اسلامی علوم کے بلند پایہ مصنف تھے۔ آپ نے ''اسرارِ شریعت'' تین جلدوں میں تصنیف کی، جس میں اسلامی تعلیم و عقیدے کو عقل و نقل کی رُو سے ثابت کیا گیا۔ اس کے علاوہ بھی آپ نے درجن بھر کتابیں لکھیں۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ ابن عربی کی کتاب ''فتوحاتِ مکیہ'' کا اردو ترجمہ ہے، جو بدقسمتی سے مکمل نہ ہو سکا۔

میری والدہ امۃ العزیز بیگم اپنے بھائی بہنوں میں پانچویں نمبر پر تھیں۔ نانا جان فضل محمد خان ولد راجہ قائم دین میرے دادا جان محمد فضل خان کے خالہ زاد تھے۔ دونوں کے ماموں، مولوی محمد عمر بخش نقشبندی مجدّدی (متوفی ۱۸۸۷ء) اپنے وقت کے اجلِ عالم تھے۔ ان کے بارے میں دادا جان نے لکھا ہے کہ تصوف پر متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی حیثیت اپنی برادری میں ایک واعظ اور پیر کی تھی۔

دادا جان اپنے خاندان میں سے پہلے شخص تھے، جنہوں نے احمدیت کو قبول کیا۔ آپ کے علم و فضل کا اس زمانے میں شہرہ ہو چکا تھا اور پوٹھوہار کے علاقے میں آپ کو سب لوگ مولوی محمد عمر بخش نقشبندی مجدّدی کا جانشین مانتے تھے۔ اس سبب بہت سے لوگوں نے آپ کی پیروی میں مرزا غلام احمد قادیانی کی بیعت کر لی۔ بالخصوص آپ کے خاندان کے بیشتر افراد دادا جان کی ترغیب پر احمدی ہو گئے، البتہ نانا جان تین چار برسوں تک سخت مخالفت کرتے رہے۔

دادا جان تبلیغ کرنے ان کی حویلی میں آتے تو نانا جان لٹھ اٹھا کر انہیں گھر سے باہر نکال دیتے۔ دادا جان تھوڑی دیر بعد دوسرے دروازے سے آ جاتے اور کہتے ''لالہ میں آپ کو منوا کے رہوں گا۔'' آخر ان کی ہٹ دھرمی رنگ لائی اور نانا جان نے نہ صرف بیعت کر لی بلکہ تھوڑے عرصے کے بعد چنگا سے ہجرت کر کے قادیان میں جا کر آباد ہو گئے۔ مرزا غلام احمد قادیانی اپنے پیروکاروں کو قادیان میں آ کر رہنے کی ترغیب دیتے تھے تاکہ ان کے گمنام قصبے کی آبادی بڑھے اور ان کی موروثی زمینیں زیادہ قیمت پر بک سکیں۔

اس طرح اماں کا بچپن قادیان میں گزرا اور وہیں پر آپ نے مدرسے میں تعلیم پائی۔ مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۂ ثانی نے عورتوں کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ دی تھی، جس کے سبب اماں نہ صرف بے حد راسخ العقیدہ تھیں بلکہ آپ کے اندر قیادت کی صلاحیتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ شادی کے بعد آپ نے کوئٹہ، راولپنڈی اور پشاور میں قیام کے دوران

تعارف مصنف

اُردو کے ممتاز ادیب ڈاکٹر منیر الدین احمد ۱۹۳۴ء میں قادیانی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ تعلیم مکمل کر کے قادیانی مبلغ کی حیثیت سے جرمنی چلے گئے لیکن وہاں قادیانی قیادت کی اصلیت ان پر کھل گئی، چناں چہ وہ جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔ انہوں نے پھر ہمبرگ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی اور طویل عرصہ جرمن اورینٹ انسٹی ٹیوٹ سے بطور محقق وابستہ رہے۔ زیرِ نظر تحریر ان کی آپ بیتی ''ڈھلتے سائے'' سے لی گئی ہے۔ اس تحریر میں ڈاکٹر صاحب نے قادیانی جماعت اور اس کے قائدین کی اخلاقی و مادی کرپشن بیان کی ہے۔ آپ بیتی کے انکشافات چشم کشا اور سبق آموز ہیں۔ یہ آپ بیتی ۲۰۰۷ء میں ادارہ ''قوسین'' نے شائع کی تھی۔

وہاں احمدی عورتوں کی تنظیم، لجنہ اماء اللہ کی شاخیں قائم کیں اور سالہا سال تک ان مقامات پر اس کی صدر رہیں۔ بالخصوص راولپنڈی میں قیام کے دوسرے دور کا میں عینی گواہ ہوں، جب اماں نے اکتوبر ۱۹۴۵ء کو وہاں منتقل ہونے کے چند ہفتوں کے اندر اندر احمدی عورتوں کو پھر سے منظم کیا، نئے سرے سے لجنہ اماء اللہ کی مقامی تنظیم کی بنیاد رکھی اور اگست ۱۹۵۳ء میں اپنی وفات تک اس کی صدر رہیں۔

دادا نے احمدیت چھوڑ دی

دادا جان نے جہاں بعض دوسری اہم کتابیں تصنیف کیں، وہیں انہوں نے جماعتِ احمدیہ کی فقہ کی بنیاد بھی ڈالی۔ چنانچہ ''فتاویٰ احمدیہ'' کے نام سے دو جلدوں میں مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے خلفا کے فتاویٰ جمع کر کے چھاپا۔ بعد ازاں آپ نے علیحدہ علیحدہ جلدوں میں نماز، روزے، زکوٰۃ وغیرہ کے احکام کو یکجا پیش کیا مگر دادا جان نے اپنی زندگی کے اختتامی برسوں میں جماعتِ احمدیہ سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ (اس بارے میں تفصیل کے لیے میری کتاب ''مولوی محمد فضل خان: ایک عالمِ ربانی کی سوانح حیات'' دیکھیں)۔

آپ نے یہ قدم نہ تو بلاوجہ اٹھایا تھا اور نہ ہی اس کے پیچھے ذاتی انا کا کوئی ہاتھ تھا۔ آپ خوب جانتے تھے کہ یہ بات آپ کی زندگی کی کہانی کو المیہ ڈرامے میں بدل کر رکھ دے گی، کیونکہ اس موقع پر کوئی آپ کا ساتھ نہ دے گا۔ آپ خود اپنے عزیزوں سے بھی یہ توقع نہ رکھ سکتے تھے کہ وہ آپ کی خاطر جماعتِ احمدیہ سے قطع تعلق کرنے کو تیار ہوں گے۔ وہ لوگ اس جماعت کے نظام کا حصہ بن چکے تھے۔ ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ ان وجوہ پر غور و فکر کرتے جن کی بنا پر دادا جان خود اپنے سایے پر سے پھلانگنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

اس زمانے میں قادیان کی آبادی دس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اکثریت احمدیوں کی تھی مگر ہندو اور سکھ بھی پرانی آبادی میں رہتے تھے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے خاص دوستوں میں ایک ہندو لالہ ملاوامل بھی شامل تھا، جس کو وہ اپنے بعض الہامات کے پورے ہونے کا گواہ قرار دیتے۔ چونکہ قادیان اور نواح کے پانچ دیہات مرزا صاحب کی فیملی کی ملکیت تھے، اس لیے وہاں صرف ان لوگوں کے پاس مکان بنانے کے لیے زمین فروخت کی جاتی، جو مرزا صاحب کی جماعت میں شامل ہو چکے ہوتے۔ اس وجہ سے غیر احمدی مسلمان وہاں شاذ و نادر ہی پائے جاتے۔ البتہ بعض لوگ ایسے بھی موجود تھے جو شاید احمدیت سے منحرف ہو چکے تھے مگر اس بات کا مجھے تب پوری طرح علم نہ تھا۔

میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ جس زمانے میں ہم قادیان جا کر آباد ہوئے، جماعتِ احمدیہ زبردست بحران کا شکار تھی۔ خلیفۂ ثانی مرزا بشیر الدین محمود احمد پر تھوڑا عرصہ قبل سنگین جنسی الزامات لگائے جا چکے تھے، جن کی بنا پر ان کے ماموں میر محمد اسحاق نے، جو جماعت کے مقتدر علما میں شمار ہوتے تھے، ان کے پیچھے نماز پڑھنی چھوڑ دی۔ ایسے الزامات ان پر پہلے بھی لگ چکے تھے۔ اس زمانے کے احمدی اخبارات کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ جماعت کے اندر بے چینی اور تذبذب پھیلا ہوا تھا۔ قادیان سے باہر رہنے والے احمدیوں کو درست صورتِ حال کا علم نہیں تھا، نہ ہی جماعتی اخبارات میں کھل کر بتایا جاتا کہ ''فتنۂ خلافت'' کے پیچھے کون سے الزامات ہیں، جن کی بنا پر مرزا محمود احمد کی معطلی کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔

قادیان کی زندگی

قادیان کی زندگی کی جو تصویر میری یادداشت پر مرتسم ہے وہ ایک ایسے معاشرے کی ہے جس میں جماعتِ احمدیہ کی ذیلی تنظیمیں اہم کردار ادا کرتی تھیں۔ مردوں کو عمر کے اعتبار سے تین تنظیموں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ سولہ سال کی عمر تک کے بچے ''مجلسِ اطفال الاحمدیہ'' میں شامل تھے۔ سترہ سے چالیس سال کی عمر تک کے جوان ''مجلس خدام الاحمدیہ'' میں منظم تھے۔

اکتالیس سال سے بڑی عمر کے احمدی ''مجلس انصاراللہ'' کے ممبر تھے۔ عورتوں کی تنظیمیں الگ تھیں۔ سولہ سال تک کی بچیاں ''ناصرات الاحمدیہ'' اور اس سے بڑی عمر کی مستورات ''لجنہ اماء اللہ'' میں شامل تھیں۔ مرکزی طور پر ان تنظیموں کے دفاتر قادیان میں تھے البتہ ہر جگہ، جہاں پر جماعتِ احمدیہ قائم تھی، اوپر بیان کردہ ذیلی تنظیمیں پائی جاتی تھیں۔

مقامی طور پر قادیان کے ہر محلّے میں ان تنظیموں کی شاخیں تھیں جن کی اپنی مجلسِ عاملہ ہوتی۔ وہ ایک قائد کے تحت کام کرتی۔ مرکزی طور پر ہر ذیلی تنظیم کا صدر ہوتا۔ مقامی طور پر ہر مجلس دس دس افراد کے احزاب میں تقسیم تھی جو ایک ناظم حزب کے تحت ہوتی۔ ہر حزب کی طرف سے مقامی مساجد میں نمازوں میں شامل ہونے پر حاضری لگتی۔ ہر ماہ مقامی طور پر ایک دن فلاحی کام کے لیے منایا جاتا جس کو ''وقارِ عمل'' کا نام دیا گیا۔ اس روز تمام ممبران مل کر کوئی اجتماعی خدمت مثلاً گلیوں کی صفائی یا سڑکوں کی مرمت انجام دیتے۔

اسی طرح ہر ماہ ایک دن تبلیغِ احمدیت کے لیے وقف تھا۔ تب ممبران کے گروپ گردونواح کے دیہات میں پھیل کر وہاں کی مقامی آبادی میں تبلیغ کیا کرتے۔ قادیان میں ہمارے قیام کے دوران ایک تبلیغی پارٹی پر نواحی گاؤں بھامڑی میں مقامی لوگوں نے لاٹھیوں سے حملہ کیا اور بہت سے احمدی خدام کو زخمی کر دیا۔ احمدی بھی نہتے نہیں تھے، کیونکہ ہر خدام کے لیے لازمی تھا کہ وہ ایک چھ فٹ کی لاٹھی اپنے پاس رکھا کرے۔ ابتدا میں خدام کی اپنی خاص وردی بھی ہوتی تھی، جو فوجی وردی کے مشابہ تھی۔ اس میں ایک طرف نیکر شامل تھی تو دوسری طرف پگڑی۔

احمدیہ جماعت اور جرمن نازی پارٹی

میں جب جرمنی آیا اور یہاں پر میں نے نازی پارٹی کے طور طریقوں کا مطالعہ کیا تو دیکھا کہ جماعتِ احمدیہ کی ذیلی تنظیموں کا بنیادی ڈھانچہ عین مین وہی تھا، جو جرمنی میں ہٹلر کی پارٹی کا تھا۔ میں نے اس بات کا ذکر ڈاکٹر خلیل احمد ناصر سے کیا، جب وہ ایک بار امریکا سے میرے پاس ہمبرگ تشریف لائے تھے۔ وہ طویل عرصے تک جماعتِ احمدیہ کے امریکا میں مبلّغ رہ چکے تھے۔ ''خدام الاحمدیہ'' کے بنیادی رکن اور اس کی پہلی مجلسِ عاملہ کے رکن رہ چکے تھے۔ انہوں نے اس بات کی تصدیق کی اور بتایا کہ یورپ کی فاشسٹ پارٹیوں بالخصوص جرمنی کی نازی پارٹی کا مطالعہ مرزا ناصر احمد نے، جو مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۂ ثانی کے بڑے بیٹے تھے اور جن کو ان کا جانشین بننا تھا، اپنے قیامِ یورپ کے دوران کیا تھا۔

وہ اس زمانے میں آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور اس مقصد کے لیے خاص طور پر جرمنی گئے تھے جہاں کی ایک انڈسٹریل فیملی، کروپ (Krupp) کا لڑکا ان کے ساتھ پڑھتا تھا۔ یہ فیملی نازی حکومت کی دستِ راست تھی۔ وہاں سے مرزا ناصر احمد جو لٹریچر ساتھ لائے اس کا مطالعہ ''خدام الاحمدیہ'' کی مجلسِ عاملہ کے ہر ممبر کے لیے لازمی قرار دیا گیا۔ یہ بات کچھ ایسی عجوبہ نہیں کیونکہ علامہ مشرقی کی ''خاکسار تحریک'' بھی انہی خطوط پر قائم کی گئی تھی۔ علامہ مشرقی نے البتہ یہ دعویٰ کیا تھا کہ اصل خاکسار انہوں نے تیار کیا اور پھر ہٹلر کو جرمنی میں ایک ملاقات کے دوران اپنی اسکیم سے آگاہ کیا جس پر اس نے اپنی تنظیم بنائی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خاکساروں اور نازی پارٹی کے کارکنوں کی قمیصیں ایک جیسی تھیں اور دونوں بیلچہ اٹھا کر مارچ کرتے، جس سے یہ دکھانا منظور تھا کہ وہ خدمتِ خلق کے لیے ہر وقت مستعد ہیں۔ ساتھ ہی اپنے دشمنوں کو یہ دکھانا بھی مقصود تھا کہ وہ بیلچے کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے سے دریغ نہیں کریں گے۔

احمدی راہنماؤں کے اسکینڈل

قادیان کے باسی مرزا محمود احمد کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیوں کی طرح تھے جن کو وہ جس طرح چاہتے نچا سکتے تھے۔ جماعتِ احمدیہ کے آرگن، روزنامہ ''الفضل'' میں پہلے صفحے پر

''حضور ایدہ اللہ بنصرہ العزیز'' کی صحت کے بارے میں خبر چھپتی جس میں اکثر ناسازیِ طبع کا ذکر ہوتا۔ پورے سال کی اخباریں نکال کر دیکھیں تو نوے فیصد یہی تذکرہ ملتا ہے۔ یہ بھی ایک طرح کا کیموفلاج تھا۔ جو شخص دائمی بیمار ہو، اس سے کوئی شخص توقع نہیں رکھ سکتا کہ وہ ویسی جنسی فتوحات کی طاقت رکھتا ہے، جس کے الزامات اس پر لگائے جاتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ موصوف نے سات عورتوں کے ساتھ قانونی طور پر نکاح کیا اور عام طور سے ہمیشہ بیک وقت چار بیویاں رکھتے تھے۔

مرزا بشیر الدین محمود

قادیان میں ہمارے قیام کے دوران امِ طاہر فوت ہوئیں، جو خلیفہ چہارم مرزا طاہر احمد کی والدہ تھیں، تو فوراً مرحومہ کی بھتیجی سے نکاح پڑھوا لیا جو آگے چل کر مہر آپا کے نام سے جانی گئی۔ اس نکاح کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ وہ اپنی پھوپھی کے بچوں کی دیکھ بھال کر سکیں گی، جب کہ وہ پھوپھی کے بیٹے سے دو چار سال ہی بڑی تھیں۔ عام طور سے مرزا محمود احمد کہا کرتے تھے کہ ان عورتوں سے نکاح کرنے کی وجہ دراصل یہ ہے کہ وہ ان کو اپنی نگرانی میں تربیت دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ جماعت کی عورتوں کی تربیتِ کر سکیں۔ پتا نہیں کہ وہ یہ خدمت بجا لائیں یا نہیں انہوں نے مرزا محمود احمد کے ایکس یا بائیس بچوں کو ضرور جنم دیا، جن میں سے چند ایک کے ساتھ آگے چل کر میری دوستی ہوئی۔

مرزا محمود احمد اپنے گھر کے پہلو میں واقع مسجد مبارک میں مغرب کی نماز کے بعد ''مجلسِ عرفان'' لگاتے تھے جس میں قادیان کے مومن شامل ہوتے۔ میں بھی چند ایک بار گھر کے کسی بزرگ کی معیت میں وہاں گیا تھا۔

ایک دفعہ میرا دوست فاروق میرے ساتھ گیا۔ ہم نمازِ مغرب سے بہت پہلے مسجد مبارک میں پہنچ گئے۔ یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ مسجد کی چھت پر مرزا محمود احمد کے صاحبزادے اظہر احمد پتنگ اڑا رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر انہوں نے پتنگ کو اتارنے کی کوشش کی اور جلد بازی کی وجہ سے پتنگ ایک مکان کے چھجے سے اٹک گئی۔ لگتا تھا کہ وہ مکان بھی ان کے خاندان کا تھا، جس کی طرف گھر کے اندر سے راستہ کھلتا تھا۔ وہ ہمیں کھڑا چھوڑ کر ادھر گئے۔ ان کی ڈور مسجد کے فرش پر اور فاروق کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ مرزا اظہر احمد اس دروازے سے اندر گئے، جس میں سے مرزا محمود احمد نماز پڑھانے کے لیے مسجد میں آیا کرتے تھے۔

ان کے آنکھوں سے اوجھل ہونے کی دیر تھی کہ فاروق نے جھپٹ کر ساری ڈور سنبھالی اور دم دبا کر بھاگ نکلا۔ میرے لیے یہ چیز بالکل غیر متوقع تھی اور میرا لوٹی ہوئی ڈور میں سے حصہ لینے کا ارادہ بھی نہ تھا مگر اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ فاروق کے پیچھے پیچھے بھاگتا جاؤں۔ ہم ریتی چھلّے تک پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر دوڑتے چلے گئے۔ جہاں اندرونی شہر کی آبادی ختم ہوتی تھی اور باہر کے محلّے شروع ہوتے تھے، وہاں پر پہنچ کر ہم نے سانس لیا اور میں نے فاروق سے کہا کہ یہ کام سراسر چوری کے مترادف تھا مگر اسے اس بات کی کوئی پروا نہ تھی۔ قادیان میں بچوں کو پتنگ اڑانے کی اجازت نہ تھی، اس لیے میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ مرزا محمود

احمد کا بیٹا مسجد میں کھڑا پتنگ اڑا رہا تھا۔

مسجد نور کے پچھواڑے میں تالاب تھا جہاں باقاعدگی کے ساتھ پیراکی کے مقابلے ہوتے تھے۔ اس تالاب میں لڑکیاں بھی پیراکی سیکھتی تھیں۔ ان کے لیے خاص دن مقرر تھے۔ پھر ایک روز ایک لڑکی تالاب میں ڈوب گئی جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس نے خودکشی کی تھی کیونکہ وہ اچھی خاصی پیراک تھی۔ پتا چلا کہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی کے چھوٹے بیٹے، مرزا شریف احمد کی کنواری بیٹی امۃ الودود تھی۔ افواہ یہ تھی کہ وہ حمل سے تھی۔ دوسروں کا کہنا تھا کہ اس نے خودکشی نہیں کی بلکہ اس کو قتل کیا گیا تھا۔ یہی بات غلام رسول افغان کی بیٹی کے بارے میں مشہور تھی جو اس سے قبل قادیان کے ڈھاب میں ڈوب کر مری تھی۔ اس کے بارے میں سنا تھا کہ وہ خوبصورتی میں اپنی نظیر نہ رکھتی تھی۔

مغربی افریقا کے ایک سابق مبلغ، مولوی عمد الرحیم نیر بھی ہمارے محلّے میں رہتے تھے اور جن کو میں صبح کے وقت چھڑی گھماتے ہوئے سیر کے لیے جاتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ وہ میجک لینٹرن کے ذریعے لیکچر دیا کرتے تھے۔ مرزا محمود احمد ان کی بھیجی ہوئی رپورٹوں کو اپنے خطبوں میں اس دعوے کے ساتھ پیش کرتے تھے کہ مغربی افریقا احمدیت کی گود میں آنے کے لیے بے قرار ہے۔ احمدیت کے پیروکاروں کی اعداد و شمار بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی روایت خود بانیِ سلسلہِ احمدیہ مرزا غلام احمد قادیانی کی پیدا کردہ ہے۔

جھوٹ پر مبنی دعویٰ

انہوں نے اپنی زندگی میں اپنی جماعت کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ لاکھوں تک پہنچ چکی ہے، جب کہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری نے ثابت کیا تھا کہ جماعتِ احمدیہ کے ممبران کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ خلیفہ رابع مرزا طاہر احمد نے بیسویں صدی کی آخری دہائی میں دعویٰ کر دیا کہ وہ پچھتر ملین کو پہنچ چکی اور اس میں ہر سال سو فیصد اضافہ ہو رہا ہے۔ گویا اگلے دو سال میں یہ تعداد ایک سو پچاس ملین ہو جائے گی، جو پاکستان کی مجموعی آبادی سے زیادہ ہے۔ (اب ۲۰۰۷ء میں تو وہ دو سو ملین کا دعویٰ کر رہے ہیں۔) جماعتِ احمدیہ کے

قادیان میں احمدیوں کا اجلاس جاری ہے

سرکردہ لوگوں کو اب تک یہ احساس نہیں ہوا کہ جماعت کے مُہروں کے اعداد و شمار بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی پالیسی احمدیوں کے حق میں اچھی ثابت نہیں ہو رہی، کیونکہ اس وجہ سے پاکستان میں دشمن ان پر غصہ کھاتے اور حملہ کرتے ہیں۔

مرزا محمود احمد نے ۱۹۴۴ء میں اعلان کیا کہ بانیِ سلسلہِ احمدیہ مرزا غلام احمد قادیانی کی پیشگوئی، جو موصوف نے ۲۰ر فروری ۱۸۸۶ء کو ایک اشتہار میں شائع کی تھی اور جس میں ایک مصلح موعود کے آنے کی خبر دی گئی تھی، ان کی ذات میں پوری ہوگئی۔ اس بارے میں وہ ایک عرصے سے قسطوں میں دعوے کرتے آئے تھے، جس کی مخالفت کئی ایک لوگوں کی طرف سے ہوتی رہی تھی۔ دادا جان نے بھی احمدیت سے اپنی علیحدگی کا اعلان کرتے ہوئے اس چیز کا حوالہ دیا تھا۔ مرزا محمود احمد اپنے مصلح موعود ہونے کے بارے میں اعلان کرنے خاص طور پر لاہور سے قادیان آئے تھے، جب کہ ان کی بیوی ام طاہر اپنی آخری جان لیوا بیماری میں مبتلا ایک ہسپتال میں پڑی تھی۔ قادیان کے چھوٹے بڑے سب لوگ اس میں شامل ہوئے۔ میں بھی وہاں پر موجود تھا۔ پھر یہ معمول بن گیا کہ ہر سال ۲۰ر فروری کو عام چھٹی ہوتی اور سب لوگوں کو ''جلسہِ مصلح موعود'' میں شامل ہونا پڑتا۔

قادیان کی زندگی میں جلسوں کا بہت اہم کردار تھا جو آئے دن برپا کیے جاتے۔ اکثر جلسے مسجدوں میں ہوتے۔ یوں بھی قادیان کی زندگی میں مسجدیں مرکزی مقام رکھتی تھیں۔ جملہ احمدی مرد نمازوں میں پابندی سے شریک ہوتے کیونکہ ان کی حاضری لگتی تھی اور نماز باجماعت میں شامل نہ ہونے والوں کو جرمانہ ادا کرنا پڑتا۔ ہمارے محلے کی مسجد نور میں نمازِ فجر کے بعد درسِ قرآن کریم ہوتا جس میں مرزا محمود احمد کی ''تفسیر کبیر'' کا کوئی حصہ پڑھ کر سنایا جاتا۔ عصر کی نماز کے بعد درسِ حدیث ہوتا، جب کہ نمازِ مغرب کے بعد مرزا غلام احمد قادیانی کی تحاریر میں سے کوئی اقتباس پیش کیا جاتا۔

باجماعت نمازوں میں حاضری کے علاوہ مجلس اطفال اللہ، مجلس خدام اللہ اور مجلس انصار اللہ کے الگ الگ جلسے ہوتے۔ یہی حال عورتوں کی تنظیموں ناصرات احمدیہ اور لجنہ اماء اللہ کا تھا۔ ان کے بھی علیحدہ اجلاس ہوتے۔ گویا قادیان کی پوری احمدی آبادی کو مسلسل مصروف رکھا جاتا۔

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں کساد بازاری زوروں پر تھی۔ نوجوانوں کو ملازمتیں نہیں ملتی تھیں۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے احمدی خاندان ہجرت کر کے قادیان آ رہے تھے، جس کے سبب قصبے میں بے روزگاروں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی۔ ملک میں جماعتِ احمدیہ کی مخالفت کا بازار گرم تھا، جس کی راہنمائی مجلسِ احرارِ اسلام کے ہاتھوں میں تھی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ جماعتِ احمدیہ کو غیر اسلامی جماعت قرار دیا جائے۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال کا نام بھی لیا جاتا کیونکہ انہوں نے اس مطالبے کے حق میں بیانات دیے تھے۔

دوسری طرف خود احمدیوں کے اندر بے چینی پائی جاتی تھی۔ مرزا محمود احمد پر جنسی بے راہ روی کے الزامات لگ رہے تھے۔ اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک دس سالہ اسکیم بنائی گئی جس کو ''تحریکِ جدید'' کا نام دیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ احمدیوں کی توجہ کو دوسری طرف مبذول کیا جائے۔ ان سے مطالبہ کیا گیا کہ احمدی نوجوان اپنی زندگی تبلیغِ اسلام کے لیے وقف کریں۔ اس کام پر اٹھنے والے اخراجات پورا کرنے کے لیے جماعت کو چندہ دینا ہوگا، جس کے لیے ضروری ہے کہ احمدی سادہ زندگی اپنائیں اور ہر قسم کی لگژری کو ترک کر دیں۔ چندہ احمدیوں کو اس سے قبل بھی دینا پڑتا تھا، جس کی شرح ماہوار آمدن کا سولہواں حصہ تھا۔

بہشتی مقبرے کی اصلیت

اس کے علاوہ ان کو وصیت کرنے کی تحریک کی جاتی، جس کے تحت ان کو اپنی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد کا کم سے کم دسواں حصہ صدر انجمنِ احمدیہ کے نام ہبہ کرنا اور دس فیصد ماہوار

آمدن کا بطور چندہ ادا کرنا ہوتا تھا۔ صرف ان لوگوں کو جماعتِ احمدیہ کے قبرستان ''بہشتی مقبرے'' میں دفن کیا جاتا البتہ مرزا غلام احمد قادیانی کے خاندان کے لیے استثنیٰ ہے کہ اس کا ہر فرد وصیت کے بغیر بھی وہاں دفن ہو سکتا ہے۔

''بہشتی مقبرہ'' کے حوالے سے بہت سی کہانیاں سننے میں آتی ہیں جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہاں کوئی بہشت نہیں پائی جاتی۔ ''بہشتی مقبرہ'' مرزا غلام احمد کے ایک خاندانی قطعہ زمین میں بنایا گیا جہاں آس پاس آموں کے باغ تھے۔ اس اسکیم کا مقصد صدر انجمنِ احمدیہ کے لیے مستقل جائیداد پیدا کرنا تھا، جس میں کچھ ایسی زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اس اسکیم کا اجراء ۱۹۰۵ء میں ہوا جب مرزا غلام احمد قادیانی نے ایک رسالہ بنامی ''الوصیت'' شائع کیا۔ ۲۰۰۳ء تک اس اسکیم کے تحت تیس ہزار احمدیوں نے اس میں حصہ لیا تھا۔ وصیت نامے باقاعدگی کے ساتھ جماعتِ احمدیہ کے اخباروں میں چھپتے ہیں تاکہ اگر کسی کو ان میں بیان کردہ کوائف پر اعتراض ہو تو وہ اس چیز سے نظارتِ وصیت کو مطلع کرے۔

گزشتہ ایک دو سال کے اندر خلیفہ خامس مرزا مسرور احمد نے دنیا بھر کے احمدیوں کو نظامِ وصیت میں شامل کرنے کی خاص تحریک چلائی ہے، جس کے تحت دور دراز ملکوں کے احمدیوں سے فارم بھروائے جا رہے ہیں اگرچہ ان کو قادیان یا ربوہ کے بہشتی مقبروں میں دفن کیے جانے کا کوئی امکان نہیں۔ شاید ایسے بہشتی مقبرے ان ملکوں میں بھی قائم کیے جا رہے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق ان تیس ہزار موصیوں میں سے کم و بیش نصف نے اپنی وفات سے قبل اپنی وصیت منسوخ کر دی تھی یا کسی اور وجہ سے ان کی وصیت منسوخ کر دی گئی۔

ربوہ کا بہشتی مقبرہ

دادا جان نے اس بارے میں ایک اعلان ہندوستان کے اخباروں میں چھپوا کر مطالبہ کیا تھا کہ اس سلسلے میں ان کی طرف سے ادا کی جانے والی رقوم واپس کی جائیں۔ اس پر صدر انجمن احمدیہ نے کوئی کارروائی نہیں کی، البتہ جب ابا جی کو اپنے مکان کی تعمیر کے سلسلے میں بینک سے قرض لینا پڑا جس پر سود ادا کرنا پڑتا تھا، تو صدر انجمنِ احمدیہ نے ابا جی کی وصیت منسوخ کر دی۔ وجہ یہ بیان کی گئی کہ احمدیوں کو سودی کاروبار کی ممانعت ہے۔ اس کے باوجود مجھے علم ہے کہ احمدی تاجر اور دوسرے لوگ بینکوں میں اپنی رقوم جمع کرواتے اور بینکوں سے قرض لے کر کاروبار کرتے اور مکان تعمیر کرتے ہیں۔ گویا احمدی سود لیتے اور دیتے ہیں۔ اس چیز سے مرزا غلام احمد قادیانی کی نسل مستثنیٰ نہیں۔ اس کے باوجود انہیں بہشتی مقبرے میں دفن کیا جاتا ہے۔

جب مرزا محمود احمد نے احمدیوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی اور اپنے بچوں کی زندگیاں تبلیغِ اسلام کے لیے وقف کریں تو میں انہی دنوں پیدا ہوا تھا۔ اماں نے اپنے جوشِ خلوص میں میری زندگی اس کام کے لیے وقف کر دی، جیسے ان کو یہ حق حاصل تھا کہ بیٹے کی زندگی کے ساتھ جو چاہیں کریں۔ مجھے آگے چل کر اس خلوص کی بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ اگر اماں کو

اسلام کی خدمت کرنے کا جوش تھا تو انہیں اپنی زندگی وقف کرنی چاہیے تھی۔

احمد نگر کے قصے

اواخر اگست ۱۹۵۱ء کی کسی تاریخ کو میں ربوہ جانے کے لیے راولپنڈی سے چلا۔ ربوہ اس زمانے میں ابھی تعمیر کے ابتدائی مراحل میں تھا۔ جماعتِ احمدیہ کے دفاتر اور کارکنوں کے رہائشی کوارٹر، مساجد حتیٰ کہ مرزا بشیر الدین محمود احمد کا ''قصرِ خلافت'' سب کچی اینٹوں سے بنے ہوئے تھے۔ ربوہ کی آبادی چند سو افراد پر مشتمل تھی، جو ایک ڈیڑھ مربع میل کے رقبے میں آباد تھے۔ قادیان سے ہجرت کرنے کے بعد جماعتِ احمدیہ نے پاکستان میں نیا مرکز بنانے کے خیال سے حکومت سے چنیوٹ کے قریب ایک بنجر رقبہ قیمتاً خریدا تھا، جو قابلِ کاشت ہونے کے سبب عرصہِ دراز سے ویران پڑا تھا۔

شمال کی طرف اور درمیانی علاقے میں ٹیلے تھے، جن کا سلسلہ مشرق کی طرف بہنے والے دریائے چناب تک جاتا تھا۔ دس بارہ مربع میل کا یہ علاقہ بے آب و گیاہ تھا۔ زمین شور زدہ تھی، جس میں پانی نہ ہونے کے سبب کچھ نہیں اگتا تھا۔ تاہم امید تھی کہ زیرِ زمین گہرائی میں پانی موجود ہوگا۔ البتہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ٹیوب ویل لگانے سے پانی نکلا تو وہ پینے کے قابل ہوگا یا نہیں۔ میری آمد سے قبل نلکے لگ چکے تھے، جن میں سے نکلنے والا پانی کھارا ہونے کی وجہ سے ناقابلِ استعمال تھا مگر عوام کے لیے یہ پانی پینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ البتہ مرزا بشیر الدین محمود احمد کے خاندان کے لیے پانی ایک قریبی گاؤں احمد نگر سے منگوایا جاتا جو دو اڑھائی میل کے فاصلے پر آباد تھا۔

اسی گاؤں میں جامعہ احمدیہ قائم ہوئی جس کے لیے ہندوؤں کی ایک متروکہ عمارت حاصل کر لی گئی تھی۔ اسی گاؤں میں ایک دوسری زیادہ وسیع عمارت میں، جس میں رہائشی کمروں کے علاوہ اصطبل بھی پایا جاتا تھا، جامعہ احمدیہ کا ہوسٹل بنا ہوا تھا۔ مجھے ابتدائی دنوں میں وہاں پر کمرا نہ مل سکا اس لیے میرا قیام ماموں احمد خان نسیم کے گھر پر ربوہ میں تھا، جہاں اس زمانے میں ماموں کا خاندان دو کمروں میں رہائش پذیر تھا۔

احمد نگر ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، جس کی آبادی جھنگ کے جانگلیوں اور مشرقی پنجاب سے آئے ہوئے احمدی مہاجروں پر مشتمل تھی جن کو ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے مکانات عارضی طور الاٹ ہوئے تھے۔ البتہ اس گاؤں کی متروکہ زرعی اراضی پر مرزا بشیر الدین محمود احمد اور ان کے خاندان نے قبضہ جما لیا تھا۔ موصوف نے اپنی جماعت کے افراد کو یہ ہدایت دے رکھی تھی کہ قادیان میں چھوڑی ہوئی اپنی املاک کے بدلے میں متروکہ جائیداد حاصل کرنے کے لیے کوئی کلیم داخل نہ کریں۔ چناں چہ میرے خالو مولوی غلام نبی مصری، جن کو تقسیمِ ملک کے بعد ہمارے گاؤں چنگا بنگیال کے ایک نواحی گاؤں میں ابا جی کی کوششوں سے متروکہ زمین الاٹ ہوئی تھی، اس کا قبضہ لینے کے لیے تیار نہ ہوئے کیونکہ خلیفہِ ثانی نے فرمایا تھا کہ ہم بہت جلد قادیان واپس لوٹ جائیں گے۔ یوں بھی قادیان کی جائیداد کا بدل انسان کو نہیں مل سکتا۔ چنانچہ خالو جان اس زمین کو اس کے حال پر چھوڑ کر ربوہ جا کر آباد ہو گئے۔

ان کی طرح ہزاروں دوسرے احمدیوں نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارتے ہوئے متروکہ جائیداد حاصل کرنے سے اجتناب کیا۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مرزا بشیر الدین محمود احمد کے خاندان نے پورے قادیان اور پانچ نواحی دیہات اپنی ملکیت بتاتے ہوئے متروکہ جائیداد پنجاب اور سندھ میں حاصل کر لی، جس کے سبب آج اس خاندان کا شمار پاکستان کے بڑے زمینداروں میں ہوتا ہے۔

ربوہ کی باتیں

جامعہ کو ربوہ میں جو عمارت ملی وہ کچی اینٹوں سے بنی ہوئی تھی، جس کے صحن میں گھاس کا ایک تنکا تک نہ اگتا تھا۔ ایک ہینڈ پمپ موجود تھا مگر اس میں سے نکلنے والا پانی بے حد کھارا

تھا، جو اس قابل نہ تھا کہ پیا جا سکے کیونکہ اس میں سے بدبو آتی تھی۔ مجھے تو اس پانی سے نہاتے ہوئے بھی گھن آتی۔ ہوسٹل کے کمپاؤنڈ میں ہر طرف دھول اڑ رہی تھی، حتیٰ کہ کمروں کا فرش تک شورزدہ مٹی سے اٹا پڑا تھا۔ ہمیں اس وقت احمد نگر بہت یاد آیا، جس کے ہرے بھرے کھیتوں میں ہم لوگ گھومتے پھرتے اور رہٹ والے کنوئیں پر جا کر ٹھنڈے اور میٹھے پانی سے نہایا کرتے مگر اب واپسی کے راستے بند تھے۔

امتحان سے صرف ایک ہفتہ قبل خالو جان، مولوی غلام نبی مصری فوت ہو گئے۔ جن کے ساتھ مجھے خاص لگاؤ تھا۔ وہ میرے استاد، ہیرو اور فرشتہ سیرت انسان تھے۔ میں نے اسی روز بیٹھ کر ان پر ایک مضمون لکھا، جو تب روزنامہ ''الفضل'' میں تین قسطوں میں چھپا، جب ہم لائلپور میں مولوی فاضل کے امتحان کے پرچے لکھ رہے تھے۔ پرنسپل جامعہ احمدیہ قاضی محمد نذیر لائل پوری نے اس بات پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا کہ میں نے امتحان کی تیاری کا ہرج کرتے ہوئے وہ طویل و عریض مضمون لکھا۔ انہوں نے کہا مضمون امتحان کے پرچے ختم ہونے کے بعد بھی تو لکھا جا سکتا تھا۔ ان کو خالو جان کی وفات پر میرے دلی صدمے کی گہرائی کا اندازہ نہیں تھا۔

جہاں تک لکھنے لکھانے کا تعلق ہے میں نے اس مشغلے کو سارا وقت جاری رکھا تھا۔ ''راز دان'' کے اداریے میں ربوہ سے بھیجا کرتا تھا، مگر اس بات کا قاضی صاحب کو علم نہ تھا اور نہ ہی وہ جانتے تھے کہ میں کچھ عرصے سے خدام الاحمدیہ کے رسالے ''خالد'' کا نائب مدیر بھی تھا۔ چونکہ مدیر اعلیٰ مولوی دوست محمد شاہد، جن کے سپرد جماعتِ احمدیہ کی تاریخ لکھنے کی ذمے داری تھی، اس کام میں بے حد مصروف تھے اس لیے انہوں نے ''خالد'' کی ادارت کلی طور پر میرے سپرد کر رکھی تھی۔ مندرجات کی ایڈیٹنگ کے علاوہ پروف ریڈنگ بھی میں خود کرتا۔

دل میں گرہ پڑ گئی

میں نے ''خالد'' میں نذیر فاروقی کا ایک مضمون ۱۸۵۷ء کے غدر کے بارے میں چھاپا، جس میں غدر کو جنگِ آزادی قرار دیا گیا تھا۔ یہ مضمون میرداؤد احمد کی نظر سے گزرا، جو اس زمانے میں خدام الاحمدیہ کے صدر تھے۔ وہ فوراً رسالہ اٹھا کر مرزا بشیر احمد، برادرِ خورد مرزا بشیر الدین محمود احمد کی خدمت میں حاضر ہوئے کیونکہ ان کی رائے کو جماعتِ احمدیہ میں بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ دراصل مرزا غلام احمد قادیانی نے ۱۸۵۷ء کے غدر کو ''بغاوت'' کا نام دیا تھا جس میں ان کے والدِ ماجد نے پچاس گھڑسوار انگریز سرکار کی کمک کے لیے دہلی بھیجے تھے۔

میرا خیال تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ہمیں تاریخی معاملات کے بارے میں اپنی رائے بدلنے کا حق حاصل ہے، مگر اس میں یہ قباحت تھی کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے مؤقف کو غلط ماننا پڑتا تھا، جس کے لیے جماعت تیار نہ تھی۔ باہمی مشورے سے ''خالد'' کے مدیر اعلیٰ مولوی دوست محمد شاہد کی جواب طلبی ہوئی۔ پتا چلا کہ مضمون کی اشاعت ان سے مشورہ کیے بغیر نائب مدیر کی ذمے داری پر ہوئی تھی، چنانچہ ایک دوپہر کو چلچلاتی دھوپ میں مولوی دوست محمد شاہد یہ بتانے کے لیے میری قیام گاہ پر تشریف لائے کہ مجھے ''خالد'' کی ادارت سے معزول کر دیا گیا ہے۔ مولوی صاحب کو خطرہ تھا کہ ان پر بھی نزلہ گرے گا، مگر وہ معزولی سے بال بال بچ گئے۔ دوسری طرف میرے دل میں جماعتِ احمدیہ کے عقائد کے بارے میں گرہ پڑ گئی، جو آگے چل کر میری اس سے جدائی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

جماعتِ احمدیہ کی پالیسی ہے کہ جو کوئی سلسلے سے جدا ہو جائے یا اس کو نکال دیا جائے، عام طور سے اس کے سوشل بائیکاٹ کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ تو اس شخص کے ساتھ کسی کو تعلق رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ مجھے آج بھی اس بات پر بے حد شرمندگی محسوس ہوتی ہے کہ میں نے ایک دفعہ ڈاکٹر نذیر احمد ریاض کو راولپنڈی میں اردو بازار کے پوسٹ آفس کے پاس

دیکھا اور بجائے سلام کا جواب دینے کے منہ موڑ کر الٹی سمت چل دیا تھا۔ اس کو کچھ عرصہ قبل ربوہ سے نکال دیا گیا تھا، جس کی وجوہ سے میں ناواقف ہوں۔ جب نظارت امورِ عامہ کی طرف سے اعلان کر دیا جاتا کہ فلاں شخص کو جماعت سے خارج کرنے کے علاوہ اس کا بائیکاٹ کیا جاتا ہے تو فوراً اسی نظارت کا محتسب (عرفِ عام میں تھانیدار) متعلقہ شخص کو چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر ربوہ سے نکل جانے کا نوٹس دے دیتا۔

اگر وہ خود اپنی مرضی سے نقلِ مکانی نہ کرتا تو جماعت کے کارکن (غنڈے؟) اس کے گھر کا سامان مکان سے باہر نکال کر سڑک پر پھینک دیتے۔ اس بات کا تجربہ سیّد داؤد احمد انور کو ہوا تھا، جس کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے خلیفہ ثالث مرزا ناصر احمد کے مرنے پر جانشینی کی دوڑ میں مرزا رفیع احمد کا ساتھ دیا تھا، جو مرزا ناصر احمد کی طرح مرزا بشیر الدین محمود احمد کا بیٹا ہے، مگر ''خاندانِ نبوّت'' (اس نام سے مرزا غلام احمد قادیانی کے خاندان کو جماعتِ احمدیہ میں یاد کیا جاتا ہے) نے مرزا طاہر احمد کو جانشین بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس لیے سیّد داؤد احمد انور جیسے سرفروشوں کو جماعت سے نکال دیا گیا۔ اس کو راتوں رات ربوہ سے نکل جانے کا حکم دیا گیا جس پر سختی سے عمل درآمد ہوا تھا۔

مگر بعض صورتوں میں جماعت کو وجوہ کی بنا پر اپنے طریقِ عمل میں تبدیلی بھی کرنی پڑتی۔ اس کی مثال ذیل کا واقعہ ہے۔ مشہور سیاست داں، چودھری ظفر اللہ خان کے بھائی چودھری عبداللہ خان کے بیٹے محمد نصر اللہ کا رشتہ ''خاندانِ نبوّت'' کی ایک لڑکی سے طے پایا۔ مرزا بشیر الدین محمود احمد نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ جماعت کے دو سرکردہ خاندان اس رشتے کے سبب زیادہ قریب آ جائیں گے۔ رخصتی والے روز جب مرزا فیملی کے سب لوگ ربوہ میں جمع تھے اور براتی چودھری ظفر اللہ خان سمیت آ گئے تھے، تب پتا چلا کہ دولہا غائب ہے۔ وہ لاہور میں ہی رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے اہلِ خانہ سے کہا تھا کہ وہ چلے جائیں، وہ ایک دوست کو ساتھ لے کر ان کے پیچھے آ رہا ہے مگر ربوہ جانے کی بجائے وہ کسی دوسری طرف نکل گیا۔

وہ اس رشتے کے خلاف تھا، مگر ماں باپ کے سامنے اس بات کا اظہار نہیں کر پایا۔ محمد نصر اللہ نے ''خاندانِ نبوّت'' کی لڑکی کو جس طرح ٹھکرایا تھا، اس کی بنا پر باپ نے اسے عاق کر دینے کی دھمکی دے دی۔ سننے میں آیا تھا کہ پھر اس کا اپنے خاندان کے ساتھ کوئی معاشرتی رابطہ نہیں رہا مگر بحیثیتِ مجموعی چودھری ظفر اللہ خان کا خاندان جماعتی انتقام سے صاف بچ گیا۔ دولہا کا بھائی حمید نصر اللہ اس کے بعد برسوں تک جماعتِ احمدیہ لاہور کا امیر رہا۔ اگر ان کی جگہ یہ معاملہ کسی دوسرے خاندان کے ساتھ پیش آیا ہوتا تو اس کو جماعتِ احمدیہ کے روایتی بائیکاٹ اور اخراج کا سامنا کرنا پڑتا۔

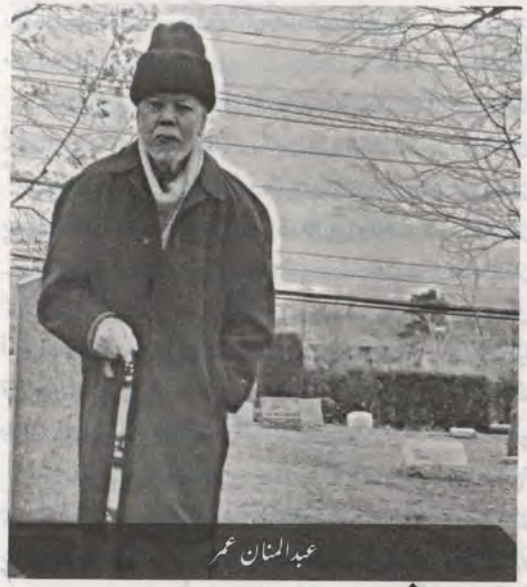

عبدالمنان عمر

''قصرِ خلافت'' میں بھونچال

جامعۃ المبشرین میں ہماری پڑھائی شروع ہوئے ابھی چار ہفتے بھی نہ ہوئے تھے کہ سلسلہ عالیہ احمدیہ کی عمارت میں بھونچال آ گیا۔ مرزا بشیر الدین محمود احمد نے انکشاف کیا کہ خلیفہ اوّل، حکیم مولوی نور الدین کے بیٹے عبدالمنان عمر نے نوجوانوں کا ایک گروپ بنا رکھا ہے، جو اس کو خلیفہ بنانے کے لیے ساز باز کر رہا ہے۔ عبدالمنان عمر اس وقت امریکا گئے ہوئے تھے۔ وہ وہاں سے فی الفور واپس لوٹے اور آتے ہی سیدھے ''قصرِ خلافت'' پہنچے۔ ان کا خیال تھا کہ کسی غلط فہمی کے باعث ان پر یہ الزام لگایا گیا ہے، جس کو دور کیا جا سکتا ہے۔ مگر ''قصرِ خلافت'' کے دروازے ان پر بند رہے اور صدر انجمنِ احمدیہ کا کوئی ذمے دار کارکن ان کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھا۔ جماعتِ احمدیہ کے اخباروں میں خلافت کے حق میں مضامین کا سلسلہ شروع ہو گیا، جو یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ خلیفہ خدا تعالیٰ خود بناتا ہے، جو کوئی اس منزلت کو دھاندلی سے حاصل کرنے کی خواہش رکھتا ہے، اس کو ہمیشہ منہ کی کھانی پڑتی ہے۔

عبدالمنان عمر ایم اے (عربی) اور جامعہ احمدیہ کے ٹیچنگ اسٹاف میں تھے۔ ان کا خاص مضمون حدیث تھا۔ احمد نگر کے زمانے میں مجھے یاد ہے کہ وہ شاید مہینا بھر ہمیں پڑھانے آئے تھے۔ پھر چودھری ظفر اللہ خان کی وساطت سے ان کو امریکا کی ہارورڈ یونیورسٹی میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں شمولیت کی دعوت ملی جس کا کرتا دھرتا پروفیسر رچرڈ فرائی تھا، جسے برسوں بعد ہمبرگ یونیورسٹی میں میرا ساتھی بننا تھا۔ عبدالمنان عمر عالم اور جماعتِ احمدیہ کے ستونوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کی طرف لوگوں کی نظریں اٹھنے لگی تھیں۔

مرزا بشیر الدین محمود احمد پر اس سے دو سال قبل ایک ناکام قاتلانہ حملہ ہو چکا تھا، جس کا ان کی صحت پر بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ خنجر کی نوک ان کی گردن میں اٹکی رہ گئی تھی، جس کا پتا اس وقت چلا جب وہ علاج کے لیے یورپ گئے۔ اس کو نکالا نہ جا سکا کیونکہ آپریشن کرنے پر ان کی جان جانے کا خطرہ تھا۔ ان کی صحت مسلسل گر رہی تھی اور ''خاندانِ نبوّت'' میں ان کی جانشینی کا سوال اٹھایا جا رہا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ خلافت کی گدی ان کے بیٹے مرزا ناصر احمد کو ملنی چاہیے، جس کو انہوں نے بچپن میں قرآن حفظ کروایا تھا، پھر جامعہ احمدیہ میں تعلیم دلا کر مولوی فاضل کی ڈگری دلوائی تھی۔ اس کے بعد اسے پڑھنے آکسفورڈ بھیجا جہاں سے وہ بی اے کی ڈگری لے کر آئے تھے۔ اپنے نام کے ساتھ وہ ایم اے (آکسن) اس لیے لکھا کرتے تھے کیونکہ جو کوئی وہاں سے بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد دو سال تک کسی کالج میں پڑھائے اس کو ایم اے کی ڈگری دے دی جاتی تھی۔

انگلستان سے واپسی پر ان کو پہلے جامعہ احمدیہ، پھر تعلیم الاسلام کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ اس کے باوجود عام طور سے ان کے بارے میں یہ تاثر تھا کہ وہ موٹے دماغ کے آدمی ہیں۔ ان سے ایک بار دہلی کے ایک جلسے میں تلاوتِ قرآن کروائی گئی تھی، جس میں ان سے غلطی سرزد ہوئی تھی۔ اس کے سبب مخالفوں نے پتھراؤ کیا تھا۔ مرزا بشیر الدین محمود احمد نے کئی بار اس واقعے کا خود ذکر کر اور اپنے بیٹے کی قابلیت کے بارے میں شک و شبہے کا اظہار کیا تھا۔ اس وجہ سے جماعت کے اندر اس خیال کا پیدا ہونا قرینِ قیاس ہے کہ ان کے مقابلے میں عبدالمنان عمر خلافت کے لیے زیادہ موزوں شخص ہیں۔ وہ بھی تو ایک بڑے عالمِ دین کے بیٹے ہیں، جو جماعت کے پہلے خلیفہ تھے۔ پھر وہ خود بھی نامور عالم تھے۔

عبدالمنان عمر کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ برسوں سے مسند احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی جملہ حدیثوں کو صحیح بخاری کی طرح ابواب میں ترتیب دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس عمل کو علمی اصطلاح میں ''تبویب'' کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے والد حکیم مولوی نور الدین نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ کیا

ان اچھا ہوا اگر کوئی شخص یہ علمی خدمت بجا لائے۔ خلافت کے قریبی حلقوں میں اس خدشے کا اظہار کیا گیا کہ اگر عبدالمنان عمر کی کتاب چھپ گئی، تو پوری جماعت پر ان کی علمیت کا رعب پڑ جائے گا۔ اس کا فی الفور تدارک ہونا چاہیے۔ چنانچہ جماعت کے مولوی حضرات نے مرزا بشیر الدین محمود احمد کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ احمدی علما کی ایک کمیٹی بنائی جائے جو دو چار مہینوں کے اندر اندر مسند احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی تبویب کا کام مکمل کر دے۔ جب ان کی طرف سے کتاب پہلے چھپ جائے گی، تو عبدالمنان عمر کا سارا کیا کرایا رائیگاں جائے گا۔

سازش نئی نہیں تھی

یہ چیز جماعتِ احمدیہ میں نئی نہیں تھی، کیونکہ اس کی ایک مثال پہلے موجود تھی۔ جب خلیفہ اوّل حکیم مولوی نور الدین کی ۱۹۴۱ء میں وفات ہوئی تو صدر انجمنِ احمدیہ کے بنیادی اراکین کی اکثریت اس حق میں تھی کہ جماعت میں خلافت کا نظام آگے نہ چلایا جائے بلکہ اس کی جگہ راہنمائی کا کام ایک بورڈ کے سپرد کیا جائے، جو جمہوری طرز پر جماعت کا انتظام چلائے مگر مرزا بشیر الدین محمود احمد چونکہ پیری مریدی کی گدی بنانا چاہتے تھے، اس لیے وہ خلافت کے جاری رکھنے کے حق میں تھے۔ صدر انجمنِ احمدیہ کے بیشتر سینئر اراکین قادیان کو چھوڑ کر لاہور چلے گئے اور انہوں نے وہاں پر اپنی جماعت بنالی، جس کو عام طور سے ''لاہور جماعت'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس جماعت کے سرگروہ مولوی محمد علی تھے، جن کے سپرد صدر انجمنِ احمدیہ کی طرف سے قرآن پاک کو انگریزی میں ڈھالنے کا کام لگایا گیا تھا۔ لاہور جاتے ہوئے وہ اپنا مسودہ ساتھ لیتے گئے۔ قادیان کی جماعت کو خطرہ پیدا ہوا کہ اگر مولوی محمد علی کا انگریزی ترجمۃ القرآن چھپ گیا تو ان کی ساکھ بندھ جائے گی۔ اس لیے یہ اسکیم بنائی گئی کہ ان کا ترجمہ چھپنے سے پہلے قادیان کی طرف سے قرآن کا انگریزی زبان میں ترجمہ چھاپ دیا جائے۔ چنانچہ ایک بورڈ بنایا گیا اور ایک سال کے اندر اندر ۱۹۱۵ء میں پہلے پارے کا انگریزی ترجمہ چھاپ دیا گیا۔ مکمل قرآن پاک کا ترجمہ بیس برس بعد ۱۹۳۵ء میں جا کر چھپا، جس پر مولوی شیر علی نے دن رات کام کیا تھا۔

مسند احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی تبویب کا فیصلہ آناً فاناً ہوا۔ جامعۃ المبشرین کے جملہ اساتذہ اور طلبہ کو حکم ہوا کہ اگلے روز سے اس کام میں لگ جائیں۔ ربوے کی خلافت لائبریری میں مسند احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی صرف ایک جلد موجود تھی۔ اس زمانے میں ابھی فوٹو کاپی کی مشینیں نہیں پائی جاتی تھیں، اس لیے فیصلہ یہ تھا کہ جلد کے اجزاء الگ الگ کر لیے جائیں، اس کے بعد ساری حدیثیں الگ الگ اوراق پر نقل کی جائیں تاکہ ماہرینِ حدیث ان کو ابواب میں ترتیب دے سکیں۔ اس فیصلے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مشکلات کی طرف کسی کی نظر نہ گئی۔ اوّل تو یہ بات قابلِ غور تھی کہ اندھا دھند نقل کرنے کے نتیجے میں غلطیاں در آئیں گی اور پروف ریڈنگ کی طرف کسی نے توجہ نہ دی تھی۔

ان دنوں ربوہ میں ایک رپورٹ نے بہت ہلچل مچا رکھی تھی جو کسی نے لندن کے سفر سے واپسی پر لکھی اور مرزا بشیر الدین محمود احمد کو بھیج دی تھی۔ اس میں بیان کیا گیا تھا کہ ان کا صاحب زادہ مرزا طاہر احمد، جو آگے چل کر خلیفۃ المسیح الرابع بنا، اور اس کا ساتھی میر محمود احمد ناصر مسجد فضل، لندن کے فلیٹ میں راتوں کو پارٹیاں دیتے ہیں جن میں موسیقی سنی جاتی ہے، شراب چلتی ہے اور لڑکے لڑکیاں مل کر ڈانس کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں تفتیش کی خاطر ایک کمیشن بٹھایا گیا، جس نے تمام الزامات کو غلط قرار دیا اور دونوں صاحبزدگان کو بری کر دیا۔ میں نے مرزا خلیل احمد سے پوچھا کہ وہ اپنے والدِ ماجد کے ساتھ لندن جانے والے گروپ میں شامل تھے اور وہاں کے حالات سے خوب واقف ہیں، کیا وہ سمجھتے ہیں کہ یہ رپورٹ بالکل بے بنیاد ہے؟ اس پر انہوں نے جواب دیا: تم ہر روز میرے ساتھ نواب محمد احمد کے بنگلے میں منائی جانے والی رنگ

رلیاں دیکھتے ہو، کیا تم تصور نہیں کر سکتے کہ طاری (مرزا طاہر احمد کا گھریلو نام) لندن میں عیش نہیں کرتا ہوگا۔ اس بات کی تصدیق چند برس ہوئے مرزا طاہر احمد نے خود کر دی۔

انہوں نے ایک مجلس میں، جو احمدیہ ٹیلی ویژن پر ساری دنیا میں دیکھی گئی، بیان کیا کہ جب وہ طالب علمی کے زمانے میں لندن میں مقیم تھے تو اپنے انگریز دوستوں کے ساتھ پوری رات جاری رہنے والی مجلسوں میں باتیں کیا کرتے تھے۔ جو کوئی یورپ کے حالات سے واقف ہے اس کو پتا ہے کہ یہ رات بھر جاری رہنے والی مجلسیں شبینہ پارٹیاں ہوتی ہیں، جن میں موسیقی بجائی جاتی ہے، شراب پانی کی طرح بہتی ہے اور رقص ہوتا ہے۔ عام طور سے مشہور تھا کہ مرزا طاہر احمد اور میر محمود احمد لندن کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈی میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مرزا خلیل احمد نے اس بارے میں مجھے اس وقت کہہ دیا تھا: یہ لوگ وہاں پر عیش کر رہے ہیں اور تم دیکھ لو گے کہ وہ بی اے کی ڈگری بھی لے کر نہیں آئیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا۔

جماعت سے علیحدگی

۱۹۶۰ء میں میری مذہبی تعلیم مکمل ہو گئی، چناں چہ قادیانیت کی تبلیغ کے لیے مجھے مبلغ بنا کر جرمنی بھجوا دیا گیا۔ اگلے سال میں اپنے مرکز انچارج کی اجازت سے سیر کرنے کوپن ہیگن (ڈنمارک) چلا گیا لیکن ربوہ نے مجھ سے جواب طلب کر لیا کہ تم جرمنی چھوڑ کر کیوں گئے؟

ہفتے بعد ربوہ سے ایک دوست سلیم صدیقی نے مجھے لکھا کہ تمہاری تبدیلی نائجیریا کی جا رہی ہے اور یہ قدم اس لیے اٹھایا جا رہا ہے کہ تم نے نظامِ سلسلہ کی خلاف ورزی کی ہے۔ میں نے ایک اور دوست مرزا رفیق احمد کو خط لکھا کہ اس بارے میں تحقیق کر کے بتائیں کہ یہ بات درست ہے یا نہیں؟ انہوں نے اپنے بڑے بھائی، مرزا مبارک احمد سے، جو وکیل التبشیر تھے، اس بارے میں پوچھا تو جواب ملا کہ یہ خبر غلط ہے، مگر اس خط کے ساتھ ہی ایک خط وکالت التبشیر کا ملا، جس میں پوچھا گیا تھا کہ اس شخص کا نام بتاؤں، جس نے مجھے میری تبدیلی کے بارے میں اطلاع بھیجی تھی۔ گویا یہ خبر ایک راز افشا کرنے کے مترادف تھی۔

چند دنوں بعد خط آیا کہ آپ کی تبدیلی پہلے فیصلے کے مطابق نائجیریا کر دی گئی ہے اس لیے آپ وہاں پر جانے کے لیے تیار رہیں اور ٹکٹ ملتے ہی اس ملک چلے جائیں۔ آپ کے لیے ویزا بنوا لیا گیا ہے۔ میں نے جواباً لکھا کہ یہ تبدیلی چونکہ سزا کے طور پر کی جا رہی ہے، اس لیے مجھے صفائی کا حق ملنا چاہیے۔ جواب آیا کہ آپ حکم عدولی کر رہے ہیں، جس کی سزا میں آپ کو وقف سے خارج کرنے کے علاوہ سلسلہِ عالیہ احمدیہ سے نکالا جا سکتا ہے۔

میرے نزدیک یہ حکم سراسر ناجائز تھا اور میں کسی صورت میں اس کو ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ مجھے نظر آ رہا تھا کہ میں ایسے نامنصفانہ نظام کے ساتھ نہیں چل سکوں گا۔ اگر آج نہیں تو کل یہ لوگ مجھے نکال دیں گے۔ میں اگر اب ستائیس برس کی عمر میں جدا ہو جاؤں، تو تعلیم مکمل کر کے اپنا مستقبل بنا سکتا ہوں لیکن اگر مجھے دس برسوں کے بعد خارج کیا گیا تو کچھ بھی نہ کر سکوں گا۔ میرے سامنے ان بے شمار احمدی مبلغوں کی مثالیں تھیں، جن کے ساتھ یہ برتاؤ کیا گیا تھا اور جو جماعت سے نکالے جانے کے بعد روٹی کے ٹکڑوں کو محتاج ہو گئے تھے۔

ان حالات میں میرے سامنے بس ایک ہی راستہ تھا کہ مشن ہاؤس کو خیرباد کہہ دوں۔ تب تک میں نے جماعتِ احمدیہ سے علیحدگی کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ البتہ واضح تھا کہ یہ مرحلہ جلد یا بدیر آنے والا ہے کیونکہ میں زندگی میں پہلی بار جماعت کے عقائد کو تنقیدی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ بہت جلد میری آنکھیں کھل گئیں اور میں نے جانا کہ احمدیت تو مرزا غلام احمد قادیانی کا دنیاوی کاروبار تھا، جس کے ذریعے وہ اپنی

احمدیت کا اقتصادی مستقبل سنوارنا چاہتے تھے۔ الہام اور نبوت کا سارا ڈھونگ صرف اس مقصد کے لیے رچایا گیا۔

مشن ہاؤس چھوڑنے کا فیصلہ تو میں نے کر لیا تھا، لیکن میری جیب میں اس وقت صرف بیس مارک تھے اور مجھے نظر آ رہا تھا کہ مجھے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے کچھ سرمایہ درکار ہوگا۔ میں نے اس سلسلہ میں کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا لیکن قدرت ایسے موقع پر خود کوئی انتظام کر دیتی ہے۔ میں مچھلی کے ایک ریستوران میں دوپہر کا کھانا کھانے گیا، تو وہاں پر میری ملاقات ایک پاکستانی تاجر سے ہوئی، جس کے جرمنی آنے کا مقصد مرسڈیز کار اور الیکٹرک کا سامان خریدنا تھا۔ اس نے شکایت کی کہ اسے اس سلسلے میں مشکلات پیش آ رہی ہیں، کیونکہ دکانوں میں کسی کو انگریزی نہ آتی تھی اور ان کی جرمن اس کے پلّے نہ پڑتی تھی۔

اس نے پوچھا، کیا میں اس سلسلے میں اس کی مدد کر سکتا ہوں؟ میں اس خدمت کے لیے تیار تھا کہ پچھلے ڈیڑھ سال میں اچھی خاصی جرمن زبان سیکھ لی تھی۔ اس نے مجھے مرسڈیز کاروں کا ایک شوروم دکھایا، جہاں اس کی پسند کی کار کھڑی تھی۔ میں نے مالک دکان سے بات کی اور کہا کہ میرا دوست فلاں کار خریدنی چاہتا ہے اور میں سودا کروا سکتا ہوں، مگر میری شرط یہ ہے کہ قیمتِ خرید میں سے مجھے کمیشن ملے۔ وہ فوراً اس کے لیے تیار ہو گیا۔ چنانچہ جھٹ پٹ کار کا سودا ہو گیا۔ اس کے بعد میں پاکستانی تاجر کو الیکٹرک سامان کی دکان میں لے گیا، جہاں اس نے ریڈیو، ٹیپ ریکارڈ اور فوٹو کاپی کی مشین، جو نئی نئی آئی تھی اور دوسرا بہت سا سامان خریدا۔ ہر جگہ مجھے کمیشن ملتا گیا۔ شام تک میری جیب میں اتنے مارک ہو گئے کہ میں دو چار مہینوں کے لیے خود کفیل ہو گیا۔ اب میرے لیے مشن ہاؤس کو خیرباد کہنے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔

جماعت احمدیہ کا جھوٹ

پاکستان میں جماعتِ احمدیہ کے اراکین کی تعداد کے بارے میں بدستور غلو سے کام لیا جا رہا ہے۔ مجھے جماعت کے نمائندے، مولانا شفیع اشرف نے بتایا تھا کہ پاکستان میں احمدیوں کی تعداد تیس اور چالیس لاکھ کے درمیان ہے۔ یہی تعداد خلیفہِ ثالث مرزا ناصر احمد نے پارلیمان کے کمیشن کو بتائی تھی۔ جب میں نے اس بارے میں احمدی صحافی، ثاقب زیروی سے استفسار کیا، تو موصوف نے احمدیوں کی تعداد پینتالیس لاکھ بتائی۔ اتفاقی طور پر مجھے ساتویں دہائی کی احمدیہ مجلسِ مشاورت کی ایک رپورٹ مل گئی، جس میں چندہ دینے والوں کی کل تعداد پچیس ہزار بتائی گئی تھی۔

یہ جاننا چاہیے کہ جو احمدی تین ماہ تک لازمی چندہ نہیں دیتا، اس کو جماعت سے خارج کر دینے کا حکم ہے۔ اس لیے یہ فرض کر لینا غلط نہیں کہ پچیس ہزار چندہ دینے والے جماعت کے سرگرم رکن ہیں۔ یہ ممبر عام طور سے خاندانوں کے سربراہ ہوتے ہیں، اس لیے اگر ہر خاندان کے دس افراد تصور کر لیے جائیں، تو کل تعداد دو لاکھ پچاس ہزار بنتی ہے۔ اب اگر تصوّر کر لیا جائے کہ چندہ نادہندگان احمدیوں کی تعداد بھی اتنی ہی ہے، جتنی چندہ دینے والوں کی، تو احمدیوں کی کل تعداد پانچ لاکھ بنتی ہے۔ اس سے زیادہ احمدی میرے اندازے کے مطابق پاکستان میں نہیں پائے جاتے۔

میں نے اپنی ایک تحقیقی رپورٹ میں لکھا تھا کہ دنیا بھر میں احمدیوں کی تعداد دس لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ یہ بہت بعد کی بات ہے کہ خلیفہِ رابع مرزا طاہر احمد نے ہر سال احمدیوں کی تعداد کو بڑھا چڑھا کر بتانا شروع کیا۔ ۲۰۰۳ء میں ان کی وفات تک، بقول ان کے، ساری دنیا میں احمدیوں کی تعداد بیس کروڑ تک پہنچ چکی تھی اور اس میں سال بہ سال اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ صرف بھارت میں احمدیوں کی تعداد سات کروڑ بتائی گئی۔ گویا اس ملک میں ہر دوسرا مسلمان احمدی تھا۔ ان کے جانشین مرزا مسرور احمد نے ۲۰۰۳ء میں بیعت کرنے والوں کی تعداد تین لاکھ چالیس ہزار بیان کی۔ ♦♦♦

قتل نے صدر شی جن پنگ کو طاقتور بنا دیا

چین کے ایک ابھرتے کرشماتی سیاست داں کی ڈرامائی داستان، غرور و تکبّر کے نشے نے اُسے ایوانِ اقتدار سے نکال کر جیل میں پہنچا ڈالا

مہر افروز

یہ پانچ برس پہلے کی بات ہے، چین میں کرشماتی شخصیت رکھنے والے ایک سیاستدان، بوزلائی (Bo Xilai) کی خوش بختی کا ستارہ غروب ہوگیا۔ سیاسی حریفوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ بوزلائی کے زوال نے اس کے ایک سیاسی حریف کو طاقتور ہونے کا نادر موقع فراہم کردیا۔ یہ حریف کوئی اور نہیں چینی صدر، شی جن پنگ تھے۔ اس طرح چین میں ایسے زبردست سیاسی ڈرامے نے جنم لیا جس کی چینی سیاسی تاریخ میں پہلے کم ہی نظیر ملتی ہے۔ یہ ڈراما ایک قتل سے شروع ہوا۔ گو اس قتل کی داستان چین نہیں بلکہ ایک برطانوی قصبے سے شروع ہوتی ہے جو سمندر کنارے واقع ہے۔

یہ ۲۰۰۰ء کے موسم گرما کی بات ہے، انگلینڈ کے جنوبی ساحل پر قیمتی زیورات پہنے اور خوبصورت کپڑوں میں ملبوس گوکیلائی (Gu Kailai) ایک ہیلیم غبارہ خریدنے گائلز ہال کے پاس پہنچی۔ وہ یہ غبارہ چین کی کسی کمپنی کو بطور نمونہ بھجوانا چاہتی تھی۔ جیمز کا پتا گو کے واقف کار، نیل ہیوڈ نے دیا تھا۔

گوکیلائی منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوئی۔ اس کا باپ چینی فوج میں جنرل کے عہدے پر فائز تھا لیکن بہت جلد اُسے زندگی کے تلخ حقائق کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ صدر ماؤزے تنگ کے زمانے میں جب ثقافتی انقلاب برپا ہوا تو گو کے والدین کو بھی بہت سے اُمرا کی طرح جیل کی ہوا کھانا پڑی۔

گوکیلانی جب ایک عام لڑکی تھی

والدین کا سایہ سر سے دور ہوا تو اُس زمانے میں کیلائی نے تقریباً فقیرانہ زندگی بسر کی۔ کئی بار اُسے بھیک مانگنے نکلنا پڑا۔ مگر اس نے محنت مشقت سے کبھی کنی نہیں کترائی۔ کچھ عرصہ وہ قصاب کے طور پر بھی کام کرتی رہی۔ کٹھن حالات کے باعث وہ ابتدائی تعلیم بھی ٹھیک سے حاصل نہ کرسکی۔ جیسے ہی حالات بہتر ہوئے اُس نے اپنی تعلیم پر بہت دھیان دیا۔ آخرکار اپنے وسائل اور ذرائع استعمال کرتے ہوئے پیکنگ یونیورسٹی تک جا پہنچی۔ پیکنگ یونیورسٹی چین میں آکسفورڈ کا درجہ رکھتی ہے لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ کیلائی نے نہ صرف بہادری سے مشکل حالات کا مقابلہ کیا بلکہ محنت سے منزل مقصود تک بھی پہنچ گئی۔ بلاشبہ خدا ہمیشہ اُن کی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں۔ بنا تکلیف جھیلے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا!

گوکیلائی جیسی اُولعزم لڑکی کو ایسے شوہر کی ضرورت تھی جو اچھے عہدے پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ عمدہ صلاحیتوں کا مالک ہو۔ وہ خود بھی مقناطیسی شخصیت کی حامل تھی، جہاں جاتی لوگ اُس کی جانب کھنچے چلے آتے۔ آخر اُسے بوزِلائی پسند آگیا۔ جب وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوئے تو بوزلائی شادی شدہ تھا۔ بَو نے اپنی پہلی بیوی کا احتجاج نظر انداز کرتے ہوئے اُسے طلاق دی اور گو سے شادی کرلی۔

شادی کے آغاز میں اُن کے معاشی حالات اتنے اچھے نہ تھے۔ اُنہیں ایسے کمرے میں رہنا پڑا جس میں غسل خانہ تک نہ تھا۔ اُسی کمرے کے درمیان ایک پردہ لگا کر گو نے اُسے دو

حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک بیڈ روم کے طور پر استعمال ہوتا تو دوسرا ڈرائنگ روم بن گیا۔ آخر ذہانت و محنت کے بل پر نوے کی دھائی میں بوڈلین (Dalian) شہر کا میئر بن گیا۔ ڈیلین ہی وہ شہر جہاں برطانوی شہری نیل ہیوڈ (Neil Heywood) سرگرم تھا۔

نیل ہیوڈ نے اپنے کیریئر کا آغاز برطانوی انٹیلی جنس کے جاسوس سے کیا۔ تاہم یہ واضح نہیں کہ اُس نے یہ کام کب شروع کیا۔ جب برطانوی حکام سے اِس سلسلے میں بات ہوئی تو اُنہوں نے جوابات دینے سے گریز کیا۔ ہیوڈ نے جب کاروباری دنیا میں قدم رکھا تو کامیابی کے زینے چڑھتا چلا گیا۔ وہ بہت خداداد صلاحیتوں کا مالک تھا۔

برطانیہ میں جو کمپنیاں چین میں کاروبار کرنا چاہتی تھیں، نیل ہیوڈ ان کا مددگار بن جاتا۔ وہ کمپنیوں کے مالکان کی ملاقات بااثر چینی سیاست دانوں اور سرکاری افسروں سے کرواتا۔ اگر معاہدہ طے پا جاتا، تو نیل کو کمیشن مل جاتا۔ وہ گویا چینی طبقہ اشرافیہ کا ایجنٹ تھا۔ یاد رہے، چین میں یہ طبقہ اشرافیہ کے لوگ خود کاروباری معاملات طے کرنے سے کتراتے ہیں۔

ڈیلین شہر ہی میں نیل ہیوڈ کی ملاقات بوزلائی اور گوکیلائی سے ہوئی۔ وہ ان کا بھی ایجنٹ بن گیا۔ ڈیلین میں جن برطانوی کمپنیوں کو کاروبار کرنا ہوتا، وہ نیل کے توسط ہی سے بااثر میئر بوزلائی سے رابطہ کرتیں اور اپنا کام نکلوالیتیں۔ نیل نے ڈیلین ہی کی ایک چینی لڑکی سے بیاہ بھی کرلیا۔

منی لانڈرنگ کا آغاز

گوکیلائی پریوں کے دیس کی باسی نہ تھی۔ اُسے وقتاً فوقتاً تلخ حقائق کا سامنا کرنا پڑا۔ اگرچہ تمام چینی کمیونسٹ لیڈر عجز و انکسار والے اور سادہ مزاج لگتے ہیں مگر یہ بھی سچ ہے کہ بعض راہنما بے راہروی کا شکار ہونے کے ساتھ ساتھ دولت کے نشے میں چور اور اپنی طاقت کا اندھا استعمال کرنے میں طاق تھے۔ انہی میں گوکیلائی کا شوہر بوزلائی بھی شامل تھا۔ حرام کی دولت پا کر وہ اِدھر اُدھر منہ مارنے لگا۔ ایک دن کیلائی نے اپنے دوست لیری چینگ (Lerry Cheng) کو بتایا کہ بو نے اُس کے ساتھ بے وفائی کی ہے۔ ہر آنے والا دن گو کی

نیل ہیوڈ جو آخر کار مارا گیا

المردگی بڑھا رہا تھا۔ ایک بار تو اُس نے اپنی جان لینے کی کوشش بھی کی کیونکہ وہ بہت بے چارگی محسوس کر رہی تھی۔

کیلائی کے لیے یہ ناقابل برداشت تھا کہ جس شخص سے اُس نے محبت کی، وہ دوسروں کی زلفوں کا اسیر ہو چکا۔ ایک روز گو نے چاقو سے اپنی کلائی بھی زخمی کرلی۔ وہ بو کی توجہ حاصل کرنا چاہتی تھی۔ جتنی وہ باہمت لڑکی تھی، اب اسی قدر پست حوصلہ دکھائی دیتی۔ آہستہ آہستہ اس کے قدم نشے کی جانب راغب ہونے لگے۔

شروع میں وہ صرف نیند لانے کے لیے خواب آور گولیوں کا استعمال کرتی پھر دھیرے دھیرے نشے کی لت میں ڈوبتی چلی گئی۔ آخر کیلائی نے شوہر کا عالیشان گھر چھوڑ دیا۔ کسی گمراہ عورت کی طرح وہ محبت کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھومنے لگی۔ وہ تمام اُصول و ضوابط بھول چکی تھی۔ اب جو بھی شخص اُسے اپنے لیے سودمند دکھائی دیتا، گو اُس سے روابط بڑھاتی اور اُس کی محبوبہ بن کر فائدہ حاصل کرنے لگتی۔ ڈیلین میں اُس کے چاہنے والوں کی لمبی فہرست تھی۔ ۱۹۹۹ء تک گو اور بوزلائی میں صرف نام کا رشتہ رہ گیا۔ اُن کے تعلقات ختم ہو چکے تھے۔ صرف اپنی سیاسی ساکھ برقرار رکھنے کے لیے وہ مختلف مواقع پر اکٹھے نظر آتے تاکہ عوام کی نظروں میں دھول جھونک سکیں۔

اب گوکیلائی کی زندگی کا واحد مقصد اپنے بیٹے کو ایسی ممتاز شخصیت بنانا تھا جو پوری دنیا میں جانا پہچانا جائے لہٰذا کافی محنت اور کوشش کے بعد گو برطانیہ میں اس کے لیے ایک اسکول ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگئی۔ بورنے ماؤتھ (Bournecmouth) میں اس نے ایک اپارٹمنٹ کرایے پر لے لیا۔ اِس کے دوسری جانب ویلن ٹائنو (Valentino) نامی ہوٹل تھا۔ ہوٹل کا مالک بتاتا ہے، وہ اکثر یہاں آتی جاتی رہتی۔ کبھی کسی نے اُس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں دیکھی، وہ ہمیشہ مصروف دکھائی دیتی۔

ویلن ٹائنو ہوٹل کی تمام میزیں سرخ کپڑے سے ڈھانپی گئی تھیں۔ گو اپنے تمام کاروباری معاملات وہیں بیٹھ کر دیکھا کرتی۔ وہ منی لانڈرنگ کرنے میں مصروف تھی یعنی چین سے اپنی ساری دولت غیر قانونی طریقوں سے برطانیہ لا رہی تھی۔ اِس سلسلے میں کچھ لوگ اُس کے معاون تھے جن میں نیل ہیوڈ پیش پیش تھا۔ ہیوڈ کے ساتھ اُس کا دوست گائلز ہال (Giles Hall) بھی اکثر دِکھائی دیتا۔ ہال بتاتا ہے کہ ہیوڈ اور گو ہوٹل میں ملاقات کرتے۔ دورانِ گفتگو بارہا وہ غصے میں آتی۔ وہ اس طرح کی باتیں اکثر ہیوڈ سے پوچھتی، کیا تم نے فلاں اتنی رقم بھیجی؟ وہ لاکھوں کروڑوں کی باتیں کرتی۔ چین میں جو لوگ مسندِ اقتدار پر فائز ہیں، ان کی ''خفیہ و بالائی'' آمدن کروڑوں ڈالر میں ہے۔

ایک بار گو کو پیسوں کی ضرورت آن پڑی۔ وہ اپنے بیٹے کا داخلہ بہت بڑے برطانوی پرائیویٹ اسکول میں کروانا چاہتی تھی۔ اسکول کا نام ہیرو (Harrow) تھا۔ کیلائی نے گائلز ہال سے پوچھا کہ آیا وہ اُسے ڈھائی، تین لاکھ پونڈ ادھار دے سکتا ہے تاکہ وہ اپنے بیٹے کی فیس جمع کروا سکے؟ ہال نے انکار کر دیا۔ انکار سنتے ہی وہ بپھر گئی اور بولی ''تم کبھی چین آنے کی جرأت نہ کرنا۔ ڈیلین کا پولیس چیف میرا دوست ہے۔ تمہیں ہمیشہ سڑنے کے لیے جیل بھجوادوں گی یہاں تک کہ تم دن کی روشنی دیکھنے کو ترس جاؤ گے!''

جیسا کہ بتایا گیا، گائلز ہال دیوہیکل ہیلیم غبارے فروخت کرتا تھا۔ کیلائی کی وساطت سے وہ کئی چینی کمپنیوں کو یہ غبارے فروخت کر کے اچھا خاصا منافع کما چکا تھا۔ اب کیلائی کی دھمکی سن کر وہ خوفزدہ ہو گیا۔ ہیوڈ بھی اس سے دور رہنے لگا۔

کیلائی کی ناراضی وقتی ثابت ہوئی۔ وہ اُس انسان سے کبھی تعلقات ختم نہ کرتی جو فائدہ مند ثابت ہو سکے اور بلاشبہ ہیوڈ اُنہی میں سے ایک تھا۔ ہم وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ

ہیوڈاور گو کے تعلقات کیسے تھے مگر اتنا ضرور ہے کہ بہت گہرے تھے۔

ہال بتاتا ہے' ہیوڈ کہا کرتا تھا کہ اگر کبھی کیلائی نے میرے خلاف کچھ کرنے کی کوشش کی تو میں اُسے جان سے مار ڈالوں گا۔ وہ اُس کے تمام رازوں سے واقف تھا اور تمام کاروباری معاملات دیکھتا۔ ہیوڈ اونچے قد کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ پرکشش شخصیت کا حامل تھا۔ ہر لمحہ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ سجی رہتی۔

کھلنڈرے لڑکے سے میئر بننے تک

گو جیان (Gu Jian) بوزلائی کا ہم جماعت تھا۔ اِن دونوں نے بیجنگ کے کالج میں تین سال گزارے تھے۔ گو جیان بتاتا ہے کہ جب وہ ۱۹۷۹ء میں پہلے دِن اُسے ملا تو بوزلائی جماعت میں سب سے قدآور لڑکا تھا۔ وہ سادہ کپڑوں میں ملبوس تھا۔ ہمیشہ مسکراتا رہتا۔ وہ دنیا کو اپنے رنگ سے چلانا چاہتا تھا۔ بالکل ایسے ہی خیالات کا اظہار بوزلائی کے اُستاد میکی نن نے کیا۔ گوکیلائی کی طرح بوزلائی بھی کمیونسٹ پارٹی کا رکن تھا۔ تب تک کمیونسٹ پارٹی امرا کی جماعت بن چکی تھی۔ بوزلائی کا باپ' بو یبو (Bo Yibo) چین کا ہیرو تھا۔ وہ چیئرمین ماؤ کے ساتھ کمیونسٹ پارٹی کے بانیوں میں شامل تھا۔

صدر ماؤ کے دورِ حکومت میں جب ثقافتی انقلاب برپا ہوا تو بہت سے دوسرے اُمرا کی طرح اُسے بھی جیل کی ہوا کھانا پڑی۔ بوزلائی کی ماں نے حالات سے دلبرداشتہ ہو کر خودکشی کر لی۔ بو نے پھر دس سال تک خود کو کوئلہ کھودنے میں ضائع کر دیا۔ ماؤزے تنگ جب دنیا سے رُخصت ہوا تو تقریباً تیس برس کا تھا۔ اس کے بعد نہ صرف بو بلکہ پورا چین جاگ اُٹھا۔ بو نے اپنے سیاسی کیریئر کی پلاننگ کا آغاز کیا اور آخر کار یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

اُس کا والد بو یبو بھی جیل سے رہائی پاتے ہی اپنے سابقہ سیاسی عہدے پر فائز ہو گیا۔ اب بو اپنا فارغ وقت امرا کی صحبت میں گزارتا۔ کبھی کبھار وہ دوستوں خصوصاً گو جیان کو بھی اپنی سرگرمیوں میں ساتھ رکھتا۔ گو جیان کو بہت سی نئی چیزیں دیکھنے کو ملیں جن میں سے ایک غیر ملکی ریڈیو نشریات گھر میں سننا شامل تھا۔ صرف چند برس قبل صدر ماؤ کے دور میں بذریعہ ریڈیو غیر ملکی نشریات سننے پر کسی کو بھی پھانسی کے پھندے پر لٹکایا جا سکتا تھا۔

اِس وقت بو کی پہلی شادی ہو چکی تھی لیکن وہ اپنی

بوزلائی اپنے دوست، گو جیان کے ساتھ

عاشیوں سے باز نہ آیا۔ ہمیشہ عورتوں کے اِردگرد منڈلاتا رہتا۔ ایک دِن بو نے گو جیان کو زونگ نان ہائے میں یہ کہہ کر بلایا کہ اُسے بخار ہے اور وہ گپ شپ کرنا چاہتا ہے۔ جب وہ متعلقہ جگہ پہنچا تو بوڑھے چوکیدار نے اُسے روک لیا اور گزارش کی کہ اپنے دوست بو کو سمجھاؤ، وہ عورتوں کے چکر سے نکل آئے۔ یہ بات گو جیان کے دِل کو بھی لگی۔ اُس نے بو کو سمجھایا لیکن اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور اپنی مسکرہ سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ جیان نے اُسے مشورہ دیا کہ اگر وہ یہ سب کچھ کرنا چاہتا ہے تو پھر سیاستدان بننے کا خیال اپنے دِل سے نکال دے اور کاروباری کے طور پر زندگی کا آغاز کر لے، کسی کو کوئی پروا تک نہ ہوگی۔

کچھ عرصے بعد بو نے دوسری شادی رچالی۔ گوکیلائی کے زندگی میں آنے کے بعد ۱۹۹۴ء میں بو میئر ڈیلین بن گیا۔ بو نے خستہ حال ڈیلین کو جدید شہر میں تبدیل کر دیا۔ اس نے نہ صرف عجائب گھر اور فائیو سٹار ہوٹلز بنوائے بلکہ پارکوں کی تعمیر پر بھی خصوصی توجہ دی۔ اب وہ میئر کم اور بادشاہ زیادہ دکھائی دیتا۔ ایک دن بو کو اُس کے پرانے اُستاد میکی نن ملنے آئے۔ میکی نن نے بو کو بہت مفید مشوروں سے نوازا۔ انہوں نے بو کو بتایا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا شہر سب سے منفرد اور جدا نظر آئے تو تمہیں تین چیزوں کی طرف خصوصی دھیان دینا ہوگا:

(۱) ہر طرف ہریالی نظر آئے (۲) فٹ بال ٹیم کا انتخاب کرو (۳) فیشن شوز منعقد کرو۔ بو کے لیے سب سے پرکشش چیز فیشن شوز کا انعقاد تھا۔ بو نے سرکاری رقم سے ماڈلنگ کا ایک اسکول بنوایا اور اُسے خوبرو خواتین سے بھر دیا۔ دیگر شہروں کے باسیوں اور غیر ملکیوں کو ڈیلین بہت پرکشش دکھائی دینے لگا۔ سبزے اور عجائب گھروں کی کثرت نے شہر کو چار چاند لگا دیے۔ اب بو ہر وقت نوجوان لڑکیوں کے جھرمٹ میں دکھائی دیتا۔ اُس کے دفتر کی روشنیاں راتوں کو بھی جگمگاتی رہتیں۔ لوگ خوش تھے کہ ان کا میئر کتنا محنتی ہے جو صرف اُنہی کے لیے اپنی راتوں کی نیند اور چین گنوا رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بو تو رنگ رلیاں منا رہا ہوتا۔

جرائم کی دلدل میں داخلہ

یہ صرف چین ہی ہے جہاں اگر ایک شہر آپ کے ہاتھ میں آجائے تو سمجھ لیجیے کہ وہاں کی پولیس، عدالتیں اور میڈیا سب کچھ آپ کے قبضے میں آ گیا۔ جب آپ چاہیں لوگوں کا ایک جلوس بلوالیں یا پھر مخالفین میں سے جتنے چاہیں' غائب کروا دیں۔ اِس حوالے سے ینگ یونگ زیانگ (Zhang Young xiang) کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

زیانگ کا شمار ڈیلین کے بااثر کاروباری حضرات میں ہوتا تھا۔ بو کو زیانگ کی کوئی بات بری لگ گئی۔ بو نے ڈیلین پولیس کو اُس کے پیچھے لگا دیا۔ زیانگ خاندان کے سولہ افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ تفتیشی افسران نے نو دن اور نو راتیں اُن سے باز پرس کی۔ اِس دوران ایک لمحہ بھی کسی کو سونے نہیں دیا گیا! زیانگ کا ایک کزن جوڈیلین سے شنگھائی جا رہا تھا، اُسے راستے میں ہی مروا دیا گیا۔ پولیس نے کہا کہ اُس نے خود ریل سے چھلانگ لگا کر اپنی جان دی۔ پندرہ سال سے یہ خاندان انصاف کا منتظر ہے۔

یہ ہے بوزلائی کے ڈیلین کا تاریک پہلو لیکن یہ سب کچھ عوام کی نظروں سے اوجھل تھا۔ وہ تو بہت خوش تھے کہ اُن کے میئر جیسا دوسرا کوئی نہیں اور نہ ہی کسی دوسرے میئر کی بیوی اتنی پرکشش ہے جتنی بوزلائی کی۔

بوزلائی دراصل چین کا صدر بننا چاہتا تھا۔ یہ مقصد پانے کی خاطر وہ محتاط انداز میں میدان سیاست میں ترقی کے زینے طے کر رہا تھا۔ ۲۰۰۴ء میں اُسے وزیر تجارت مقرر کر دیا گیا۔ اب اُسے بین الاقوامی سٹیج پر بھی اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ بو کا یہ عہدہ اُسے یورپی تجارتی کمشنر پیٹر منڈیلسن (Peter Mandelson) کے سامنے مذاکراتی میز پر لے آیا۔ منڈیلسن بتاتا ہے کہ پہلے تو بو مذاکرات کے

لیے انکار کرتا رہا۔ پھر ایک دِن جب بو قاہرہ میں تھا تو اُس نے منڈیلسن کو فون کیا کہ میں اڑتالیس گھنٹوں میں تمہیں ملنا چاہتا ہوں۔ منڈیلسن طیارے بدلتا، خود کو میٹنگ کے لیے تیار کرتا آخر کار وقت پر پہنچ گیا۔

منڈیلسن کافی حد تک آرام دہ محسوس کر رہا تھا کہ چلو اچھا ہوا، بو بات چیت کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ جب منڈیلسن اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ شنگھائی کے مہمان خانے میں پہنچا تو وہاں ایک سو حکام موجود تھے۔ بارہ گھنٹے تک مذاکرات جاری رہے۔ معاہدہ طے پا گیا۔ بو نے فیصلے کا اعلان کرنے صبح چار بجے ایک بہت بڑی پریس کانفرنس بلا لی۔ منڈیلسن کے مطابق صرف بو ہی جانتا تھا کہ وہ کیا اعلان کرنے والا ہے، باقی سب کو اندھیرے میں رکھا گیا۔ بو کے ناروا سلوک کی وجہ سے اس کی شخصیت کھل کر سب کے سامنے آ گئی۔

بو سوچ رہا تھا کہ ایسا وقت دُور نہیں جب وہ چین میں سیاہ و سفید کا مالک بن جائے گا۔ وہ پرُامید تھا کہ چینی کمیونسٹ پارٹی کی طاقتور پالیسی ساز مجلس عاملہ کا رکن بن سکے گا۔ یہ وہ جماعت ہے جہاں مٹھی بھر انسان اپنے ملک کی تقدیر کے اہم فیصلے کرتے ہیں۔

ہر معاملے میں بو کو اپنے بااثر والد کی مدد حاصل تھی۔ جب بو کو اپنے باپ کی بہت زیادہ مدد کی ضرورت پیش آئی تو وہ اٹھانوے برس کی عمر میں دنیائے فانی سے کوچ کر گیا۔ چینی سیاست بھی شاہی خاندانوں اور قبیلوں میں بٹی ہوئی ہے۔ طاقتور باپ کا سایہ سر سے اٹھنے کے بعد بو زلائی نازک پوزیشن پر آ گیا۔ جن لوگوں کا حق چھین کر بو اوپر جا رہا تھا، اب وہ سب اُس کے مدمقابل آ گئے۔ تب بو کو سمجھ آئی کہ اُس کی سیڑھی تو باپ تھا جس کے جاتے ہی مشکلات کے دروازے کھلنے لگے اور اُس کے تمام سیاسی رقیب اکٹھے ہو گئے۔

قتل ہو گیا

جب بو کے خلاف شکایات کا طومار بندھا تو کمیونسٹ پارٹی نے بطور سزا اُسے چونگ چنگ (Chongging) شہر بھیج دیا جو بیجنگ سے ایک ہزار میل دور واقع ہے۔ چونگ چنگ خاندانی دُشمنیوں، قتل و غارت اور جوئے کے اڈوں کی وجہ سے بہت بدنام ہے۔ مگر بو کو اِن تمام باتوں کی پروا نہ تھی۔ اس نئے شہر میں وہ کسی چیز سے خطرہ محسوس کر رہا تھا تو وہ اُس کی بیوی گوکیلائی تھی۔

جب گوکیلائی نے شوہر کو پھنستے دیکھا تبھی وہ اپنی دولت چین سے برطانیہ منتقل کرنے لگی۔ اس کام میں نیل ہیوڈ اپنی مالکہ کا مددگار بن گیا لیکن برطانوی یہ کام انجام دینے کے لیے منہ مانگی رقم چاہتا تھا۔ جب کیلائی نے انکار کیا، تو ہیوڈ نے دھمکی دی کہ وہ چینی حکومت کو اس کے کرتوتوں اور کرپشن سے آگاہ کر دے گا۔ اس دھمکی کے بعد گوکیلائی نے اُسے قتل کروانے کا فیصلہ کر لیا۔

۱۳ نومبر ۲۰۱۱ء کو نیل ہیوڈ گوکیلائی سے ملنے چونگ چنگ پہنچ گیا۔ ہیوڈ کا استقبال کیلائی کے وفادار ملازم، وانگ لی جن نے کیا۔ وانگ اِس حقیقت سے بخوبی واقف تھا کہ لکی ہولی ڈے ہوٹل (Lucky Holiday Hotel) میں کیا ہونے والا ہے جہاں ہیوڈ کو قیام کرنا تھا۔ ۱۳ر نومبر کی شب ہیوڈ کو قتل کر دیا گیا۔ چھبیس گھنٹے بعد پولیس کو اطلاع موصول ہوئی کہ اکتالیس سالہ برطانوی شہری نشہ آور اشیاء کی زیادتی سے مردہ پایا گیا ہے۔

☆☆

جب بو کو چونگ چنگ بھیجا گیا تو یقیناً وہ اِس بات سے بخوبی آگاہ تھا کہ اب اُسے غیر اہم گردانا جا رہا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی اہمیت بڑھانے کی خاطر مختلف قدم اٹھانے لگا۔ اس نے عوام کی زندگیاں بہتر بنانے کے لیے مؤثر اقدامات کیے۔ ان میں سے کچھ قابل ذکر یہ ہیں: بہترین سڑکیں تعمیر کروائیں، سڑکوں اور گلیوں میں روشنیوں کا مناسب انتظام کیا، پورے شہر سے کوڑا کرکٹ اُٹھوایا، لوگوں کی صحت کی طرف بھرپور توجہ

اس کے علاوہ اُن کی تنخواہوں میں بھی اضافہ کیا گیا۔ اِن تمام کاموں کے لیے بو کو یقیناً بہت زیادہ رقم کی ضرورت تھی۔ یہ رقم پانے کی خاطر ہی بو نے کئی اُمرا کو مجرم ثابت کر کے گرفتار کروا دیا۔ ان کی تمام جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔ کسی سے چھوٹا جرم سرزد ہونے پر دس ملین یوآن تک جرمانہ کیا جاتا جبکہ کسی بڑے جرم پر سو ملین وصول کیے جاتے۔

چین میں ایک سیاستدان صرف اسی وقت کسی امیر کبیر شخص کو سزا دینے کی جرأت کر سکتا ہے جب اُسے پولیس کی حمایت حاصل ہو۔ یہ مقصد پانے کے لیے بو نے اپنے جیسے بے رحم اور ظالم آدمی کا انتخاب کیا جس کا نام وانگ لی جن (Wang Lijun) تھا۔ جب کسی کو پھانسی کے تختے پر چڑھایا جاتا تو وانگ لی جن کی موجودگی بہت ضروری ہوتی۔ اسی طرح قیدیوں کے جسمانی اعضا نکالنے، فروخت اور پوسٹ مارٹم کرنے جیسے افعال بھی وانگ لی جن ہی انجام دیتا۔

مقتول کا متجسس دوست

نیل ہیوڈ کی موت پر اس کے دوست، جیمز رچرڈز کو گہرا صدمہ پہنچا۔ وہ تمام حالات کا جائزہ لینے لکی ہولی ڈے ہوٹل پہنچ گیا۔ وہ بتاتا ہے کہ یہ ہوٹل ایک پہاڑی علاقے میں بالکل ویران جگہ پر واقع ہے۔ ہوٹل کے اِرد گرد نباتات کی بہتات ہے۔ رچرڈز نے محسوس کیا کہ ہوٹل کے چوکیدار مضطرب تھے۔ وہ بات کرنے سے گریز کرتے۔ شاید وہ نہیں چاہتے تھے کہ رچرڈز وہاں آئے۔ آخر کار ایک چوکیدار چلایا ’’چلے جائیے! چلے جائیے! چلے جائیے! برائے مہربانی آپ تشریف لے جائیے۔‘‘

پانچ ہفتے بعد لندن میں دریائے ٹیمز کے کنارے بنے

بوزلائی کا کارندہ، وانگ لی جن

ایک چرچ میں نیل ہیوڈ کی موت کے حوالے سے تقریب منعقد ہوئی۔ دو دِن بعد برطانوی قونصل خانے نے بتایا کہ موت کی وجہ واضح نہیں۔ بذریعہ پولیس برطانوی قونصل خانے کو جو معلومات فراہم کی گئیں اُن کے مطابق ہیوڈ کے مرنے کی وجہ نشہ آور اشیاء کا بے جا استعمال تھا جبکہ ہیوڈ کے خاندان والوں کو جو پیغام موصول ہوا اُس کی رُو سے موت کی وجہ دِل کا دورہ تھا۔

جیمز رچرڈز اِن میں سے کسی بھی بات پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ ہیوڈ دُبلا پتلا اور صحت مند آدمی تھا۔ وہ زیادہ شراب نوشی کا بھی عادی نہیں تھا۔ رچرڈز کے شکوک و شبہات اُس وقت بڑھ گئے جب اُسے پتا چلا کہ ہیوڈ کو بغیر پوسٹ مارٹم کے فوراً دفنا دیا گیا۔ رچرڈز نے سوچا کہ اُسے یقیناً قتل کیا گیا ہے۔

رچرڈز کہتا ہے کہ چونگ چنگ میں زندگی معمول کے مطابق رواں دواں تھی۔ پولیس افیسر وانگ لی جن اپنا کام دکھا چکا تھا۔ ہیوڈ کی موت کے حوالے سے تمام شہادتیں اور حقائق غائب کر دیے گئے۔ افسران بالا پر خاموشی کی چادر تنی تھی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا سوائے ایک بڑے سیاستدان،

اُس کی بیوی اور وفادار پولیس افسر کے!

قانون حرکت میں آ گیا

کہتے ہیں کہ خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ ہیوڈ کی موت کے صرف بارہ ہفتے بعد وانگ لی جن اپنی زندگی بچانے کے لیے دَردَر کی ٹھوکریں کھاتا پھرنے لگا۔ آخرکار وہ ایک بوڑھی عورت کا روپ دھار کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ تین سو بیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے قریب ترین واقع امریکی قونصل خانے پہنچا جو چینگ ڈو (Chengdu) میں واقع ہے۔ وانگ لی جن نے امریکیوں سے اپنی زندگی بچانے کی بھیک مانگی اور ایک حیران کن کہانی سنائی کہ گو کیلائی نے ہیوڈ کو قتل کیا ہے اور اب بو اُسے یعنی وانگ لی جن کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ امریکی سفارتکاروں نے محسوس کیا کہ وہ ایک زبردست چینی ڈرامے کا حصہ بننے جا رہے ہیں۔

جب وانگ لی جن کا انکشاف میڈیا میں آیا تو بیجنگ میں ہلچل مچ گئی۔ وہاں واقع بو کے گھر کے نزدیک گلیوں میں پولیس اور لوگوں کا ہجوم بڑھتا چلا گیا۔ سب وانگ کی کہانی کی تصدیق یا تردید چاہتے تھے۔ دوسری طرف امریکی سیکرٹری خارجہ ہیلری کلنٹن (Hillory Clinton) کے لیے اس غدار کے حوالے سے فیصلہ کرنا کسی نازک صورتِ حال سے دوچار ہونے کے مترادف تھا۔ آخرکار ہیلری نے فیصلہ سنایا کہ وانگ سیاسی پناہ کا مستحق نہیں، لہٰذا اُسے بیجنگ بھجوا دیا جائے۔

بیجنگ پہنچتے ہی اُسے خصوصی پولیس نے حراست میں لے لیا۔ اب وانگ کے ذریعے بو اور گو کے حوالے سے تمام حقائق سامنے آنے لگے۔ پہلے تو بو سے چونگ چنگ کا اقتدار واپس لے لیا گیا۔ پھر دس اپریل کا دن بو کے لیے اور مایوسیاں لے آیا جب اُسے کیمونسٹ پارٹی کی ممبرشپ سے ہاتھ دھونے پڑے۔ دوسری طرف گو کو بھی ہیوڈ کے قتل کے شک میں گرفتار کر لیا گیا۔ چین میں ۱۹۸۹ء کے بعد مملکت کا دوسرا بڑا سیاسی بحران جنم لے چکا تھا۔

عدالت میں تین مقدمات زیرِ سماعت آئے۔ اگست ۲۰۱۲ء میں گو کیلائی کا بیان شروع ہوتا تھا۔ جیسے ہی گو کیلائی سے تفتیش کا آغاز ہوا اُس نے اعترافِ جرم کر لیا۔ گو کے بیانات کی روشنی میں ہیوڈ کی موت کچھ یوں واقع ہوئی کہ جیسے ہی ہیوڈ چونگ چنگ پہنچا، ایک گاڑی اُس کا استقبال کرنے ہوائی اڈے پر موجود تھی۔ اس میں گو کا وفادار ملازم سوار تھا۔ جب ہیوڈ ہوٹل پہنچا تو شام ڈھل چکی تھی۔ رات کا اندھیرا ہر سو پھیلا تھا۔

ہیوڈ اور گو نے اکٹھے کھانا کھایا پھر سونے کے کمرے کی طرف چل دیے۔ وہاں ہیوڈ کو شراب پیش کی گئی جس کے پینے سے اُسے قے محسوس ہونے لگی۔ ہیوڈ نے جلدی سے غسل خانے کی راہ لی مگر بے سود! وہ قے روک نہ سکا اور کمرے میں ہی کر دی۔ جب ہیوڈ نے اُٹھنا چاہا تو پھسل کر گر گیا۔ اُسی لمحے گو کیلائی نے اپنے ملازم کو کمرے میں بلوایا جو باہر کھڑا بلاوے کا منتظر تھا۔ گو نے اُس کی مدد سے ہیوڈ کو بستر پر لٹا دیا۔ ہیوڈ بار بار پانی مانگ رہا تھا۔ گو کمرے میں موجود رہی یہاں تک کہ ہیوڈ نے آخری سانس لے لی۔ صرف سات گھنٹے مقدمہ چلا۔ بیرونِ ملک سے آئے صحافیوں کو عدالت میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔

جب گو سے وجہ قتل دریافت کی گئی تو خاتون نے کہا کہ اُس کے اکلوتے بیٹے گواگوا (Guagua) کی زندگی کو ہیوڈ سے خطرات لاحق تھے۔ گواگوا جب پیدا ہوا تو گو اور بو میدانِ سیاست میں بلندیوں کو چھو رہے تھے اور چین دنیا کی ایک عظیم طاقت بننے جا رہا تھا۔ گواگوا کا بچپن چینی امرا کے بچوں کی معیت میں کھیلتے کودتے گزرا۔ گواگوا کی ماں کے خیالات بہت بلند تھے۔ وہ اپنے بیٹے کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچانا چاہتی تھی۔ انھی عزائم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے گو اپنے بیٹے گواگوا کو بارہ برس کی عمر میں برطانیہ لے گئی۔ ہیوڈ نے ایک بار ہال کو بتایا کہ گو کا بیٹا اتنا بگڑا ہوا ہے کہ کسی سے بات

کرنا تو درکنار سلام لینا بھی پسند نہیں کرتا۔ درحقیقت وہ بہت خود پسند، گستاخ اور ضدی ہے۔ ہال نے خود بھی کئی بار گواگوا کو ماں سے جیب خرچ میں اضافہ کروانے پر بدتمیزی کرتے دیکھا۔

یہ ہیوڈ ہی تھا جس نے گواگوا کے داخلے کے لیے گو کی مدد کی تھی۔ اسکول کے بعد گواگوا آکسفورڈ یونیورسٹی چلا گیا۔ اس کی توجہ پڑھائی کی طرف بہت کم تھی جس کی بنا پر اُسے ایک سال کے لیے کالج سے نکال دیا گیا۔ اِس بات کا گواگوا کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ بیشتر وقت وہ فائیو سٹار ہوٹلز میں پایا جاتا۔ گواگوا کے ماں باپ اُس سے دور تھے۔ یہ ہیوڈ ہی تھا جو اُسے ملنے جاتا اور اُس کی ضروریات کا خیال رکھتا۔ پھر ایسی کیا بات تھی جس کی بنا پر گو یہ دعویٰ کر رہی تھی کہ ہیوڈ سے گواگوا کی زندگی کو خطرہ تھا؟ گو نے بتایا کہ ہیوڈ اس سے بھاری رقم کا مطالبہ کر رہا تھا۔ جب گو نے انکار کیا تو ہیوڈ نے گواگوا کو مار دینے کی دھمکی دی۔ اس سلسلے میں گو نے ایک ای۔میل بھی عدالت کو دکھائی۔

گو اور پولیس آفیسر وانگ لی جن نے پہلے منصوبہ بنایا تھا کہ ہیوڈ کو سمگلر ثابت کر کے پولیس مقابلے میں موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے۔ بعد میں گو نے ہیوڈ کو زہر دے کر مارنا زیادہ بہتر سمجھا۔ گو اعترافِ جرم کر چکی تھی۔ اس کی سزائے موت کو کم کر کے عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا! کیا بات یہاں ختم ہو گئی؟ غالباً نہیں......

قتل پر شکوک و شبہات

سابقہ برطانوی سفیر اور تجزیہ نگار کیری براؤن (Kerry Brown) کا کہنا ہے کہ اگر کوئی چینی شہری برطانوی خاتون کے ہاتھوں مارا جاتا تو کیا ایسے ہی نتائج برآمد ہوتے یا معاملہ کچھ اور نوعیت اختیار کرتا؟ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بو نے یہ قتل کروایا جبکہ کچھ کے نزدیک وانگ لی جن اِس کا ذمہ دار ہے۔ لوگ تو یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ جس خاتون کو گو کے روپ میں پیش کیا گیا وہ گو نہیں بلکہ اس کا بہروپ (body double) تھی۔ تجزیہ نگار روٹ وے (Rottawy) نے بھی بڑا زبردست سوال اُٹھایا کہ جب چونگ چنگ سے یہ خبر موصول ہوئی کہ اکتالیس سالہ برطانوی شہری نشے کی زیادتی کی بدولت مردہ حالت میں پایا گیا ہے تو حکومت نے پوسٹ مارٹم کا مطالبہ کیوں نہ کیا؟

بو زلائی اگست ۲۰۱۳ء کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح بہت پُراعتماد دکھائی دیا۔ بو کے اوپر نہ تو ہیوڈ کے قتل کا مقدمہ تھا اور نہ ہی اُس کے قتل کی پردہ پوشی کا...... اس پر غبن، رشوت اور طاقت کے ناجائز استعمال جیسے الزامات تھے۔ اس کے وفادار ملازم وانگ لی جن کو بھی گواہ کے طور پر پیش کیا گیا۔ الزامات کے علاوہ بو کے لیے یہ بات بہت تکلیف دہ تھی!

وانگ لی جن نے ہیوڈ کے قتل کے ایک دن بعد ہونے والی اپنی اور گو کی گفتگو خفیہ طور پر ریکارڈ کر رکھی تھی جو عدالت میں پیش کر دی گئی۔ وانگ کو مار دینے کی کوشش کرنا بو کی سب سے بڑی غلطی ثابت ہوئی۔ اسی غلطی کی وجہ سے وانگ اپنی جان بچانے امریکیوں تک پہنچا تھا۔ اگر بو یہ قدم نہ اُٹھاتا تو دنیا کبھی ہیوڈ کے قتل کی وجہ نہ جان پاتی......

کیری براؤن کا کہنا ہے کہ جب بو قانون کے شکنجے میں پھنس گیا، تو اس کے سیاسی حریف بہت خوش ہوئے۔ تب تک شی جن پنگ (xi jinping) کیمونسٹ پارٹی کے صدر بن چکے تھے۔ چین جیسے ملک میں سیاسی حریفوں کو پچھاڑنے کے لیے اُن کی کمزوریاں ڈھونڈنا بہت ضروری ہے ورنہ آپ کامیاب لیڈر نہیں بن سکتے۔ مستقبل میں بو زلائی صدر شی جن پنگ کی طاقت اور اثر و رسوخ کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتا تھا۔ چناں چہ صدر شی کے حکم پر بو زلائی کے گرد گھیرا تنگ کر دیا گیا۔

دراصل لکی ہولی ڈے ہوٹل میں ہونے والا قتل بو کے لیے رِستا ہوا زخم ثابت ہوا۔ حکومت اس کے قریبی دوست احباب کو

گرفتار کرنے لگی۔ بہت سارے افسر جیل پہنچا دیے گئے۔ اب وانگ کی طرف ہاتھ بڑھے۔ وانگ پناہ کی تلاش میں بو کے پاس چلا گیا۔ پناہ دینے کے بجائے بو نے اُس پر گھونسوں کی برسات کر دی۔ وکیل لی یونگ (Li Zhung) نے بتایا کہ وانگ اُن لوگوں میں سے تھا جنہیں بو اپنے کتے سمجھتا تھا۔ اُس وقت بو سے اقتدار چھن رہا تھا۔ وہ اِن لوگوں کے مسائل میں اُلجھ کر اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا لہٰذا بو نے وانگ کو قتل کروانے کا منصوبہ بنایا جو ناکام رہا اور وہ فرار ہو گیا۔ بو کو تباہ کرنے کے لیے جو منصوبہ بنا اُسے پایہ تکمیل تک پہنچانے میں اٹھارہ مہینے لگے۔ وانگ کو صرف پندرہ برس کی سزا سنائی گئی جبکہ بو کو تمام عمر کے لیے جیل کی ہوا کھانا پڑے گی۔

یہ سچ ہے کہ نیل ہیوڈ کی موت نے صدر شی جن پنگ پر کامیابی کے دروازے کھول دیے۔ بو طاقتور بننے کی راہ میں سب سے بڑا کانٹا تھا۔ جب وہ جیل گیا، تو صدر شی کو موقع مل گیا کہ وہ چینی حکومت میں اپنے اثر و رسوخ میں اضافہ کر سکیں۔ آج وہ اپنے دیس میں نہایت طاقتور شخصیت بن چکے۔

جب رچرڈز معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لیے چونگ چنگ گیا تو تیس لاکھ آبادی والے شہر میں سے کوئی بھی مقتول نیل کے متعلق بات کرنے کو تیار نہ تھا۔ رچرڈز کا پیچھا کیا جا رہا تھا۔ اُس کی گفتگو تک ریکارڈ ہو رہی تھی۔ رچرڈز کے کمپیوٹر میں چونگ چنگ واقعہ کے حوالے سے ڈھیروں ڈھیر ای۔میلز تھیں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اُس کی ہارڈ ڈسک خطرے میں ہے۔ ایک دن جب رچرڈز نے اپنا کمپیوٹر چلایا تو چونگ کوننگ کا فولڈر غائب تھا۔

قارئین، صدر شی جن پنگ کے چین میں خوش آمدید! صدر جن پنگ نے چین میں خود کو صادق اور امین کے طور پر متعارف کروایا ہے۔ جس کا دامن داغدار نہیں اور وہ ملک سے کرپشن کا خاتمہ کر رہا ہے مگر یاد رکھیے، شی کا ماضی بھی بڑا پُراسرار ہے۔

ہم دیکھ چکے کہ اصل کہانی بہت پیچیدہ ہے۔ آپ یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ گوکیلائی اِس قتل کی ذمہ دار تھی بھی یا نہیں؟ آپ کہانی کو اُس وقت تک کوئی اور رنگ نہ دیں جب تک صدر شی کی حکومت ہے۔ بعد میں یہ حقیقت سامنے آسکتی ہے کہ بو اور گو کو جیل یاترا کروانے میں صدر شی کا ہاتھ تھا۔

بو زلائی اور گوکیلائی شادی کے وقت

اورفہ

انبیائے کرام کی سرزمین

اس مقدس ترک شہر میں ایک پاکستانی سماجی رہنما کی انسان دوستی نے شامی مہاجرین کے دل جیت لیے

ڈاکٹر آصف محمود جاہ
(ستارہ امتیاز)

ہم نے نماز عشا اپنے دوست، عاصم وزیر کے ساتھ ادا کی۔ صبح اورفہ کی طرف فلائٹ تھی، اس لیے جلدی سے پیکنگ کر کے سونے کی تیاری کی تاکہ سفر سے پہلے چند گھنٹے کی نیند ہو جائے۔ صبح تین بجے وقار نے دستک دی۔ ٹیکسیاں آئی ہوئی تھیں۔ سامان باہر نکالا۔ وقار نے ٹیکسی میں سامان رکھا اور ائیر پورٹ کی طرف چلے۔ وہیں مسجد میں صبح کی نماز ادا کی۔ نمازیوں نے آگے کھڑے کر دیا۔ باجماعت نماز پڑھانے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اورفہ کی فلائٹ ڈیڑھ گھنٹے کی تھی۔ اکثر ساتھیوں نے سوتے ہوئے وقت گزارا کیونکہ سب تھکے ہوئے تھے۔ اورفہ ائیر پورٹ پہ اترتے ہوئے ہلکی سی خنکی کا احساس ہوا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھلی لگ رہی تھی۔ اورفہ کی فضا میں بڑی نورانیت اور روحانیت محسوس ہوئی کیونکہ اس کے متعلق وقار نے پہلے ہی بتایا تھا کہ یہ انبیاء علیہم السلام کی سرزمین ہے۔

اورفہ میں Hayrat Yardim کے ڈائریکٹر عبداللہ کرد اورفہ ائیر پورٹ کے باہر ہمیں لینے آئے ہوئے تھے۔ نوجوان نوری مجتبیٰ بھی ساتھ ہیں۔ ہنس مکھ چہرے والے نوری انتھک کارکن ہیں۔ ان کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ چھائی رہتی ہے۔ ہر ایک سے آگے بڑھ کے ملتے ہیں۔ لاہور سے آنے والا تمام سامان نوری مجتبیٰ کے نام بھجوائے جا رہے تھے۔ حیرۃ فاؤنڈیشن کے دفتر میں بریفنگ ہوئی۔ ساتھ ہی ناشتا بھی آ گیا۔ نان جیسی روٹی، پنیر، مکھن، زیتون، پھیکا انڈا، مارجرین اور ساتھ بغیر دودھ کی چائے۔ ناشتے کے دوران ہی حکم ملا کہ جلدی کریں کیونکہ ابھی یہاں سے ترکی اور شام کی سرحد پر موجود شامی مہاجرین کے کیمپوں میں جانا ہے۔

شہر کی سڑکوں پر گزرتے ہوئے اندازہ ہوا کہ یہ شہر قدیم اور جدید کا حسین امتزاج ہے۔ آدھا شہر پہاڑوں پر بسا ہوا

ہے۔ اونچے اونچے پہاڑ نظر آتے ہیں جن پر چھوٹے اور بڑے گھر بنے ہوئے ہیں۔ زیادہ تر پہاڑ سرسبز ہیں۔ الروحہ ہوٹل کے قریب سے گزرتے ہوئے پتھروں کے چھوٹے بڑے غار نظر آئے جو حقیقت میں ہزاروں سال پہلے کے ہیں جب لوگ غاروں میں گھر بنا کر رہتے تھے۔ ہزاروں سال پہلے غاروں میں بنے یہ گھر اصلی حالت میں موجود ہیں۔ الروحہ ہوٹل میں سامان رکھا۔ ساتھیوں کا آرام کرنے کا ارادہ تھا مگر ہوٹل میں ابھی کمرے خالی نہ ہوئے تھے کیونکہ چیک آؤٹ اور چیک ان کا وقت بارہ بجے سے دو بجے تک ہوتا ہے اور ہم صبح نو بجے ہی آن ٹپکے تھے۔ ایک دفعہ پھر اورفہ میں موجود کیمپوں کی طرف چلے۔ پیکٹس اور دوسری ریلیف اشیاء دوسری گاڑی میں رکھ لی گئیں تاکہ شامی مہاجرین کے ایک ایک خیمے میں جا کر ان کو تقسیم کیا جائے۔

ریلیف کیمپوں کا دورہ:

اورفہ کی صاف و شفاف سڑکوں اور بلند و بالا فلیٹس اور چند بڑے بڑے گھروں کے درمیان سے سفر کرنے کے ایک گھنٹے بعد حدِ نگاہ تک پھیلے سفید خیموں کی ایک بستی نظر آئی جس میں ۳۰ ہزار سے زیادہ شامی مہاجرین مقیم ہیں۔ اس کیمپ کے قریب جب بھی کوئی گاڑی آتی ہے' بچے اس کا گھیراؤ کر لیتے ہیں۔ اشیائے ضرورت کا تقاضا کرتے ہیں۔ عبداللہ نے اپنی بیوی کو اسماء کے ساتھ کر دیا تھا تاکہ بوریت نہ ہو۔ خاتون تھوڑی بہت انگلش جانتی تھی اس لیے دونوں میں خوب گاڑھی چھنی۔ یہاں آ کر اندازہ ہو گیا کہ شام کی سالہا سال کی خانہ جنگی اور اب اس میں عالمی طاقتوں کی شمولیت کی وجہ سے لاکھوں لوگ متاثر ہوئے ہیں۔ کیمپ میں مقیم ہر خاندان اپنی داستانِ غم سنا رہا تھا۔ کوئی دو سال سے دربدر ہے۔ کسی کو اپنے گھر سے نکلے پانچ سال بیت گئے۔ کسی کا بیٹا شہید ہو گیا۔ کسی کا سہاگ اُجڑ گیا۔ کسی کے خاندان کے چار افراد اور کسی کا پورا خاندان جنگ کی نذر ہو گیا۔

جس کیمپ میں جاتے اداسی، تباہی اور بربادی کی غم ناک داستانیں سننے کو ملتی ہیں لیکن آفرین ہے اس خیمہ بستی کے مکینوں پہ کہ جونہی ان کے خیمے میں داخل ہوئے' انہوں نے خوشی سے اہلاً وسہلاً اور مرحبا کہہ کر استقبال کیا۔ پاکستان کا نام سن کر ان کے چہرے پہ چمک آ گئی۔ پاکستان سے آئے ہوئے تحفے پا کر وہ اور ان کے بچے خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ متاثرین کے خیموں میں جا کر ان میں راشن کے علاوہ نقد رقم بھی تقسیم کی۔

عبداللہ اور روحہ کی کہانی:

اس کیمپ کے پہلے خیمے میں حلب سے آئی ہوئی ایک شامی فیملی مقیم ہے۔ عبداللہ فرانس سے گریجوایٹ انجینئر ہے۔ روحہ نے قانون کی تعلیم حاصل کی ہے۔ ان کے دو پیارے بچے احمد اور آمنہ ہیں۔ روحہ نے انگریزی میں ہمیں اپنے خیمے میں خوش آمدید کہا اور بتایا کہ ہمیں گھر سے دربدر ہوئے دو سال ہونے کو ہیں۔ اس سے پہلے کسی اور جگہ شام کے اندر رہتے رہے اور اب چھ ماہ سے یہاں مقیم ہیں۔ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے روحہ بولی ''ہم یہاں خوش ہیں۔ ضروریات زندگی پوری ہو رہی ہیں۔ کسی قسم کی پریشانی نہیں۔ ہماری مصیبت کے دن ضرور کٹیں گے۔ ہم اس آزمائش سے جلد نکل کر ان شاء اللہ بہت جلد اپنے گھروں کو واپس لوٹیں گے''۔

روحہ کی ایمان افروز باتیں سن کر ایمان تازہ ہو گیا۔ شام کے لوگ ہمت والے ہیں۔ انبیائے کرام کی سرزمین سے ہیں اور صحابہ کرامؓ کی اولاد ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ روحہ کہنے لگی کہ میں اورفہ کے مسلمان ترک بھائیوں اور پاکستان کے لوگوں کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے ہمارا خیال رکھا۔ اسماء نے جاتے جاتے روحہ کی بچی کو ۱۰۰ لیرا دیے تو میاں بیوی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ ہم تو دینے والوں میں سے تھے' یہ کیا سے کیا ہو گیا۔ نامساعد حالات کے باوجود

روحہ اور عبداللہ کے حوصلے بلند ہیں۔ دونوں پرامید ہیں کہ ان شاء اللہ جلد ہی خانہ جنگی ختم ہو گی اور وہ اپنے گھروں کو واپس پلٹیں گے۔

حران کا تاریخی شہر اور ریلیف کیمپ:

شام اور ترکی کی سرحد سے متصل حران کا شہر تاریخی اور مذہبی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ شہر ہزاروں سال پہلے حضرت شعیبؑ کے دور میں آباد ہوا۔ اسی شہر میں حضرت آدمؑ نے سب سے پہلے زرعی زمین کی کاشت کی۔ اس کے علاوہ حران علم و دانش تحقیق اور جستجو کی جگہ ہے۔ اس شہر میں دنیا کی پہلی یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی جس کے آثار آج بھی باقی ہیں۔ حران میں کئی مقامات پر شامی مہاجرین کے لیے چھوٹی چھوٹی خیمہ بستیاں بنائی گئی ہیں۔ ان خیمہ بستیوں میں گھر گھر جا کر راشن پیکٹس اور دوسری اشیاء تقسیم کیں۔ مصیبت زدہ لوگوں میں سامان تقسیم کر کے دلی خوشی ہوئی۔ کچھ مریض، بچے اور بڑے بھی آ گئے ان میں سے کچھ کو ڈاکٹر مشتاق نے چیک کیا اور کچھ کو راقم نے چیک کر کے دوائیں دیں۔

تھر اور حران:

حران صدیوں سے علم و دانش کا مرکز رہا۔ ڈاکٹر وقار نے بتایا کہ مشہور عالم دین، مفسر اور مورخ امام ابن تیمیہ کا تعلق بھی حران سے تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے بھی حران سے ہی مکہ ہجرت کی اور وہاں حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ مل کر بیت اللہ کی تعمیر کی۔ حران میں دنیا کی پہلی یونیورسٹی کے آثار دیکھے۔ ایک جگہ گارے، مٹی اور اینٹوں سے بنی ہوئی گول جھونپڑیوں کی قطاریں دیکھ کر اپنا تھر یاد آ گیا۔ تھر میں ایسی جھونپڑیوں میں بیٹھ کر کئی دفعہ میڈیکل کیمپ کیا۔ باہر سخت گرمی ہوتی تھی اور اندر سکون ہوتا تھا۔ تھر میں ان جھونپڑیوں کو چورا کہتے ہیں۔ تھر جیسی گول مخروطی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ اگرچہ باہر گرمی سے برا حال تھا مگر ان جھونپڑیوں کے اندر جا کر ایسے لگا کہ سردی کے موسم میں آ گئے ہیں۔ ایک قطار میں بنائی گئی ہٹ نما جھونپڑیاں اوپر سے ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔

یہ تمام جھونپڑیاں ڈیڑھ سے دو سو سال تک پرانی ہیں۔ مگر ابھی تک اپنی پوری خوبصورتی اور سادگی کی وجہ سے قائم ہیں اور روزانہ ہزاروں سیاح ان کو دیکھنے آتے ہیں۔ مغربی ممالک کے سینکڑوں سیاح ان جھونپڑیوں کے ایک ایک گوشے کی تصاویر بنانے میں منہمک تھے۔ آثار قدیمہ کے ساتھ لوگ سجے سجائے صحرائی جہاز پر سواری کے مزے اُڑا

قدیم حران کے کھنڈرات

رہے تھے۔ ڈاکٹر وقار اور وقار بادشاہ کا بھی دل للچایا مگر اونٹ کی سواری کا لطف وقار بادشاہ نے اُٹھایا۔

تھوڑی دور آگے جا کر ایک اور اہم زیارت موجود ہے۔ اس میں سلطان صلاح الدین ایوبی اور حضرت نورالدین زنگی کے استاد امام ابوحیرات محوِ استراحت ہیں۔ ان کے مزار پہ لوگ اپنی اپنی مرادیں پوری کروانے کے لیے اللہ سے دعائیں مانگ رہے تھے۔ عبداللہ کرد، جو اورفہ میں Hayrat کے ڈائریکٹر ہیں، خود ہماری گاڑی چلا رہے ہیں اور شامی مہاجرین کے کیمپوں کے علاوہ تاریخی اہمیت کی جگہوں پر بھی لے کر جا رہے ہیں تاکہ شامی متاثرین کے ریلیف کے ساتھ ساتھ مہمانوں کو اورفہ کے تاریخی پس منظر سے بھی آگاہی ہو جائے۔

حیرۃ Yardim کے ریلیف کیمپ میں:

راستے میں حیرۃ Yardim کی طرف سے قائم کیے گئے بڑے ریلیف کیمپ میں پہنچے۔ حیرۃ فاؤنڈیشن کی طرف سے لگایا گیا یہ بڑا ریلیف کیمپ انوکھی طرز کا کیمپ تھا۔ عورتوں اور مردوں کا کیمپ علیحدہ علیحدہ تھا۔ یہاں کھانے پینے کی مختلف اشیاء کے علاوہ مزیدار ڈشیں بھی تیار ہو رہی تھیں۔ اس کے علاوہ کپڑے اور مختلف قسم کی استعمال کی اشیاء موجود تھیں۔ اس کیمپ کے دو مقاصد تھے کہ قریب رہنے والے شامی مہاجرین اپنا کارڈ دکھا کر مفت کھانا کھائیں اور اس کے ساتھ اپنی پسند اور ضرورت کی اشیاء لے جائیں۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ اس سے فنڈز بھی اکٹھے ہوں۔

شامی مہاجرین کے علاوہ مقامی لوگ خوشی سے پیسے دے کر یہاں سے کھا پی رہے تھے کیونکہ انہیں اندازہ تھا کہ ان کی رقم کا بڑا حصہ شامی متاثرین کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ کیمپ میں مختلف یونیورسٹیوں کے پروفیسرز اور اساتذہ نے ہمارا استقبال کیا، اہلاً سہلاً اور مرحبا کہا۔ روایتی ترک کھانوں سے تواضع کی گئی۔ ترکی کی لسی آئرن ہمارے ساتھیوں میں بہت مقبول ہوگئی ہے۔ لسی کے ساتھ انواع و اقسام کی ڈشیں موجود تھیں۔ بھوک سے پیٹ میں پہلے ہی چوہے دوڑ رہے تھے۔ کھانے کی اشیاء دیکھتے ہی کھانے پر ٹوٹ پڑے اور ساری ڈشیں چکھیں۔

گھر کا بنا ہوا کیک ساتھیوں نے مزے سے کھایا۔ خاص کر عاصم وزیر اور راقم کو بہت پسند آیا۔ اس لیے اس پہ ہم دونوں نے خوب ہاتھ صاف کیے۔ ساتھ بیٹھے وقار بادشاہ کا کھانے کی طرف بالکل دھیان نہ تھا۔ اٹھتے اٹھتے کہا کہ یہ تو بھئی آپ نے چائے پی ہے۔ ابھی کھانے کے لیے جانا ہے۔ سب نے احتجاج کیا کہ اب جانے دیں مگر عبداللہ نے ایک چھوٹے سے صاف ستھرے ہوٹل کے سامنے لا کھڑا کیا۔ وقار نے کہا 'یہ تو نہیں ہو سکتا کہ آپ اورفہ آئیں اور بکرے کا روسٹ شدہ جگر نہ کھائیں'۔ کھانا آیا تو کھانا پڑا کیونکہ بہت ہی مزیدار اور لذیذ تھا مگر ایسے کھانے کے ساتھ لسی پی کر سب کو ایسی سُستی چڑھی کہ سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچتے ہی بستروں پر دراز ہو کر نیند کی وادیوں میں کھو گئے۔

دانشوروں اور اہلِ علم سے ملاقات:

ریلیف کیمپ میں بڑے بڑے اہلِ علم، دانشور، یونیورسٹیوں کے پروفیسرز اور ڈاکٹرز موجود تھے۔ یہ تمام لوگ اپنے شعبوں میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں مگر ان سب کا خاصا ہے کہ اپنی دن بھر کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے بعد یہ کچھ گھنٹے Hayrat Yardim کو فی سبیل اللہ دیتے ہیں۔ ان سب اہلِ علم سے مل کر دل بہت خوش ہوا۔ پروفیسر فیصل نے بہت متاثر کیا۔ انہیں پاکستان سے خصوصی لگاؤ ہے۔ کہنے لگے میں پاکستان گیا ہوں اور آپ کی فیصل مسجد اور فیصل آباد میرے ہم نام ہیں۔

پروفیسر فیصل نے باتیں کرتے ہوئے بیان کیا کہ مشہور عالم، مفسر اور ریفارمر بدیع الزماں نورسی بہت بڑے عالم اور دانش ور تھے۔ حُران میں پیدا ہوئے۔ چالیس سال تک

انہیں شہر بدر اور نظر بند رکھا گیا۔ مرنے سے تین دن پہلے خواب میں انہیں حضرت ابراہیمؑ کی زیارت ہوئی اور انہیں کہا گیا "بدیع الزماں ہمارے پاس اورفہ آجاؤ"۔ حضرت بدیع الزماں نے خواب دیکھ کر کہا کہ اب میرا آخری وقت ہے۔ مجھے اورفہ پہنچا دو۔ ساتھیوں نے اورفہ پہنچایا۔ اورفہ میں تین دن رہنے کے بعد خالقِ حقیقی جا ملے۔ بدیع الزماں نورسی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی پسماندگی کی تین بڑی وجوہ جہالت، غربت اور آپس کا اختلاف ہیں۔ جہالت کو علم سے ختم کر کے ترقی ہو سکتی ہے۔

علم کی روشنی پھیلنے سے ہی جہالت ختم ہو سکتی ہے۔ تعلیم بھی ایسی ہونی چاہیے جو مذہبی بھی ہو اور جدید دنیا کی ضروریات کو بھی پورا کرے۔ غربت کو مسلمان ممالک میں کاٹیج انڈسٹری کو فروغ دے کر ختم کیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کی تباہی کی بڑی وجہ آپس کے اختلافات ہیں۔ اسلام کی بنیادی باتوں کو اپنا کر اختلاف ختم کیا جا سکتا ہے۔ علم کی طاقت اور روشنی سے جہالت کے اندھیروں سے نجات مل سکتی ہے۔ علم کے فروغ سے جہالت کے ساتھ غربت بھی ختم ہوگی کیونکہ جہاں تعلیم ہوگی۔ نئی ملازمتیں پیدا ہوں گی۔ اس وجہ سے غربت بھی کم ہوگی۔ اس وقت مسلمانوں کے پستی کی طرف جانے کی بنیاد آپس کے اختلاف ہیں۔ ان اختلافات کو ختم کر کے اور اسلام کی بنیادی باتوں کو اپنا کر مسلمان آج بھی ترقی کر سکتے ہیں۔

تھکے ہارے کیمپوں سے لوٹے تھے، اس لیے آتے ہی سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں محبوس ہو گئے۔ کل رات سے جاگتے رہنے کی وجہ سے جسم تھکن سے چور تھے۔ آرام دہ بستر اور نہانے کے لیے گرم پانی، بدن کو قرار دینے کے لیے اور کیا چاہیے۔ گرم پانی سے غسل کر کے ساتھی لیٹتے ہی لمبی تان کے سو گئے۔

اورفہ اور حضرت ابراہیمؑ:

مغرب کی نماز ہوٹل الروحہ کی مسجد میں اذان دے کر ہوٹل کے ایک ساتھی کے ساتھ باجماعت ادا کی۔ اس کے بعد ہوٹل سے باہر نکلے۔ سامنے اونچائی پر دو مینار چمکتے دمکتے نظر آ رہے تھے جن کے بارے میں مشہور ہے بلکہ تحقیق سے یہ ثابت ہے کہ ہزاروں سال پہلے حضرت ابراہیمؑ کو نمرود کے حکم پر اسی جگہ سے آگ میں پھینکا گیا۔ میں اسی جگہ پر موجود ہوں۔ سورہ انبیاء کی تلاوت کرتے ہوئے قرآن پاک کی آیت "قل نار کونی بردا و سلما علی ابراھیم" پر پہنچا ہوں۔ تاریخ کا پہیہ گھوم رہا ہے۔ میں دورِ ابراہیمی میں پہنچ گیا ہوں۔

حضرت ابراہیمؑ لوگوں کو اللہ کی طرف بلا رہے ہیں۔ اللہ کو ایک ماننے کا کہہ رہے ہیں۔ صبح شام ایک ہی پیغام دے رہے ہیں۔ اللہ کو ایک مان لو۔ یہ بت تمہیں کچھ نہیں دیتے۔ ایک دن اورفہ میں ان کے بت خانے میں جا کر بت توڑ دیتے ہیں اور آخر میں کلہاڑا بڑے بت کے کندھے پر رکھ دیتے ہیں۔ لوگ آتے ہیں۔ ان کے ذہن میں یہی آتا ہے کہ یہ کام ابراہیمؑ ہی کا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو بلایا جاتا ہے۔ ہمارے بتوں کو کس نے توڑا۔ وہ کہتے ہیں 'اپنے بڑے بت سے پوچھو۔ تو وہ کہنے لگے یہ تو نہ سنتا ہے نہ بولتا ہے۔ ابراہیمؑ کو موقع مل گیا کہ میں بھی تو یہی کہتا ہوں کہ اللہ سب کچھ کرنے والا ہے۔ ان پتھر کے بتوں کو چھوڑ کر اللہ کی طرف رجوع کر لو۔

نمرود کی سربراہی میں یہی فیصلہ ہوتا ہے کہ اب ابراہیمؑ سے جان چھڑانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہمارے معبودوں کو توڑنے کے الزام میں اسے آگ میں پھینک دیا جائے۔ میں چشمِ تصور سے دیکھ رہا ہوں کہ آگ کا الاؤ روشن کیا جا رہا ہے۔ اس کے لیے بڑی لکڑیاں اور جلانے والا دوسرا ایندھن لایا جاتا ہے۔ آگ کا الاؤ اتنا بڑھ جاتا ہے کہ اب اس کے اردگرد اور اوپر کوئی زندہ چیز نہیں گزر پاتی۔

حضرت ابراہیمؑ لائے جاتے ہیں۔ آگ اتنی زیادہ دہک رہی ہے کہ نمرود کے اہلکار سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ ابراہیمؑ کو

کیسے آگ میں پھینکیں۔ بدبخت ہر زن سامنے آتا اور کہتا ہے کہ میں نے منجنیق بنائی ہے۔ اس سے ابراہیمؑ کو آگ میں پھینک دیا جائے۔ ابراہیمؑ جو اللہ کے سچے پیغمبر ہیں' آگ کو دیکھ کر ذرا نہیں گھبرائے۔ اللہ کو یاد کر رہے ہیں۔ ان کا اللہ پہ تکیہ ہے۔ فرشتے مدد کے لیے آتے ہیں۔ انہیں واپس بھجوا دیتے ہیں کہ اللہ کے حکم سے آئے ہو تو خوش آمدید ورنہ ضرورت نہیں۔ سارے مناظر چشم تصور میں میرے سامنے ہیں۔ خدائی کا دعویٰ کرنے والا نمرود آج بہت خوش ہے کہ حقیقی دشمن سے نجات مل جائے گی۔ انسان چالیں کرتا ہے مگر اللہ کی اپنی حکمت عملی ہے۔ جونہی ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکا گیا اللہ کی طرف سے بجھنے کا نہیں بلکہ یہ حکم دیا گیا: ''قل نار کونی برداً و سلماء ابراھیم'' (سورہ انبیاء)

میں چشم تصور سے دیکھ رہا ہوں کہ اچانک آگ کی تپش ماند پڑ گئی ہے۔ امرا اور وزرا تو جشن منانے کی تیاریوں میں تھے۔ ان کی خوشیوں پر اوس پڑ گئی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اس امتحان میں بھی سرخرو ہو گئے ہیں۔ میں مسجد کی کھڑکی سے بیٹھے سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ قل نار کونی سلاماً علی ابراھیم پر آ کے میں بار بار رک جاتا ہوں۔ میری نظر میں وہ ایک عظیم انسان تھے۔ جو ہر آزمائش میں کامیاب ہوئے۔ گھنٹے سے انہی خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک اذان کی آواز نے مجھے واپس اورفہ میں پہنچا دیا۔ میں نے اس مقام پہ دو نفل پڑھے۔ حضرت ابراہیمؑ کی قربانیوں کو یاد کیا۔ اللہ سے ان کے درجے بلند کرنے کی دعا کی۔

اذان کے ساتھ ہی مسجد میں نمازیوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ نوجوان اور ہلکی سی ڈاڑھی والے امام صاحب بھی آ گئے۔ میں گزشتہ ایک گھنٹے سے بیٹھا ہزاروں سال پہلے کی تاریخ کے صفحات پلٹ رہا تھا۔ استنبول کی طرح اورفہ میں بھی لوگ بڑے اہتمام سے سنتیں ادا کرتے ہیں۔ نوجوان امام نے بہترین تلفظ کے ساتھ لحن داؤدی میں تلاوت کی۔ عشا کی نماز ان کی اقتداء میں ادا کی۔ اورفہ میں وہ مقام جہاں سے حضرت ابراہیمؑ کو منجنیق کے ذریعے آگ میں پھینکا گیا وہ کافی اونچائی پر ہے اور جس جگہ آپ گرے وہ جگہ گلِ گلزار بن گئی' وہ خاصی نیچے ہے۔ اس لیے اندازہ ہوتا ہے کہ کئی میٹر لمبی اور اونچی آگ جلائی گئی تھی۔ مسجد کے بالکل سامنے وہ جھیل گزر رہی ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ آگ میں گرے تھے۔ آپ کے گرتے ہی اللہ کے حکم سے آگ گل گلزار بن گئی۔ زمین سے پانی نکل آیا جو آج بھی جھیل کی شکل میں موجود ہے۔

رقص درویش کا نظارہ:

عبداللہ کردنے صبح ہی بتا دیا تھا کہ آج کے دن یعنی ۳۰ اپریل کو اورفہ میں صابر پیغمبر کے نام سے مشہور حضرت ایوبؑ کو خراج تحسین پیش کرنے کا دن منایا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں شہر میں مختلف جگہوں پر مختلف تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔ مسجد سے نکلتے ہی باہر اسٹیڈیم نما پارک میں ایک زبردست تقریب جاری تھی۔ لوگ سامنے کرسیوں پر اور اوپر سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اسٹیج پر دو تین لوگ تھے۔ تقریب کے آغاز میں قرآن کی تلاوت کی گئی۔ درود و سلام کے ساتھ مولانا رومی کے اشعار بھی پڑھے گئے۔ درمیان میں دس بارہ درویش سامنے لمبی لمبی ٹوپیاں اور لمبے لمبے ایک جیسے چوغے پہنے ترتیب سے کھڑے ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ وہ پتھر کے مجسمے ہیں اور ایک جگہ ساکت و جامد کھڑے ہیں۔ ان کے درمیان دائرے کے مرکز میں چوغا اور لمبی ٹوپی پہنے ایک بزرگ درویش کھڑے ہیں۔

جونہی ان کی طرف سے اشارہ ہوتا ہے سارے درویش ایک خاص ترتیب سے گھومنا شروع کر دیتے ہیں۔ آہستہ آہستہ اور بتدریج درویشوں کا رقص تیز ہوتا جاتا ہے۔ مولانا روم کے دیوانوں کا رقص درویش جاری ہے۔ درویش وجد میں آ رہے ہیں۔ ان پہ بے خودی کا نشہ چڑھ گیا ہے۔ شروع میں

وہ ساکت و جامد کھڑے تھے۔ لگتا تھا کہ شاید ان کی سانسیں بھی بند ہیں۔ انہوں نے شروع میں پہنے کالے چوغے اتار دیے ہیں۔ اب وہ سفید کپڑوں ہی میں ملبوس گھومتے جا رہے ہیں اور مست ہوتے جا رہے ہیں۔

انہیں گھومتا دیکھ کر حاضرین بھی مست ہو رہے ہیں۔ خوش ہو رہے ہیں۔ گھومنے والوں کے ساتھ گھوم کر مست والست ہوتے جا رہے ہیں۔ درویش ایک خاص ردھم کے ساتھ منہمک اور مستغرق ہو کر گھومتے ہیں تو ناظرین پہ بھی عجیب سا نشہ طاری ہو جاتا ہے۔ درویشوں کے ساتھ رقص میں شامل ہونے کو دل مچلتا ہے۔ چند بچے اپنی سیٹوں پر کھڑے ہو کر رقص درویش کی مشق کر رہے ہیں۔ ناظرین بڑے انہماک کے ساتھ رقص درویش میں گم ہیں۔ شروع میں بیٹھنے کی جگہ نہ ملی مگر اب ایک ترک خاندان نے مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیا ہے اور میں ان کے ساتھ بیٹھا رقص درویش کا مزہ لے رہا ہوں۔

اورفہ کی سہانی صبح:

فجر کا وقت ہے۔ اورفہ اجلا اجلا نکھرا نکھرا نظر آ رہا ہے۔ اگرچہ سورج ابھی نکلا نہیں۔ موسم میں ہلکی سی خنکی ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ سامنے اورفہ کے پہاڑ ہیں۔ پہاڑوں پر بنے ہوئے مکانات اور مساجد بھی نظر آ رہی ہیں۔ پہاڑوں کے اوپر ایک پرانی قلعہ نما عمارت کے ساتھ دو بڑے بڑے ستون نظر آ رہے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں سے ابراہیمؑ خلیل اللہ کو آگ میں پھینکا گیا تھا۔ سڑک سے گزر کر حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ سے منسوب کمپلیکس میں داخل ہوا۔

باہر سے تو صحیح اندازہ نہیں ہو رہا تھا مگر اندر انوارات کی بارش ہو رہی ہے۔ مسجد کے سامنے جو جھیل بنی ہوئی ہے' اصل میں یہ وہی جگہ ہے جہاں بہت بڑی آگ جلائی گئی۔ کئی دن آگ جلتی رہی اور پھر اوپر پہاڑوں سے حضرت ابراہیمؑ کو منجنیق کے ذریعے آگ میں پھینکا گیا تو اللہ کے حکم سے وہ

رسول اللہ ﷺ کی مبارک دُعا

''حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا فرمائی: اے اللہ! عمر بن الخطاب کے ذریعے اسلام کو عزت عطا فرما۔ اس حدیث کو امام حاکم نے روایت کیا ہے اور کہا یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔''

(المستدرک، المعجم الکبیر)

آگ نہ صرف بجھ گئی بلکہ حضرت ابراہیمؑ کے لیے گل گلزار بن گئی۔ زمین سے پانی نکل آیا اور آگ جلانے والا ایندھن مچھلیاں بن گیا۔

جھیل میں صاف و شفاف پانی ہے جس میں رنگ برنگ چھوٹی بڑی مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ لوگ ان مچھلیوں کو خوراک ڈالتے ہیں۔ میں اس جگہ عقیدتاً بیٹھ گیا اور اس دور کو یاد کرنے لگا جب بت پرستوں نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں جلانے کا ارادہ کیا کیونکہ وہ ان کے بتوں اور جھوٹے خداؤں کو نہیں مانتے تھے اور ایک اللہ کی طرف بلاتے تھے۔ اللہ نے اپنے حکم سے آگ کو گل گلزار بنا کر ابراہیمؑ کے لیے سلامتی والی بنا دیا۔ نمرود کا نام ونشان مٹ گیا لیکن خلیلؑ اللہ کا نام باقی ہے۔ ان پہ کروڑوں درود وسلام ہو۔ صبح سویرے بھی سینکڑوں زائرین اس جگہ کی زیارت کرنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔

مولدالنبی کی زیارت اور ذکر کی مجلس:

مزید آگے ایک اور مسجد نظر آئی جہاں ایک تختی پر مولد النبیؑ خلیل اللہ لکھا ہوا تھا۔ یہاں حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کی پیدائش ہوئی۔ غار کے ساتھ ملحقہ ایک کمرے میں اشراق سے پہلے ذکر اور درود وسلام کی محفل جاری تھی۔ اس بابرکت محفل میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ یہاں سارے لوگ بڑے خشوع وخضوع سے ذکر اذکار میں مشغول تھے۔ سکینت نازل ہو رہی تھی۔ ایسی محفلوں کو اللہ بہت پسند کرتے ہیں اور ان کا تذکرہ تفاخر کے ساتھ فرشتوں کی محفل میں کرتے ہیں۔ دعا کے بعد اشراق کے نفل پڑھے۔ امام صاحب اور دوسرے دوستوں سے مصافحہ ہوا۔

ترکی کے لوگ پاکستان سے محبت کرتے ہیں۔ جب بھی ملیں محبت اور عقیدت سے ملتے ہیں۔ مسجد کے چھوٹے دروازے سے اندر جا کر اس مقدس غار کی زیارت کی جہاں روایات کے مطابق تقریباً ۲۰۰۰ قبل مسیح حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ اس جگہ بیٹھ کر عجیب سی کیفیت ہوگئی۔ چاروں طرف خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ نورانیت اور روحانیت کا گہرا احساس ہوا۔ اس مقام پر دو نفل ادا کیے۔ چشمے سے پانی پیا۔

سبیل ابراہیم خلیلؑ اللہ:

غار سے باہر نکلے تو باہر ایک ترک باباجی نے اشارے سے بلایا اور کہا' سامنے جاؤ ابراہیم خلیلؑ اللہ کی سبیل سے گرما گرم سوپ نوش کرو۔ سوپ کے لیے پیسے نکالنے لگا تو سوپ دینے والا بولا کہ پاکستانی کاردیش' یہ فی سبیل اللہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے نام کی سبیل ہے جو ہمیشہ مہمانوں کا اکرام کرتے تھے اور اس وقت تک کھانا نہ کھاتے جب تک ان کے ساتھ مہمان شامل نہ ہو۔ گرما گرم سوپ پیو۔ ڈبل روٹی کھاؤ اور مزے اُڑاؤ۔ صبح سویرے گرم گرم سوپ اور ڈبل روٹی کے چند ٹکڑے کھا کر طبیعت سیر ہوگئی اور بہت مزا آیا۔

(جاری ہے)

طوبیٰ احسن

بے نام اندیشے

ایک بے بس ماں کی دلدوز کہانی' اُسے اپنے سینے میں کڑا راز سنبھال کر کئی سال گزارنے پڑے

''امی، مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔'' ردا بے حد پریشان تھی۔

''کیوں؟ کس بات سے؟'' امی کے ہاتھ سبزی کاٹتے بناتے رک گئے۔

''بس وہ......'' ردا ایک لمحے کے لیے چپ سی ہوگئی۔ سر جھکا کر اپنی گود میں لیٹے کاشان کو دیکھنے لگی۔

''کیا بات ہے ردا؟ کیوں پریشان کر رہی ہو مجھے؟'' امی خفا ہو کر بولیں۔

''امی' میں سوچتی ہوں کہ جب کاشان بڑا ہوگا اور اس پر ساری حقیقت کھل جائے گی تو کہیں......''

ردا کی آواز ہلکی ہوگئی اور پلکیں نم۔

''کیا ہوگا پھر؟'' امی بے چین ہو کر بولیں۔

''یہ مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا۔'' ردا کی آواز بھرا گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

امی بے حد پریشان ہو گئیں۔ سبزی کی ٹوکری ایک طرف رکھ ردا کے قریب آ گئیں اور اس کو گلے سے لگا کر چپ کروانے لگیں ''ردا کیا ہو گیا بیٹا؟ کیوں الٹے سیدھے وہم دل میں پال کر بیٹھ جاتی ہو اور پھر سوچتی رہتی ہو۔ ایسا کیوں ہوگا؟ کون بتائے گا کاشان کو ساری حقیقت؟''

''فرحان بتائیں گے اور کون''۔ ردا چیخ کر بولی۔

''فرحان؟؟'' امی حیرت زدہ رہ گئیں۔

''کیا ہو گیا؟'' بسمہ اندر داخل ہوئی تو کمرے کا ماحول دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ ابھی تو ردا آئی تھی اپنے سسرال سے۔ ہنس بول رہی تھی' سب سے مل رہی تھی اور اب آنکھوں میں

آنسو؟؟؟

ردا کے چیخنے سے ننھے کاشان کی بھی نیند خراب ہوگئی اور وہ رونے لگا۔

"حد ہوگئی۔" امی، ردا کے چیخنے، بسمہ کے اچانک اندر آنے اور کاشان کے کچی نیند سے اُٹھ جانے پر برہم ہوگئیں۔ "بسمہ، تم ذرا بہن کے لیے پانی لاؤ۔" وہ چھوٹی بیٹی سے مخاطب ہوئیں۔

ردا اب کاشان کو تھپک تھپک کر سلاتے ہوئے خود بھی سسکیاں لے رہی تھی۔

"ردا تم نے تو مجھے عاجز کر دیا ہے۔ ہر وقت کی پریشانیاں اور الجھنیں۔ تم تو رائی کا پہاڑ بنانے میں ماہر ہوگئی ہو۔ کیا ہوگیا بیٹے؟" غصے سے بولتے بولتے امی کا لہجہ کچھ نرم ہوگیا۔ "تم پہلے تو ایسی نہ تھیں۔"

"آپ نے بھی مجھے نہ جانے کن فضول اور بیوقوف لوگوں کے درمیان بھیج دیا ہے۔" وہ روتے روتے بولی اور دیکھ لیجیے گا کہ مزید چند برسوں میں، میں ضرور پاگل ہوجاؤں گی۔"

اتنے میں بسمہ پانی لے آئی۔ "چلو تم پانی پیو۔"

"امی ہوا کیا آپی کو؟" بسمہ بے چاری پریشان ہو رہی تھی۔

"کچھ نہیں ہوا، تمہاری آپی دراصل بے وقوف ہیں۔" امی نے کہا۔ "تم ایسا کرو بیٹا کاشان کو اندر لے جاؤ اور کمرے میں سلا دو۔"

"ٹھیک ہے۔" بسمہ بڑے بھائیوں کے بچوں کو سنبھالنے کی عادی تھی لہٰذا نہایت آرام سے کاشان کو ردا کی گود سے لے کر چلی گئی۔

"اب تسلی سے بتاؤ بات کیا ہے۔" بسمہ اندر گئی تو امی ردا سے مخاطب ہوئیں۔

"فرحان کہہ رہے تھے کہ جب کاشان بڑا ہوا تو ہم اس کو ساری حقیقت سے آگاہ کر دیں گے۔"

"لیکن اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟" امی پریشان ہو گئیں۔

"آپ کو معلوم ہے نا، وہ اپنے آگے کسی کی نہیں سنتے۔ جو ان کے خیال میں صحیح ہو، وہی کرتے ہیں۔ مانتے کب ہیں وہ میری کوئی بات۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" امی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اب تک وہ اپنے داماد کے مزاج کو بخوبی جان گئی تھیں۔

"اچھا چلو بتا دیں گے تو پھر کیا ہوگا؟ ابھی سے سوچ کر رونے کا کیا فائدہ۔ ابھی تو اس کے بڑے ہونے میں بہت وقت ہے۔ چھ ماہ کا بچہ ہے، ابھی سے پریشان ہونے کا کیا فائدہ؟ ویسے بھی ذہنی طور پر ہر بات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اللہ سے مدد مانگو۔ سب سے بڑا سہارا تو وہی ہے، اسی پر بھروسہ رکھو۔ ابھی جو اچھا وقت میسر ہے اسے تو ہنسی خوشی گزار لو۔"

❁❁

"آج نسیم صاحب کے سب سے چھوٹے بیٹے کی شادی ہے۔ ذرا جلد تیار ہو جانا۔ دیر ہوئی تو برا لگے گا۔" فرحان دفتر جانے کے لیے تیاری کرتا ہوا بولا۔

"جی اچھا۔"

فرحان چلا گیا تو ردا نے سوچا کہ پہلے شادی کے کپڑے استری کر لوں۔ ابھی کاشان سویا ہوا ہے، اٹھا تو استری کرنے نہیں دے گا۔

کاشان اب دو سال کا ہو گیا تھا۔ بہت چلبلا اور شرارتی تھا۔

"آج شادی میں جانا ہے؟" نفیسہ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔

"جی امی۔" ردا نے جواب دیا۔ "آپ چلیں گی نا؟"

"نہیں میں نہیں جاؤں گی کیونکہ آج فائزہ اور حبا آئیں گی۔ تم کھانا بنا لینا۔"

"جی امی۔" پھر ردا نے پوچھا "کیا کیا پکے گا؟"

"بریانی اور سالن تو پکے گا ہی، فائزہ کا فون آیا تھا، کہہ رہی تھی کہ بھابھی سے کہیے گا کہ کباب ضرور بنائیں۔ بہت دل چاہ رہا ہے۔" نفیسہ بیگم تو یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

"اُف!" ردا پریشان ہوگئی۔ مارے غصے کے جلتے بھنتے تیزی سے استری کرنے لگی۔

"رات کو شادی میں جانا ہے اور میں ان کی بیٹیوں کے لیے کھانے بناتی پھروں۔"

سارا دن کھانا بنانے میں گزر گیا۔ بیچ بیچ میں کاشان بھی بہت تنگ کر رہا تھا۔ وہ اسے نفیسہ بیگم کی گود میں دے کر آتی لیکن اُن سے نہ سنبھلتا، نہ ہی چپ ہوتا۔ گھبرا کر وہ اُسے ردا کو واپس دے دیتیں۔ "بھئی ہم سے نہیں سنبھالا جاتا یہ بچہ۔" وہ بیزاری سے کہتیں اور ردا بے چاری سر پیٹ لیتی۔

❁❁

"ردا! تم گئی تھیں نسیم صاحب کے بیٹے کی شادی میں؟"

"جی۔" ردا نے جواب دیا

"کیا ہوا سب سے ملاقات ہوئی ہوگی۔" وہ اس سے پوچھ رہی تھیں۔

"ہاں۔" ردا نے سر ہلایا۔ "صفیہ باجی کے بچوں سے ملاقات ہوئی۔ سب کاشان کو چوم رہے تھے، پیار کر رہے تھے۔ بہت خوش ہوئے سب کاشان سے مل کر۔ راحت خالہ نے تو مجھے دیر تک گلے سے لگائے رکھا۔"

"شکر ہے۔" امی نے اطمینان کی سانس بھری "میں تو ڈر رہی تھی کہ کہیں کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔"

"ڈر تو مجھے بھی لگ رہا تھا لیکن کچھ نہیں ہوا، سب بہت عزت سے ملے۔"

❁❁

"امی!" کاشان روتا ہوا آیا۔

"کیا ہوا بیٹا؟ ردا گھبرا گئی۔" "کیوں رو رہے ہو؟"

"دادی گندی ہیں۔" وہ سسکیاں لے رہا تھا۔

"بُری بات بیٹا! بڑوں کو اس طرح نہیں کہتے۔" ردا نے اُسے پیار سے سمجھایا۔

"دادی نے سب کو ٹافی دی مجھے نہیں دی، کہنے لگیں ختم ہو گئیں۔"

"اچھا میں دوں گی ٹافی اپنے بیٹے کو، آپ روؤ نہیں۔" ردا اسے پیار کرنے لگی۔

ردا ہمیشہ محسوس کرتی تھی کہ نفیسہ بیگم کا رویہ کاشان کے ساتھ ایسا نہیں جیسا باقی بچوں کے ساتھ ہے لیکن وہ کیا کرتی، کیسے سمجھاتی انہیں؟ "میں فرحان سے شکایت کروں گی۔" اس نے دل میں سوچا اور کاشان کو پیار کرنے لگی۔ رات کو فرحان گھر آئے تو اس نے بات کی۔ وہ تو الٹا ردا کو ہی مورد الزام ٹھہرانے لگے "تم بے وقوف ہو۔ اب میں اتنی معمولی سی بات پر امی سے جھگڑنے بیٹھ جاؤں۔"

"فرحان، وہ ہمارے بچے اور دوسرے بچوں میں فرق کرتی ہیں۔"

"ایسا نہیں ہے۔" فرحان نے سختی سے جواب دیا۔ "یہ تمہارا وہم ہے اور کچھ نہیں۔ ویسے بھی تم تو سدا کی وہمی ہو۔"

فرحان یہ کہہ کر اُٹھ گئے اور ردا دیر تک آنسو پیتی رہی۔

آہستہ آہستہ کاشان نے بھی سمجھوتہ کر لیا۔ یہ بات صاف تھی کہ نفیسہ بیگم کاشان سے کافی بے اعتنائی برتتیں۔ دوسرے بیٹے، نعمان جو دوسری منزل میں رہائش پزیر تھے، ان کے تینوں بچوں کو بے حد چاہتیں۔ حبا اور فائزہ کے بچوں سے بھی اُن کو بے حد محبت تھی جبکہ کاشان ہمیشہ ان کی ڈانٹ اور ناراضی کا شکار بنا رہتا۔ ردا ایسے موقعوں پر دل مسوس کر رہ جاتی کہ فرحان سے شکایت کرنا بے کار تھا۔ وہ الٹا اسے ہی مورد الزام ٹھہراتے کہ یہ معمولی سی بات ہے۔

ہفتہ، پندرہ دن بعد حبا اور فائزہ دونوں مل کر آجاتیں۔

اوپری منزل سے ردا کی دیورانی شاہانہ بھی اتر آتیں۔ تب ردا کچن میں کھڑی ڈھیروں کھانے بناتی رہتی۔ حبا اور فرائزہ تو مہمان ہوتیں، نفیسہ بیگم بوڑھی جان اور شاہانہ کے اوپر تلے چھوٹے چھوٹے چار بچے تھے۔ صرف ردا ہی فارغ ہوتی کہ اس کا ایک اکلوتا ہی بیٹا تھا جو دس سال کا ہو چکا تھا لہٰذا اس کی ہی ذمہ داری تھی کہ وہ مہمان داری کرے۔ اب تو اس کو بھی عادت ہوگئی تھی لیکن کاشان کا وہ کیا کرتی جسے نجانے کیسے یہ سوچ چمٹ گئی کہ میری امی کیا نوکرانی ہیں؟ سب آرام کرتے ہیں اور میری امی کام کرتی رہتی ہیں۔ ردا اس کے آگے ہاتھ جوڑتی اور کہتی ''خاموش ہو جاؤ بیٹا' خبردار جو تم نے اب ایک لفظ بھی کہا۔ کیوں میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہو؟ سب مجھ سے ناراض ہو جائیں گے۔ مجھے چین سے جی لینے دو۔''

''نہیں امی۔'' وہ خفا ہوتا۔ ''سب کو آپ کی مدد کرنی چاہیے۔ یہ کیا کہ سب آرام کر رہے ہیں اور آپ صبح سے کچن میں کھڑی رہیں۔''

''اچھا تم اپنے کمرے میں جاؤ اور کتابیں لے کر بیٹھو۔ خبردار جو تم کچن میں آئے۔''

ایک دن ایسا ہوا کہ پہلے تو کاشان ردا پر بگڑتا رہا پھر رات کو فرحان آئے تو ان سے بھی اس ہی موضوع پر بات کرنے لگا۔ ردا کچن صاف کر رہی تھی۔ سب جا چکے تھے۔ جب وہ کمرے میں آئی تو فرحان غصّے سے آگ بگولا ہو رہے تھے اور کاشان کے چہرے پر تناؤ تھا۔

''کیا ہوا؟؟'' وہ گھبرا سی گئی۔

''یہ تربیت کی ہے تم نے اس لڑکے کی؟ ہر بات میں دخل دے رہا ہے۔ یہ کون ہوتا ہے اس معاملے میں بولنے والا؟'' فرحان دھاڑے۔

''آخر بات کیا ہے؟؟'' ردا نے فرحان کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ انہوں نے فوراً اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''اب انجان بن رہی ہو؟ تمہاری زبان ہے اس کے منہ میں جو یہ میرے آگے زبان چلا رہا ہے۔ اگر تم میری بہنوں کے آنے پر ایک دو کھانے بنا لیتی ہو تو اسے کیا پریشانی ہے؟ آئندہ کوئی ضرورت نہیں کچن میں گھسنے کی۔ میں بازار سے لے آؤں گا کھانا۔ نہ پکانا تم۔ یہ صاجزادے اتنا بڑھ چڑھ کر بول رہے ہیں' تم نے ہی اکسایا ہے۔ اس کو شہہ دے رہی ہو۔ میرے مقابلے پر لا رہی تم اس کو۔'' وہ زور زور سے چلّا رہے تھے۔ کاشان کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ ردا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ''نفیسہ بیگم نہ آجائیں اس طرف پھر تو اور مصیبت ہو جائے گی''۔ یہ سوچ کر اس نے جلدی سے اُٹھ کر دروازہ بند کیا۔

''میں معافی مانگتی ہوں آپ سے۔'' ردا، فرحان کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگی ''بچہ ہے، ناسمجھ ہے معاف کر دیجیے۔''

''یہ بچہ نہیں ہے'' وہ آنکھیں نکال کر بولے۔ ''اب یہ بڑا ہو چکا۔''

''آپ غصّہ تھوک دیجیے ان شاء اللہ آپ کو آئندہ کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

فرحان تو بک جھک کر سو گئے۔ ردا دوسرے کمرے میں لے جا کر کاشان کو سمجھانے لگی کہ وہ اپنی پڑھائی پر توجہ دے اور ان معاملات میں نہ الجھے۔

جیسے جیسے کاشان بڑا ہو رہا تھا' گھر کے معاملات گمبھیر ہو گئے۔ سب کا بدستور آنا جانا رہا' ساتھ ساتھ نفیسہ بیگم کا فرمائشی پروگرام بھی جاری رہتا۔ کبھی ان کا دل چاہتا کہ سارے خاندان میں پنچیری بانٹی جائے۔ وہ تو فرمائش کر کے ایک طرف ہو جاتیں۔ فرحان بازار سے سارا سامان لا رہے ہیں اور ردا سارا سارا دن کھڑے ہو کر پنچیری بنا رہی ہے۔ پھر ڈبوں میں بھر کر سارے خاندان میں بانٹی جاتی۔

کبھی لڈو بن رہے ہیں اور کبھی ڈھیروں کباب۔ اس

وقت کاشان کی نفیسہ بیگم سے ضرور کھٹ پٹ ہوتی۔ ''میری ماں آپ کی نوکر نہیں ہیں'' وہ کہتا ''آپ خود تو سارا دن لیٹی رہتی ہیں اور میری امی سے کام کرواتی ہیں۔'' پھر وہ کاشان کی فرحان سے شکایت کرتیں۔ فرحان بیٹے کو ڈانٹتے، ساتھ ساتھ ردا بھی لپیٹ میں آجاتی۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ پریشانیاں اور مسائل بھی بڑھ رہے تھے۔ اکثر تو تکار ہو جاتی۔ دوسری طرف بقیہ پوتوں اور نواسوں سے نفیسہ بیگم کا رویہ بہت اچھا تھا۔ سب سے ہی محبت اور شفقت بھرا سلوک کرتیں۔

ایک دن تو حد ہی ہوگئی۔ شام کے چار بج رہے تھے۔ کاشان ابھی ابھی کوچنگ سینٹر سے لوٹا تھا۔ ردا اس کو کھانا دے کر آرام کرنے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ نفیسہ بیگم نے کاشان سے کہا ''جاؤ اپنی امّی سے کہو کہ چائے بنا لیں۔''

''وہ سو رہی ہیں۔'' اس کے انداز میں بے زاری تھی۔

''تو اُٹھا دو اُن کو۔''

''دادی' وہ ابھی ابھی لیٹی ہیں۔ میں نہیں اُٹھاؤں گا''۔ وہ پندرہ سال کا ہو گیا تھا۔ اُٹھان بھی اس کی اچھی تھی۔ اب نفیسہ بیگم اس سے ذرا دب جاتی تھیں لیکن اس وقت نہ جانے کیوں ان کو غصّہ آگیا۔

''میں بتاؤں تمہاری حقیقت تم کو''۔ وہ ہاتھ نچا کر بولیں۔ شور سے ردا کی آنکھ کھل گئی۔ وہ گھبرا کر باہر نکل آئی۔

''نہیں امّی نہیں آپ چپ رہیے گا۔ کچھ نہ بولیے گا۔'' ردا کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور چہرہ سفید ہو رہا تھا۔

''نہیں! آج تو میں اسے اس کی اصلیت بتا کر ہی دم لوں گی۔'' وہ غصے سے آگ بگولا ہو رہی تھیں۔ ''یہ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔''

''اللہ کے واسطے امی خاموش ہو جائیں۔'' ردا ہاتھ جوڑ کر بولی۔

''نہیں' آج میں بتا دوں گی اس کی حقیقت کیا ہے۔'' وہ چلائیں۔

''آپ کیا بتائیں گی؟ مجھے سب کچھ پتا ہے۔'' وہ چٹان کی طرح سینہ تان کر کھڑا تھا۔

''کیا۔'' ردا کا چہرہ فق ہو گیا۔

''میں سب جانتا ہوں۔'' اس کا لہجہ مضبوط اور ہموار تھا۔ ''آپ میری امّی کو ڈرائیں نہیں۔''

''کیا جانتے ہو تم؟'' ردا کی آواز کانپ رہی تھی اور ہاتھ لرز رہے تھے۔

''آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں''۔ وہ ردا کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بولا۔ ''میں آپ کو اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ ہمیشہ آپ کے ساتھ رہوں گا۔ مجھے سب معلوم ہے۔''

پندرہ سال سے جس وقت کے آنے سے وہ ڈرتی رہی تھی، وہ بالآخر آ پہنچا تھا۔ ردا تیورا کر گری اور بے ہوش ہوگئی۔

ہوش آیا تو وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ کمرے میں ہلکی سی روشنی تھی۔ وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ آنکھیں دوبارہ بند کر کے وہ پندرہ سال پہلے والے واقعے کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ رات یاد آئی جب بستر پر لیٹی فرحان کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ کچھ سامان لینے قریبی دکان تک گئے تھے۔ ''نہ جانے ان کو اتنی دیر کیوں ہوگئی؟'' وہ پریشان ہونے لگی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ شکر ہے کہ فرحان آگئے۔

''اتنی دیر کیوں ہوگئی؟'' اس نے پوچھا۔

''نسیم صاحب کی بیٹی کا انتقال ہو گیا ہے۔''

''اوہ! وہ تو.....'' ردا کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''ہاں اُن کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔ بچے کی پیدائش کے فوراً بعد ان کا انتقال ہو گیا۔''

''اوہ!.....'' ردا کے منہ سے افسوس کے ساتھ نکلا۔

''صبح تم چلی جانا تعزیت کے لیے۔''

''جی''۔ ردا صفیہ آپا کے بارے میں سوچنے لگی۔ نسیم صاحب نہ صرف اُن کے اہل محلہ بلکہ دور کے رشتے دار بھی تھے۔ ان کی ایک ہی بیٹی تھی' صفیہ جن کے پہلے ہی پانچ بچے

تھے۔ وہ بھی چھوٹے چھوٹے اور اس چھٹے بچے کی ولادت کے موقع پر ان کا انتقال ہوگیا۔

واہ مولا واہ! تیرے بھید تو ہی جانے کہ اس چھوٹے سے بچے کو ماں سے جدا کرنے میں تیری کیا مصلحت ہے؟ اور میں جو شادی کے سات سال گزرنے کے باوجود بن اولاد کے ہوں۔ ساس کے طعنے سنتی ہوں، میاں کے آگے جھکی رہتی اور ہر وقت ڈرتی رہتی ہوں کہ کہیں دوسری شادی نہ کر بیٹھیں، اس میں تیری کیا حکمت ہے؟

نیند تھی کہ آنکھوں سے کوسوں دور۔ صفیہ آپا کی شکل بار بار آنکھوں کے آگے آرہی تھی۔ وہ بیچاری اوپر تلے بچے ہونے سے کافی پریشان رہتی تھیں۔ حالات بھی اچھے نہیں تھے۔ ان کی امی راحت خالہ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ صفیہ آپا کی ساس بھی حیات نہیں، اب بچوں کو کون سنبھالے گا؟ ایک طرف صفیہ آپا کا خیال آرہا تھا دوسری طرف اپنی خالی گود کا خیال بھی دل میں اداسی پیدا کر رہا تھا۔ ردا کئی بار امید سے ہوئی لیکن دنیا میں آنے سے پہلے ہی خوشی اس کے دامن سے ہاتھ چھڑا کر اسے تنہا کر گئی۔

اللہ تعالیٰ کے بھید وہی جانتا ہے اور اس کی قدرت سے کچھ بعید نہیں۔ ردا تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کی قائل ہی ہوگئی۔ صفیہ آپا کا چھوٹا سا بیٹا کاشان آج اس کی گود میں آکر زندگی کو خوشیوں اور مسرتوں سے ہمکنار کر رہا تھا۔ اس کی ساس نفیسہ بیگم نے خود راحت خالہ سے بات کی اور فرحان کو بھی انہوں نے ہی قائل کیا۔

جب کاشان چھوٹا سا تھا تو ایک دن فرحان کہنے لگے ''جب یہ بڑا ہوگا تو ہم بتادیں گے کہ یہ ہماری اولاد نہیں بلکہ ہم نے اسے گود لیا ہے۔''

کیا سخاوت ہے!!!

سمندر کے جو قریب آئے اسے موتی دیتا ہے، جو اس سے دور ہیں، ان کے لیے بادل بھیج دیتا ہے۔

تب سے ردا پریشان رہتی تھی۔ ہر وقت اس پر یہ خوف سوار رہتا کہ جب کاشان کو پتا چلے گا کہ وہ اس کی اصلی ماں نہیں تو وہ اسے چھوڑ کر چلا جائے گا اور وہ اکیلی رہ جائے گی۔

نفیسہ بیگم نے خود ہی ساری کوشش کی اور انہی کی بدولت ردا کی ویران زندگی میں کاشان بہار کا جھونکا بن کر آیا۔ نہ جانے کیوں وہ کاشان کے لیے اپنا ظرف وسیع نہیں کر سکیں اور نہ ہی اس سے ویسی محبت کر سکیں جیسے کہ باقی اولاد کے بچوں سے کرتی تھیں۔ ردا مستقل سوچ کے تانے بانوں میں الجھی ہوئی تھی کہ کاشان اندر داخل ہوا۔

''کیا ہوا امّی! کیا سوچ رہی ہیں؟ کیسی طبیعت ہے؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' ردا نے اٹھنے کی کوشش کی۔

''لیٹی رہیے۔ ابھی آپ کی طبیعت بہتر نہیں، آپ کو آرام کرنا چاہیے۔''

''ہاں بیٹا لیٹی رہو۔'' نفیسہ بیگم کی مہربان اور نرم آواز سن کر ردا کی حیرت سے آنکھیں کھل گئیں۔ ''کاموں کی فکر نہ کرنا، سب ہو جائے گا۔ تم آرام کرو۔''

نفیسہ بیگم تو چلی گئیں، ردا کی کھلی حیرت زدہ آنکھیں دیکھ کر کاشان کو ہنسی آگئی۔

''دیکھا میرا کمال۔'' کاشان نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''اب کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر کسی نے آپ کو کچھ کہا نا تو میں آپ کو یہاں سے لے کر کہیں اور چلا جاؤں گا۔ پھر بیٹھے رہیں یہ لوگ! اور ہاں مجھے سب معلوم ہے۔ میں نسیم صاحب اور راحت خالہ سے ملتا رہتا ہوں۔''

''اوہ!'' ردا کو ایسا لگا جیسے اس کے سر سے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔ سکون اور اطمینان سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

خصوصی رپورٹ

امن پسند مذہب کا پرچار کرنے والے بدھ مت کے کچھ پیروکاروں نے انسانیت کا سر شرم سے جھکنے پر مجبور کر دیا

بے وطن روہنگیا مسلمان

کہاں جائیں؟

عافیہ مقبول جہانگیر

پندرہ

لاکھ کی آبادی پر مشتمل روہنگیا مسلمانوں کو اگر دنیا کی سب سے مظلوم اقلیت کے طور پر دیکھا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ دنیا کے بیشتر ممالک کو یہ معلوم ہی نہیں کہ برما کے مسلمان کون ہیں اور اُنہیں کیوں ظلم کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ برما کی حکومت روہنگیا مسلمانوں کو اپنے ملک کا شہری تسلیم کرنے سے یہ کہتے ہوئے انکار کرتی ہے کہ ان لوگوں کے آباء واجداد برطانوی دور سے پہلے یہاں آباد نہیں تھے جبکہ روہنگیا مسلمانوں کا کہنا ہے کہ ان کے آباء واجداد یہاں صدیوں سے آباد ہیں۔

روہنگیا کا پس منظر.....ایک جائزہ

پچاس ہزار مربع کلومیٹر پر مشتمل روہنگیا نسل کے مسلمانوں کا اکثریتی علاقہ اراکان، برما اور بنگلہ دیش کی سرحدوں پر واقع ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں خلیفہ ہارون الرشید کے دور میں کچھ مسلمان تاجر خلیج بنگال کے کنارے اس علاقے میں پہنچے تو اُنہوں نے تجارت کے ساتھ ساتھ یہاں دینِ حق کا پیغام بھی پھیلانا شروع کیا اور اسلام کی فطری تعلیمات سے متاثر ہوکر وہاں کی کثیر آبادی نے اسلام قبول کرلیا۔ ۱۴۳۰ء میں اراکان کے بادشاہ نے بھی اسلام قبول کرلیا اور سلطان سلیمان شاہ نے یہاں ایک اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس ملک پر ساڑھے تین صدیوں تک مسلمانوں کی حکومت رہی۔ یہاں بے شمار مساجد، مدارس اور جامعات قائم کی گئیں۔ اراکان کی کرنسی پر لا الہ الا اللہ مکمل کلمہ کندہ ہوتا تھا۔

اُنیسویں صدی عیسوی تک روہنگیا مسلمان سکون سے زندگی گزارتے رہے لیکن جب ۱۸۲۶ء میں برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس خطے پر اپنا قبضہ جمایا تو اُنہوں نے Divide & Rule کے تحت مقامی راخینی نسل کے بدھوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ ۱۹۳۷ء میں برما نے انگریزوں سے آزادی حاصل کرلی۔ ۲۸ مارچ ۱۹۴۲ء کو یہاں پہلا فساد ہوا اور مسلمانوں کے قتل عام کا آغاز کر دیا گیا۔ چالیس دن کے اندر تقریباً ڈیڑھ لاکھ مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا اور نہتے مسلمان بنگال میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے۔

۱۹۴۷ء میں جب برطانیہ برصغیر سے رخصت ہوا تو برمی مسلمانوں کی مشکلات میں مزید اضافہ ہوگیا اور اس سال پھر مسلم کُش فسادات دہرائے گئے۔ ۱۹۴۹ء سے اب تک مسلمانوں کے خلاف چودہ فوجی آپریشن ہو چکے، جن میں مارچ ۱۹۷۸ء کا آپریشن سب سے بدترین تھا۔ اس آپریشن میں مسلمانوں کی درجنوں بستیاں جلا کر خاکستر کر دی گئیں۔ تقریباً بیس ہزار مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا۔ لاتعداد مسلمانوں کو جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔ اور اس آپریشن کے نتیجے میں تین لاکھ روہنگیا مسلمان بنگلہ دیش میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ ہزاروں برمی مسلمانوں نے پاکستان، ملائیشیا اور سعودی عرب میں پناہ لی، جبکہ مسلمانوں کے خالی کردہ علاقوں پر راخینی بدھ قابض ہوتے چلے گئے۔ مسلمان علاقے کا نام بھی اراکان سے بدل کر راخائن کر دیا گیا۔

بدھ مت کے پیروکار اشین وارتھو کی حقیقت

میانمار میں بدھ بھکشوؤں کے راہنما کے طور پر مشہور اشین وارتھو کے بارے میں عام خیال ہے کہ یہ مسلمانوں سے نفرت کرتا اور ان کے خلاف بدھوؤں کے ذہن و دل میں نفرت بھرتا ہے۔ ۱۹۶۸ء میں پیدا ہونے

والے اشین وارتھو نے ۱۴ سال کی عمر میں اسکول کی تعلیم کو خیر باد کہہ دیا اور راہب بن گیا۔ اس کے بارے میں عالمی چرچا تب شروع ہوئی جب ۲۰۰۱ء میں اس نے قوم پرست اور مسلم مخالف تنظیم ۹۶۹ کے ساتھ شمولیت اختیار کی۔ ۹۶۹ ان کے سدارتھ بدھ مت کا دیا ہوا عدد ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اکیسویں صدی میں بدھ مت کا خاتمہ ہوجائے گا اور چونکہ ۷۸۶ کا عدد اکیس بنتا ہے، لہٰذا مسلمان ۷۸۶ اس لیے استعمال کرتے ہیں تاکہ اکیسویں صدی میں بدھ مت کو ختم کیا جاسکے۔ میانمار میں اس تنظیم کو بنیاد پرست تصور کیا جاتا ہے۔

۲۰۰۳ء میں اشین وارتھو کو پچیس سال قید کی سزا سنائی گئی لیکن ۲۰۱۰ء میں محض ۹ سال بعد ہی اسے رہا کر دیا گیا۔ میانمار کی حکومت اس کے مسلمان دشمن عزائم جاننے کے باوجود اس کی سرپرستی کرتی رہی اور اس کی نفرت انگیز تقریریں باقاعدہ نشر ہوتی رہی ہیں۔ جولائی ۲۰۱۳ء میں ٹائمز میگزین نے اس کی تصویر نمایاں انداز میں چھاپی جس کی سرخی پر لکھا تھا "بدھ مت میں دہشت گردی کا چہرہ"۔ اشین وارتھو ایسی کئی ریلیوں کی سربراہی بھی کر چکا جن کا مطالبہ یہ تھا کہ روہنگیا مسلمانوں کو کسی دوسرے ملک بھیج دیا جائے۔ روہنگیا کے مسلمانوں کے پاس نہ کوئی شہریت ہے نہ انہیں کسی قسم کی شناخت حاصل ہے۔

بدھ مت مذہب اپنے امن پسند عقائد کی وجہ سے جانا جاتا رہا ہے یہاں تک کہ بدھ بت کے پیروکاروں کو سختی سے ہدایت کی جاتی کہ وہ چلتے وقت اپنے پاؤں بھی زمین پر زور سے نہ رکھیں تاکہ زمینی کیڑے مکوڑے کچلے نہ جائیں لیکن جس قسم کی روحانی و مذہبی تعلیم اشین وارتھو نے اپنے پیروکاروں کو دی وہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ اس کا اور اس کی تنظیم کا عقیدہ ہے کہ مسلمان جہاں دیکھو اسے مارو اور صرف مارو ہی نہیں بلکہ پرتشدد طریقے سے مارو۔ اس ضمن میں وہ اپنی تنظیم کو مختلف غیر انسانی اور اذیت ناک نت نئے طریقے بھی سکھاتا اور بتلاتا ہے۔ جان لینے کے یہ طریقے انسانیت سے اس قدر گرے ہوئے ہیں کہ سوچ کر ہی روح کانپ اُٹھتی ہے۔

زمین میں آدھا دھڑ دبا دیا جاتا اور باقی کھلے حصے کو آگ لگا دی جاتی۔ بچوں کے جسم کے مختلف حصوں جیسے سر، چہرہ اور پیٹ وغیرہ پر یہ برمی جانور تب تک جوتوں سے وزن ڈال کر کھڑے رہتے ہیں جب تک بچے کی جان سسک سسک کر نہ نکل جائے۔ نوجوانوں کو برہنہ کر کے درختوں سے باندھا جاتا اور باری باری ان کے اعضاء ہاتھ، پاؤں بازو کاٹے جاتے ہیں اور جب وہ تڑپ تڑپ کر ادھ موئے ہو جاتے ہیں تب ان کی گردن کاٹ دی جاتی ہے۔ پانی میں ڈبونے، عورتوں کی آبروریزی کرنے اور سر کچلنے کے طریقے اس کے علاوہ ہیں جنہیں احاطہ تحریر میں لاتے ہوئے بھی ہاتھ لرز جاتے ہیں۔ یہ وحشیانہ انداز کسی بھی ملک کسی بھی مذہب میں مسلمان دشمن عناصر نے نہ اپنایا ہوگا جو برما کے مسلمانوں پر قیامت کی صورت نازل کیا جارہا ہے۔

آج صورتحال یہ ہے کہ یہاں لاؤڈ اسپیکر سے اذان ممنوع قرار دے دی جا چکی۔ مسلمانوں کو نماز پڑھنے سے زبردستی روکا جارہا۔ ذبیحہ اور قربانی پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ مسلمان سرکاری اجازت کے بغیر نہ شادی کر سکتے ہیں نہ بچے پیدا کر سکتے ہیں۔ اُنہیں ایک شہر سے دوسرے شہر جانے کے لیے بھی اجازت نامے کی ضرورت ہوتی ہے۔

۱۹۸۲ء میں برمی حکومت نے ایک نیا قانون پاس کیا تھا جس کے تحت روہنگیا مسلمانوں کو برمی شہریت سے بھی محروم کر دیا گیا۔ برمی حکومت چاہتی ہے کہ یہ مسلمان اپنے علاقے کو چھوڑ کر بنگلہ دیش کی سرزمین کو اپنا لیں۔ جبکہ بنگلہ دیش اُنہیں اپنی سرزمین پر برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ یوں یہ مظلوم مسلمان برمی اور بنگلہ دیشی حکومتوں کے درمیان شٹل کاک بن کر رہ چکے۔

برما میں ہونے والے حالیہ مسلم کش فسادات کی شروعات ۲۰۱۲ء میں ہوئی جس کے نتیجے میں مزید تیس ہزار مسلمان اپنے علاقوں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو کر سرحدی دریا عبور کر کے بنگلہ دیش کی طرف آنے لگے۔ پہلی چند کشتیوں میں سوار افراد کو تو بنگلہ دیشی کنارے پر اُترنے دیا گیا لیکن جب ان کی تعداد بڑھنے لگی تو بنگلہ دیشی حکام اُنہیں واپس بھیجنے لگے اور یہ واپس بھیجنا گویا انہیں موت کے منہ میں دھکیلنے کے مترادف تھا۔ حالیہ فسادات میں ہزاروں مسلمانوں کو شہید کیا جا چکا ہے۔ اسّی ہزار مسلمان بے گھر ہو کر سڑکوں پر اپنی جان بچاتے بھٹک رہے یا رنگون کے نواح میں کیمپوں میں بے یار و مددگار پڑے ہیں، جبکہ بنگلہ دیش میں بھی پہلے سے پناہ گزین اور تازہ مہاجرین لاکھوں کی تعداد میں مخدوش کیمپوں میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

آج برمی مسلمانوں کی مجموعی پندرہ لاکھ آبادی میں سے تین لاکھ بنگلہ دیش میں، دو لاکھ پاکستان میں اور چوبیس ہزار ملائیشیا میں آباد ہیں۔ برما کے سابق صدر تھین سین (Thein Sein) نے اقوام متحدہ سے مطالبہ کیا تھا کہ برما میں موجود دس لاکھ مسلمانوں کو دوسرے ملکوں میں بسایا جائے جبکہ ''دوسرا'' کوئی ملک انہیں اپنانے کو تیار نہیں۔

سوشل میڈیا کا کردار

پاکستان میں برمی مسلمانوں کی نسل کشی کی اطلاعات آنے کے باوجود پاکستانی طاقتور باخبر میڈیا بھی اس طرح خاموش رہا جیسے اُسے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ معمولی باتوں کو بھی بڑھا چڑھا کر بریکنگ نیوز دینے والے چینلز کو نجانے کیوں برمی مسلمانوں کی حالتِ زار پر کوئی خبر نہ تو بریکنگ لگی نہ ہی اتنی اہم کہ اسے عوام تک پہنچایا جا سکے۔ یہاں تک کہ کوئی بھی عالمی ادارہ اس بارے میں کوئی خبر دینے کو تیار نہ تھا، مگر اسلامی دنیا میں مسلمانوں نے سوشل میڈیا کے ذریعے اس قتلِ عام کی تصاویر کو پھیلانا شروع کر دیا۔ جس کے بعد الیکٹرانک میڈیا حرکت میں آیا اور روہنگیا مسلمانوں کی صورت حال سامنے آنے لگی۔

بھارتی سوشل میڈیا نے اس کا بھرپور منفی فائدہ اُٹھایا اور سوشل میڈیا پر برما اور شام کی پرانی تصاویر، حتیٰ کہ کچھ ایسے مناظر کی تصاویر بھی روہنگیا مسلمانوں کے نام سے منسوب کر کے اپ لوڈ کرنی شروع کر دیں جو کسی قدرتی آفت جیسے سیلاب، زلزلے وغیرہ کی وجہ سے تشویشناک اور قابلِ رحم تھیں۔ مقصد صرف پاکستان کو اشتعال دلانا تھا تاکہ وہ آپے سے باہر ہو کر کوئی ایسا جذباتی قدم اُٹھا لے جس سے پاکستان اور چین کے تعلقات مشکوک ہو جائیں اور چین پاکستان کے خلاف ہو جائے کیونکہ میانمار چین ہی کی ایک کالونی کہلاتی ہے اور وہاں تقریباً سولہ لاکھ چینی بھی آباد ہیں۔ ہمارے نوجوانوں نے سوچے سمجھے بغیر ان تصاویر کو اندھا دھند فیس بک اور ٹویٹر پر شیئر کرنا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں عوام اپنے ہی ملک اور فوج کے خلاف بغض اور غصہ پھیلنے لگا کہ آخر پاکستان کیوں سو رہا ہے اور پاک فوج برما کیوں نہیں جاتی۔

پاکستان اور میانمار کی صورتحال

جہاں پوری دنیا میانمار میں ہونے والے کھلے عام وحشی اور درندگی کی حدیں پار کرنے والے مظالم پر تشویش کا اظہار کر رہی ہے وہیں پاکستان بھی مسلمانوں پر ڈھائی جانے والی اس قیامت کی بھرپور مذمت کر رہا ہے اور اپنی عوام کے اشتعال کا سامنا بھی کر رہا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر پاکستان اب تک خاموش تماشائی کیوں بنا ہوا ہے اور وہ عملی طور پر برما کے مسلمانوں کے لیے کوئی قدم کیوں نہیں اُٹھا رہا؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ وقت جوش سے نہیں ہوش سے کام لینے کا ہے۔ پاکستان کی افواج پر انگلی اٹھانے اور ان کو بے حس کہنے سے پہلے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ آخر وہ کون سے عوامل ہیں جو پاکستان کی راہ میں حائل ہیں۔ ہم عجیب قوم ہیں۔ جب بھی وطنِ عزیز میں

کوئی آفت یا مصیبت آتی ہے چاہے وہ زلزلہ ہو یا سیلاب کی تباہ کاریاں یا کوئی اور مسئلہ، یہ ہماری فوج ہی ہے جو سب سے پہلے مدد کو پہنچتی ہے اور ہم اسی کو برا بھلا کہہ رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ برما جا کر وہاں کے مسلمانوں کی فوجی سطح پر مدد کرنا ممکن نہیں۔ اس کے لیے چند حقائق مدنظر رکھنا ہوں گے۔ پاکستان کے پاس جے-۱۷ کی جگہ اگر امریکا کا بنایا ہوا ففتھ جینریشن ایف-۳۵ بھی ہو تو بھی پاک فوج کے لیے میانمار جا کر حملہ کرنا ممکن نہیں، کیونکہ پاکستان اور میانمار کے درمیان اٹھائیس سو کلومیٹر کا فاصلہ ہے اور ایف-۳۵ کی بھی حد صرف بائیس سو کلومیٹر ہے۔ یعنی درمیان میں اسے بھی ری فلنگ کی ضرورت پڑے گی۔ اس کے علاوہ اس کو میانمار پہنچنے کے لیے بھارت اور بنگلہ دیش کی فضائی حدود استعمال کرنا ہوں گی اور ری فلنگ کے لیے ان ممالک میں اترنا ہوگا جو کہ ظاہر ہے ناممکن بات ہے۔ نا ہی بھارت اس کی اجازت دے گا اور بنگلہ دیش تو پہلے ہی ہاتھ جھاڑ چکا۔ دوسرا راستہ جو پاکستان ایئر فورس چین کے راستے میانمار میں جا سکتی ہے اس پر اگر نظر ڈالی جائے تو چین بھی کبھی اس بات پر راضی نہیں ہوگا کیونکہ میانمار میں چینی نسل کو گن کی بھی تقریباً سولہ لاکھ کی اقلیت موجود ہے اور ظاہر ہے چین اپنے شہریوں کی حفاظت کو مدنظر رکھتے ہوئے پاکستان کو ایسا کبھی نہیں کرنے دے گا۔ تیسری آپشن پاکستان نیوی بحری راستے کے ذریعے کیوں نہیں جاتی کے سلسلے میں حقائق یہ ہیں کہ اس کے لیے بھی پاک آرمی کو بھارت اور بنگلہ دیش کی بحری حدود استعمال کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ پاک فوج کو ان ممالک کی افواج کا سامنا کرنا ہوگا اور اس طرح ایک نئی جنگی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔ وہ بھی ایک ملک میانمار ہی نہیں بلکہ ایک ساتھ تین ملکوں کے ساتھ۔

پاکستان کو پہلے ہی مختلف معاشی و اقتصادی بحران درپیش ہیں۔ ایسے حالات میں کوئی جذباتی قدم اُٹھانا عقلمندی نہ ہوگی۔ ہماری فوج پہلے ہی مشرقی اور مغربی دشمنوں کے خلاف پاکستان کا دفاع کرنے میں مصروف ہے ساتھ ہی پاک آرمی پاکستان کے اندر ان تحریکوں اور دہشت گردوں سے لڑنے میں مصروف ہے جو چاہتے ہیں کہ پاکستان میں دہشت گردی کا ماحول قائم رہے۔ ہاں البتہ پاکستان طبی و مالی طور پر روہنگیا کے مسلمانوں کی مدد کرتا آیا ہے اور کرتا رہے گا۔

سوشل میڈیا اور ویب سائٹس پر بہت سی جذباتی اور اشتعال انگیز پوسٹس دیکھنے میں آ رہی ہیں جن میں کہا جا رہا ہے کہ پاکستانی قوم میں غیرت نام کی کوئی چیز نہیں اور پاکستان بے حسی کا ثبوت دے رہا ہے۔ ان کا تمام زور صرف اس بات پر ہے کہ بس کچھ بھی ہو کیسے بھی ہو پاکستان کی فوج کو ہر حال میں میانمار جانا چاہیے۔ انہیں لگتا ہے کہ بس پاکستان کی فوج کے چلے جانے سے ہی تمام مسائل چٹکی بجاتے حل ہو جائیں گے تو یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ ایسی پوسٹس شیئر کرنے والے نوجوان شاید نہیں جانتے کہ پاکستان نے میانمار کے مسلمانوں کی مدد کے لیے اُس وقت پانچ ملین ڈالر دیے تھے جب کسی نے بھی ان کی مدد نہیں کی تھی اور تب پوری دنیا کے میڈیا نے اسے کوَر کیا تھا۔ ترکی کی ایک ویب سائٹ نے ۶/ جون ۲۰۱۷ء کو اس خبر کو شیئر بھی کیا تھا جس میں پاکستان نے اتنی خطیر رقم میانمار کے مسلمانوں کو امداد کی مد میں پیش کی تھی۔

عملی طور پر آگے آنے والا ملک ترکی

اسلامی دنیا میں مسلم عوام کے احتجاج کے بعد کچھ مسلم حکومتوں نے بھی اس ظلم اور بربریت پر اپنی تشویش ظاہر کی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ترکی نے اپنا قدم آگے بڑھایا اور ترکی کی خاتونِ اوّل محترمہ امینہ اردوان نے برما کا دورہ کر کے مظلوم مسلمانوں کی خبر گیری اور امداد کی۔ ترکی کے صدر اور مسلمانوں کے آئیڈیل حکمران طیب اردوان کی غصیلی اور پرجوش تقریر اور روہنگیا مسلمانوں کے خلاف جاری اس خونی کھیل کو بند کرنے کی وارننگ میں جہاں ایران نے ترکی کا ساتھ دیا وہیں مسلمانوں کے دشمن ملک

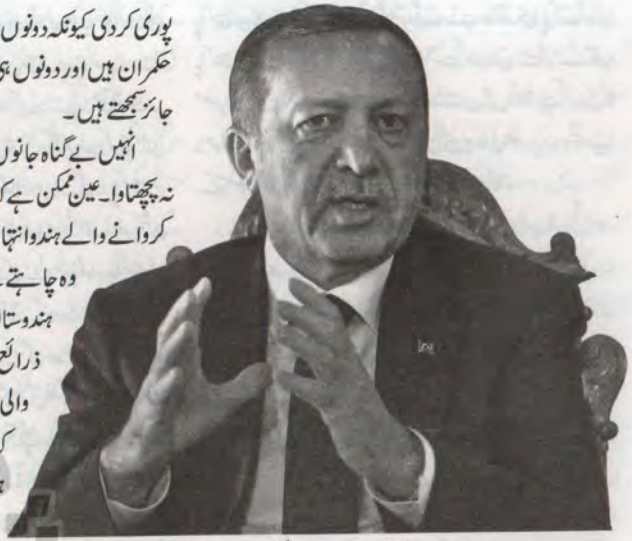

پوری کردی کیونکہ دونوں ہی اپنے اپنے ممالک کے انتہا پسند حکمران ہیں اور دونوں ہی روہنگیا مسلمانوں کی نسل کشی کو جائز سمجھتے ہیں۔

انہیں بے گناہ جانوں کے ضیاع پر قطعاً کوئی افسوس ہے نہ پچھتاوا۔ عین ممکن ہے کہ بھارت میں گجرات کے فسادات کروانے والے ہندو انتہا پسندوں کی انا کو تسکین ہی ملی ہو کہ جو وہ چاہتے تھے وہ سب برما میں بھی ہو رہا۔

ہندوستان ٹائمز کی ویب سائٹ پر موجود ذرائع کے مطابق حال ہی میں ہونے والی اس ملاقات کے بعد مودی نے کہا کہ بغاوت کا سر کچلنے اور میانمار میں ہونے والی اس نسل کشی میں ہم میانمار کا ساتھ دیں گے۔ اُن کے اس بیان نے بھارت کے مسلمانوں میں ایک طرف تو اشتعال پیدا کیا اور دوسری طرف دنیا کو ثابت کر دیا کہ بھارت کھل کر اسلام دشمنوں کا ساتھ دینے کے لیے ہمیشہ سے ہی موقع کی تلاش میں تھا۔

بھارت اور بنگلہ دیش کی بے حسی

بیگم حسینہ واجد کے بے حسی اور خود غرضی کی انتہاؤں کو چھوتے ہوئے انٹرویو نے پوری دنیا خاص طور پر مسلمانوں میں غم و غصے کی لہر دوڑا دی۔ وہ سپاٹ چہرہ لیے اینکر سے کہہ رہی تھیں کہ بنگلہ دیش کیوں انہیں پناہ دے؟ یہ کام اقوام متحدہ کا ہے کہ وہ اس کا کوئی حل سوچے۔ بنگلہ دیش کیوں سوچے۔

دوسری طرف مودی صاحب نے ایسے تشویشناک حالات میں جب ستمبر ۲۰۱۷ء میں میانمار کا دورہ کیا تو پوری دنیا کی نظریں ان پر جمی ہوئی تھیں بشمول بھارتی مسلمانوں اور میڈیا کے۔ جنہیں پوری اُمید تھی کہ مودی حکومت آنگ سانگ سوچی پر زور ڈالے گی کہ وہ یہ غیر انسانی مظالم بند کروائے۔ اس کے برعکس مودی 'جی' آنگ سانگ سوچی کی تعریفوں میں زمین و

آسمان کے قلابے ملاتے پائے گئے اور دنیا کے ساتھ ساتھ اپنے 'دیش واسیوں' کو بھی ورطۂ حیرت میں مبتلا کر دیا۔

اتنا ہی نہیں، بھارت ''سرکار'' کو اچانک یہ بھی یاد آ گیا کہ ان کے ملک میں پہلے سے پناہ گزین روہنگیا مسلمان ناجائز طور پر بھارت میں رہ رہے ہیں اور وہ بھی دہشت گردی کی کارروائیوں میں ملوث ہیں جس کی وجہ سے ان کے دیش کو خطرات لاحق ہو چکے اور اب مودی سرکار سمیت دیگر انتہا پسند ہندو اُن پناہ گزینوں کو بھی بھارت سے بے دخل کرنے کا سوچنے لگے ہیں۔ ۱۵ ستمبر کو بھارت راشٹریہ کے اخبار روزنامہ سہارا میں شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق بھارت کی مرکزی حکومت نے باقاعدہ سپریم کورٹ میں ایک درخواست دائر کی جس میں کہا گیا ہے کہ روہنگیا پناہ گزین ملکی سلامتی کے لیے نہ صرف خطرہ بلکہ ان کی معیشت پر بھی اضافی بوجھ ہیں اور ان کے پاس ہندوستان میں رہنے کا کوئی آئینی حق نہیں اور غیر قانونی طور پر بسے ان روہنگیا مسلمانوں سے ان کو دہشت گردی کا شدید خطرہ ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بھارت کو اب اچانک اتنے سال بعد ہی یہ خیال کیوں آیا کہ وہاں سال ہا سال سے رہائش پزیر پناہ گزین کسی نہ کسی دہشت گرد تنظیم سے جڑے ہوئے ہیں۔ صاف واضح ہے کہ اس طرح کی غیر یقینی اور بے چینی کی فضا قائم کر کے بھارتی حکومت یہ باور کروانا چاہتی ہے کہ میانمار میں ہونے والے مظالم کوئی اچنبھے کی بات نہیں اور شاید روہنگیا مسلمان اسی سلوک کے مستحق ہیں نیز ایسے حالات پیدا کر کے وہ دنیا کے سامنے یہ بودی دلیل پیش کر رہی ہے کہ روہنگیا کی مدد نہ کرنے کا ایک ٹھوس جواز ہندوستان کے پاس موجود ہے۔

بھارتی میڈیا پر آئے دن ہونے والے ٹاک شوز میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے مبصرین کے مابین بڑھتی بحث ایک نیا ہی روپ دھار رہی اور وہاں بھی اب واضح طور پر لوگ دو گروہوں میں بٹ چکے۔ ایک گروہ کا یہ ماننا ہے کہ یہ مسئلہ محض مسلمانوں کا نہیں بلکہ انسانیت کا ہے اور انسانیت کی پاسداری کا دعویٰ کرنے والے ملک بھارت کو اس معاملے میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے اور اس بات سے قطع نظر کہ وہ مسلمان ہیں صرف انسانیت کے ناتے ان کی مدد کرنی چاہیے۔ جبکہ دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ بھارت ہمیشہ ہی ہمدردی کر کے پھنس جاتا ہے اور یہ پناہ گزین بعد میں ان ہی کے دیش میں 'آتنگ واد' پھیلاتے ہیں لہٰذا اس بار بھارت کو کسی سے کوئی ہمدردی کرنے کی ضرورت نہیں۔

اقوام متحدہ کے ادارہ برائے مہاجرین کے ترجمان جوزف ترپورہ کے مطابق اگست ۲۰۱۷ء سے تاحال تقریباً ایک لاکھ پچیس ہزار روہنگیا مسلمان سرحد عبور کر کے بنگلہ دیش پہنچے۔ یہ اور بات کہ بنگلہ دیش نے انہیں قبولنے سے انکار کرتے ہوئے ان پر اپنی سرحدیں بند کر دیں اور یہ بے چارے خوراک، پانی اور دیگر ضروریاتِ زندگی کو ترستے بلکتے وہاں سے بھی نکال دیے گئے۔ بنگلہ دیش کی سرحد پر موجود فوج نے انہیں جانوروں کی طرح ڈنڈوں سے ہنکاتے ہوئے واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا۔

حیرت کی بات ہے کہ کئی دہائیوں سے چل رہے اس مسئلے پر اتنا عرصہ خاموش رہنے والی اقوام متحدہ کو اب جا کر کچھ ہوش آیا جب ان خونی سرگرمیوں نے زور پکڑا اور تب اُس نے باقاعدہ طور پر ڈکلیئر کیا کہ روہنگیا مسلمان دنیا کی سب سے زیادہ ستائی ہوئی قوم ہیں۔ اقوام متحدہ کے نمائندے، گل رابرٹسن کے بقول برما کی حکومت امدادی قافلوں اور صحافیوں کو متاثرہ علاقوں میں جانے کی اجازت نہیں دے رہی اس لیے انسانی حقوق کی ان خلاف ورزیوں کا جائزہ لینا بے حد مشکل ہے۔ جب انڈونیشیا میں ایسٹی مور کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے، سوڈان میں دارفور کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے تو برما میں اراکان کا مسئلہ کیوں حل نہیں ہو سکتا۔ کیا صرف اس لیے کہ یہ مظلوم مسلمان ہیں؟ ◆◆◆

فکاہیہ

بھوک ایجاد کی ماں

پروفیسر مجیب ظفر انوار حمیدی

روٹی پکانے کی تگ و دو نے جب ایک استاد کو دن میں تارے دکھلا دیے

صاحبو! اللہ جانے کس مُفکّر نے ''بھرے پیٹ'' کہہ دیا ''ضرورت ایجاد کی ماں ہے!'' جبکہ ہم تو بانگ دہل دعویٰ کرتے ہیں 'ضرورت'، 'ایجاد' اور کارہائے زیست کے تمام تر لوازمات بی بی ''بھوک'' کی اولادیں ہیں۔ ہماری پیتا اس دعویٰ کی عمدہ مثال ہے۔

ہوا یوں کہ ماہ رمضان مکۃ المکرمہ اور مدینہ منورہ میں گزار کر شوال کی ۱۵ تاریخ ہم وارِدِ وطن ہوئے اور گھر کے نلکے سے کُلّی کرتے ہی پانی ''اخ تھو!'' کہہ کر تھوک دیا۔ پانی میں رچی بسی بُو جس سے ہماری چھ عشرے پُرانی شناسائی ہے، انتہائی اجنبی اور کمترین محسوس ہوئی۔ اندازہ ہوا کہ مکّہ اور مدینہ کی تو دھوپ میں بھی خوش بُو ہے، پانی تو پھر پانی ہے۔

خیر ہفتہ آٹھ دن تو گھر سنوارنے اور پہچاننے میں لگ گئے اور بعد ازاں ''تبرکات'' کی تقسیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہم اور ہماری بیگم دونوں ہی محکمۂ تعلیم، حکومت سندھ کے ملازم ہیں۔ ماہ جولائی میں ہماری درس گاہوں کی سالانہ تعطیلات بھی تھیں، اس لیے ہم چاہتے تھے کہ اپنے اپنے اسکول اور کالج کھلنے سے پہلے ہی رشتے داروں، دوستوں اور عزیز و اقارب میں ''عمرہ'' کے تبرکات پہنچا دیں۔

بیگم نے تجویز پیش کی کہ چونکہ آپ ان دنوں انٹرمیڈیٹ کے سالانہ امتحانات کی کاپیاں بھی جانچ رہے ہیں اور دن کے وقت انٹرمیڈیٹ بورڈ آفس میں ہوتے ہیں، اس لیے جو عزیز دور دراز مقیم ہیں، میں اُن کے تبرکات سی این جی رکشے میں دے آؤں گی۔

سی این جی رکشہ اور دور دراز جیسے الفاظ سُن کر ہمیں گرمی میں جاڑا محسوس ہوا کیونکہ ہم ادائیگی عمرہ کے لیے اپنے تنخواہ اکاؤنٹ سے معقول رقم نکال چکے تھے۔ خاصی رقم ''ریال'' کی صورت بھی اخراجات کے لیے ساتھ لے گئے تھے۔ ایسے میں سی این جی رکشوں کا ہزاروں رُوپے والا کرایہ بھی ہم پر پڑ رہا تھا۔

بیگم گزشتہ تیس چالیس برسوں سے ہماری ''عملی'' بے عزتی کرنے اور جھٹ اُس کا مداوا کرنے کی خوگر ہو چکی ہیں، فوراً بھانپ گئیں اور بولیں: ''ارے آپ اپنی شوگر کیوں بگاڑ رہے ہیں؟ ابھی اللہ کے گھر سے آئے ہیں ماشاء اللہ۔ میرے پاس کچھ ریال پڑے

ہیں۔ پاکستانی کرنسی میں اچھی خاصی رقم بن جائے گی، وہ اس کام آجائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میری بچت کی عادت مکہ اور مدینہ میں بھی قائم رہی اور میں دس ریال کے بجائے چھ ریال کا کھانا منگواتی رہی۔''

یہ سن کر ہمیں واقعی اپنی بیگم پر ایک فخر سا ہوا۔ غرض شام کو بیگم صاحبہ ہمارے ساتھ اور دن میں خود رشتے داروں میں تبرکاتِ عمرہ تقسیم کرنے لگیں۔ دس پندرہ دن میں ماشاء اللہ بھرا پُرا خاندان نمٹ گیا لیکن بیگم کی سب سے چھوٹی بھاوج صاحبہ محروم رہ گئیں کیونکہ وہ نیو کراچی کے ایک آباد و گنجان لیکن دور افتادہ علاقے میں رہائش پزیر تھیں۔ نئی کراچی کے اُس علاقے میں ہم، سی این جی رکشہ اور وقت تینوں ہی ''اڑی'' کر رہے تھے۔

مگر وہ بیگم ہی کیا جو ہار مان جائیں۔ بولیں: ''کل ہی اپنی بھتیجی شبانہ کو صبح سویرے بلاتی اور نئی کراچی کی بس میں بیٹھ کر سعیدہ کو اُس کا حصّہ دے آتی ہوں۔ بچوں کو بھی دیکھ آؤں گی۔''

''واقعی! بیگم تم تو ہمارے نیک اعمال کا صلہ ہو''۔ ہم نہال ہو گئے۔

اگلی صبح بیگم اپنے سفر پر روانہ ہو گئیں۔ ہم کچھ دیر درود و وظائف میں مصروف رہے۔ پھر اخبار زیرِ مطالعہ رہا اور بعد ازاں انٹرنیٹ چلا کر سوشل میڈیا پکڑ لیا۔ جلد ہی اُکتا کر ایک مرتبہ پھر اخبار اور ''اردو ڈائجسٹ'' کا تازہ شمارہ اُٹھا لیا جو پاکستان ہماری غیر موجودگی میں ہاکر صاحب دے گئے تھے۔ رسالہ پڑھتے پڑھتے اے سی کی خنکی میں جلد گہری نیند سو گئے۔

معاً آنکھ کھلی۔ حسبِ معمول ہم نے نزدیک رکھا موبائل فون اُٹھایا اور بٹن آن کر کے وقت دیکھا۔ اوہو! ظہر کی جماعت قضا ہو چکی تھی۔ استغفر اللہ! ہم نے اللہ رب العزت سے توبہ کی اور جھٹ سے کھڑے ہو گئے کہ کم از کم گھر میں ہی نمازِ ظہر ادا کر لیں۔ گھر میں کوئی اور بھی نہ تھا کہ مسجد جا کر پڑھ آتے۔

وضو کرتے ہوئے ہمیں یاد آیا کہ بیگم کی ایک صدا آئی تھی جاتے جاتے گیٹ سے کہ سُنیے، آلو قیمہ بنا کر جا رہی ہوں۔ آپ نماز پڑھتے ہوئے واپسی میں اپنے لیے روٹی لیتے آیئے گا۔

''روٹی!'' جیسے پیٹ میں ایک خلا پیدا ہوا۔

''یقیناً روٹی۔ نماز تو پڑھو!'' دماغ نے ٹوکا۔

''نہیں روٹی!'' دل کسمسایا۔

''واہ روٹی!!!'' پیٹ چیخا۔

وضو مکمل کر کے ہم باورچی خانے گئے۔ باورچی خانہ غریب بھی ہمیں اپنے آپ میں پا کر بھونچکا رہ گیا کیونکہ وہ گھر میں ہمارے لیے سب سے اجنبی جگہ ہے۔ آتے جاتے میاں باورچی خانے کو اپنی چھب ضرور دکھا دیتے لیکن کون سی شے کہاں رکھی ہے؟ یہ ہمارے فرشتوں کو بھی پتا نہیں تھا۔

ہماری خواہش تھی کہ پہلے کھانا کھا کر پھر بھرے پیٹ نماز ادا کرتے ہیں تاکہ رزق بھی شریکِ عبادت ہو جائے۔ فریج کھولا کہ گُوندھا ہوا آٹا نکال سکیں مگر اُس کم بخت عظیم الجثہ فریج میں سوائے گُوندھا آٹے کے باقی سب کچھ تھا۔

''یا الٰہی! بیگم تو روٹی لانے کا حکم دے کر چلتی بنیں، کم از کم آٹا ہی گوندھ کر فریج میں بروقت رکھ دیا کریں''۔ ہمیں ایک دم بیگم سے چڑ ہونے لگی۔ کراچی کے تمام تنور، ہوٹل اور ریستوران نظروں میں پھرنے لگے جہاں گول گول گرما گرم چرکا مارتی روٹیاں اور کھانے موجود ہوتے ہیں۔ ''ہائے! کاش ہم آٹا گوندھنا اور روٹی پکانا تو سیکھ ہی لیتے۔ چلو کالج، یونیورسٹی کے زمانے میں کچھ کوشش تو کی تھی، اب بھی کر کے دیکھتے ہیں۔''

یہ سوچ کر ہم نے آٹا، بیلن اور روٹی پکانے کے دوسرے لوازمات ڈھونڈنے شروع کیے۔ نتیجتاً دس پندرہ منٹ بعد باورچی خانے کی ہر الماری ہمیں اپنے اُجڑنے پر خونخوار نظروں سے گھور رہی تھی۔

''ارے کم بخت! یہاں مرا پڑا ہے تو!'' آٹے کا ڈبہ ملتے ہی ہم خوش ہو گئے۔ پرات میں ڈالا۔ پانی ڈالا۔ آٹا پتنگوں کی لئی بن گیا۔ پھر مزید آٹا ڈالا۔ اب پرات اکڑ گئی۔

یا الٰہی کیا مصیبت ہے۔ کاش کوئی پڑوسی دو روٹی لے آئے یا پھر ناس پیٹے لیپ ٹاپ سے کسی ویب سائٹ سے دو روٹیاں بنی بنائی نکل آئیں۔ کہاں پھنس گئے ہم۔ نماز کو الگ دیر ہو رہی ہے۔ ہم نے آلو قیمہ گرم کر کے اچار چٹنی کے ساتھ کھانے کی میز پر لگا دیا تھا۔ ساتھ ہی ایک آدھ آم، آڑو بھی دھو دھلا کر چھری پلیٹ کے ساتھ رکھ دیا۔ اپنے دور حکمرانی میں ہم خود ہی اپنی خیال رکھنے والی بیگم بن چکے تھے۔ دس منٹ بعد آٹا پُرسکون ہوا۔ ہمارا بس نہ چلتا تھا کہ کچا آٹا ہی آلو قیمے سے کھالیں۔ ڈبل روٹی اور بن صبح ناشتے میں ختم ہو چکے تھے ورنہ پیٹ کی آگ تو بجھا دیتے۔

خیر، تین عدد پیڑے توڑے تاکہ بیگم کو بھی اپنے ہاتھ کی ایک روٹی کھلا سکیں۔ پہلی روٹی بیلی، وزراء کے بجٹ کی طرح کچھ بھاری بھر کم سی لگی۔ ہم نے پروانہ کی۔

یاد آیا کہ چولہا جلانا اور توا گرم کرنا تو بھول ہی گئے۔ ہم ٹھنڈے مزاج کے آدمی ہیں مگر دل کرتا تھا کہ ابھی، اسی وقت اپنا ''پروفیسرانہ دماغ'' باورچی خانے کی دیواروں سے ٹکرا کر پاش پاش کر ڈالیں۔

ایک روٹی نہ ہوئی کم بخت پانامہ کا عذاب ہو گیا کہ نگلتے بنے اور نہ ہی اُگلتے۔ سیاست، عبادت، فنونِ لطیفہ..... سب کچھ اِس روٹی کے پس منظر میں منہ بسور رہے تھے۔ روٹی ان سب کی ماں بن کر سب سے آگے رقصاں تھی۔

اللہ اللہ کر کے توا گرم ہوا۔ روٹی بڑی دِقّت اور منتوں مرادوں سے توے پر ڈالی۔

ہمارے علاقے میں ہوٹل بہت دور دراز واقع ہیں۔ دن کے دو بج کر دس منٹ ہو چکے تھے۔ پُوری کراچی روٹی کھا چکی ہوگی اور ہم نصیبوں جلے ابھی تک..... لفظ ''جلا'' ذہن میں آتے ہی کسی شے کے تیز جلنے کی بُو آئی۔ گھبرا کر توے کو دیکھا تو اُس کے اردگرد لپلپاتے زرد شعلوں نے روٹی اور خشک آٹے میں آگ لگا دی تھی۔

اب روٹی پر پانی ڈال کر آگ بُجھانے سے تو رہے، مجبوراً توا ہٹا کر پڑوسی چولہے پر منتقل کیا اور آنچ ہلکی کی۔ روٹی کو جھٹک جھٹک کر شعلوں سے نجات دلائی اور واپس توے پر پٹخ کر توا چولہے پر دھر دیا۔

الٰہی! ہماری بیگم اور دنیا کی وہ تمام خواتین جو جھٹ پٹ روٹیاں چپاتیاں تیار کر لیتی ہیں، کس قدر عظیم مخلوق ہیں تیری!

آٹھ دس منٹ بعد جو شے تیار ہوئی وہ روٹی تو بہر حال نہ تھی۔ خیر اللہ کا شکر ادا کر کے اُسے کھلے ہاٹ پاٹ میں پٹخا۔ ہمیں یقین تھا کہ اِس چیز یا ہماری بنائی ہوئی روٹی کو دُنیا کا سب سے بھوکا بلکہ بھوک سے جاں بلب چور بھی نظر اُٹھا کے نہ دیکھے گا۔

دوسری روٹی بڑی مشکلوں سے بڑھا کر توے پر ڈالی تو وہ اپنی بڑی بہن کا المناک حشر نشر دیکھ کر توے پر پڑتے ہی سکڑ گئی۔ اُسے سیدھا کرنے کی کوشش کرتے تو چمٹے کے کناروں سے جوار بھاٹا کھیلنے لگتی۔

''ارے دفع ہو تو! ایک ہی کھالیں گے آج!'' ہم کھانے کی میز پر کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ آلو قیمہ اپنی مہارت اور خوشبو کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

ہم نے بسم اللہ پڑھ کر آٹے میں سے روٹی کے حصے دریافت کر کھانا شروع کیے۔ نظروں میں تمام باورچیوں اور نان بائیوں کی بلائیں لیں کہ کس مہارت اور چابک دستی سے دن دن بھر روٹیاں پکاتے اور نیکیاں کماتے رہتے ہیں۔ ہم نے گھر کم بخت آبادی سے دور ''پُرسکون'' علاقے میں لیا تھا لیکن اب ایک روٹی نے اس پُرسکون علاقے کے سکون کو آگ لگا دی تھی۔ نوالہ بناتے وقت دماغ نے آرڈر دینا بند کر دیا کہ ہماری انگلیاں اِس چیز کا نوالہ کس طریقے سے بنائیں۔

مجبوراً کڑک کڑک حصّے توڑ کر چمچہ کی مدد سے اُن پر سالن رکھا اور کھانا شروع کیا۔ ذرا دیر بعد دوسری روٹی نما شے نے شور مچا دیا۔ اُس خام مال کو بھی بھٹی سے نکال ہاٹ پاٹ کی قبر میں دھکیلا اور چولہا بند کر کے کھانے کے کمرے کی کھڑکیاں،

محبتِ حسنین کریمین علیہما السلام

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: میں نے حضور نبی اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے حسن و حسین علیہما السلام کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: ''یہ میرے بیٹے ہیں''۔

(ابن جوزی؛ صفوة الصفوه، ذہبی؛ سیرأعلام النبلاء)

حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد پاک ہے: حسن میری ہیبت و سرداری کا وارث ہے اور حسین میری جرأت و سخاوت کا۔

(طبرانی؛ المعجم الکبیر، شوکانی؛ درالسحابہ، بیشمی؛ مجمع الزوائد)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نماز ادا کر رہے تھے تو حسن و حسین علیہما السلام آپ ﷺ کی پشت مبارک پر سوار ہو گئے۔ لوگوں نے ان کو منع کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ان کو چھوڑ دو، ان پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔

(طبرانی؛ المعجم الکبیر، ابن حبان؛ الصحیح، ابن ابی شیبہ؛ المصنف)

مقامِ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

''حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ہر نبی کے لیے دو وزیر اہل آسمان سے اور دو وزیر اہل زمین سے ہوتے ہیں۔ پس اہل آسمان میں سے میرے دو وزیر جبرئیل و میکائیل ہیں اور اہل زمین میں سے میرے دو وزیر ابوبکر و عمر ہیں۔'' (الترمذي، المستدرک)

''حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضور نبی اکرم ﷺ سے عمرہ کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے انہیں فرمایا: اے میرے بھائی! ہمیں بھی اپنی دعاؤں میں شریک رکھنا اور ہمیں نہیں بھولنا۔'' (ترمذی، سنن ابن ماجہ)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تبارک و تعالیٰ عرفہ کی رات کو فرشتوں کے سامنے اپنے تمام بندوں پر فخر کرتا ہے اور خاص طور پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر فخر کرتا ہے۔''

(اللمعجم الاوسط، مجمع الزوائد)

دروازہ کھول کر پنکھا چلا دیا تاکہ دھواں تو نکلے۔ خدشہ تھا کہ کچھ ہی دیر بعد فائر بریگیڈ کی گاڑیاں دھواں ڈھونڈتے ہمارے گھر بلکہ باورچی خانے میں چڑھائی کر دیں گی۔

''اللہ تیرا شکر ہے!'' ہم نے شاید اپنے بچ جانے پر شکر ادا کیا۔ روٹیاں عجیب کچے پکے آٹے کی صورت میں ہاٹ پاٹ میں سجی تھیں۔ تین بج چکے تھے۔ ہم نے آم اور آڑوؤں پر ہاتھ صاف کیا۔ عمرے سے لائی کھجوریں کھائیں اور پھر آناً فاناً نماز کے کمرے میں آ گئے۔

دوسری رکعت میں ''سورۃ القریش'' کی آیت:

''جس نے انہیں بھوک میں کھانا دیا اور انہیں ایک بڑے خوف سے امان بخشا۔'' تلاوت کرتے ہوئے ہماری ہچکی بندھ گئی۔

بیگم تو جو آ کر کریں گی، وہ محلّہ سُنے گا مگر اپنی بے بسی اور معذوری پر رونا آئے جاتا تھا کہ ہم ایک روٹی تک نہیں بنا سکتے؟ چائے تو بنا لیتے ہیں، انڈا فرائی، بوائل سب جانتے ہیں۔ دودھ گرم کر لیتے ہیں مگر..... یہ روٹی۔ ہاہہہ.....

ہم دہائیاں دیتے رہے لیکن جلد ہی پُرسکون ہو کر نماز مکمل کی۔ دُعا مانگی۔ رب کا شکر ادا کیا۔ چاہتے تھے کمپیوٹر پر اپنی آپ بیتی اُردو ڈائجسٹ کے لیے ٹائپ کر دیں۔

میری تمام بیگمات سے ایک گزارش ہے کہ خدارا اُن شوہروں کے لیے، جن کا خدا کے بعد کھلانے والا اور کوئی نہ ہو، کہیں بھی جاتے وقت دو روٹیاں بھی ہاٹ پاٹ میں دھر جایا کریں تاکہ ''بھوکے'' کو کھلانے کا ثواب بھی سمیٹ کر توشے میں لے جا سکیں۔

غذا کو ضائع مت کیجیے

بدن و روح کے محافظ اس آسمانی تحفے کی بے حرمتی بنی نوع انسان کو بہت مہنگی پڑ سکتی ہے

ارم ناز

''اس روشن دن کے اندھیرے نے ہمیشہ مجھے مضطرب کیے رکھا۔'' یہ کہنا تھا کیون کارٹر کا جو فوٹو جرنلسٹ تھے۔ ۱۹۹۳ء میں انہیں سوڈان جانے کا اتفاق ہوا تا کہ قحط سے متاثرہ علاقوں کی رپورٹنگ کر سکیں۔ گاؤں میں سارا دن تصاویر لینے کے بعد وہ تھک گئے۔ قحط نے وہاں کے باسیوں کی صورتحال بگاڑ کے رکھ دی تھی۔ ہر جگہ چند نوالوں کے لیے سسکتی بلکتی زندگی نظر آتی۔ چلتے چلتے وہ ایک جھاڑی کی طرف گئے جہاں انہیں گھٹنے اور کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔

جب انہوں نے بڑھ کر دیکھا تو وہاں چار پانچ سالہ بچی جو ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی تھی، نقاہت کے سبب اوندھی پڑی کراہ رہی تھی۔ بھوک نے اس کو اتنا نڈھال کر رکھا تھا کہ وہ چل بھی نہیں پا رہا تھی اور اس سینٹر کی طرف گھسٹ کر جانے کی کوشش کر رہی تھی جہاں قحط سے بے حال لوگوں کو غذا مہیا کی جاتی تھی۔ کارٹر تصاویر لیتے ہوئے سوچنے لگے کہ اس کی مدد کیسے کریں۔ اچانک پھڑ پھڑاہٹ کی آواز کے ساتھ ایک گدھ اس بچے کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور اپنی بھوک مٹانے کے لیے بچے کی موت کا انتظار کرنے لگا۔

کارٹر نے اس دلخراش منظر کو اپنے کیمرے میں محفوظ کر لیا اور پھر گدھ کو خوفزدہ کر کے بھگانے کے لیے سگریٹ جلایا اور اس پر پھینکا کہ وہ اُڑ جائے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس بے بسی کی حالت میں وہ بچی کو وہیں چھوڑ کر آگے روانہ ہو گئے (گدھ اور بچے کی اس تصویر کو عالمی شہرت ملی اور کیون کو اس پر ایوارڈ سے بھی نوازا گیا)۔ وطن واپس آ کر ان کا کہنا تھا کہ میری زندگی کا واحد مقصد ایسی نادر و نایاب تصاویر کھینچنا تھا جو مجھے شہرت کی بلندی پر لے جائیں لیکن میں کبھی اس تصویر کو اپنے کمرے کی دیوار پر نہ لگا سکا۔ بھوک کے ہاتھوں بے بس افراد آج بھی میری آنکھوں کے سامنے گھومتے رہتے ہیں۔

☆☆

غذا ہماری زندگی کا لازمی جزو ہے۔ اس پر ہمارے جسم کی پرورش کا دارومدار ہے۔ اس کے ذریعے نہ صرف جسم کو ـوت ملتی ہے بلکہ مختلف افعال کی وجہ سے جسم کی جو شکست و ریخت ہو، اس کی مرمت بھی ہو جاتی ہے۔ یہ مقصد تبھی حاصل ہو سکتا جب جسم کو متوازن اور عمدہ غذا میسر ہو۔ اچھی خوراک ہمارے رویوں میں خوشگوار تبدیلی کا سبب بنتی ہے اور اس کے برعکس غیر معیاری اور ناکافی خوراک انسانی مزاج میں چڑچڑے اور روکھے پن کا باعث ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ اگر جسم کو ضرورت کے مطابق خوراک نہ ملے تو وہ لاغر ہو جاتا ہے۔ اس میں کام کاج کرنے کی طاقت نہیں رہتی اور ہمارا جسم مختلف قسم کی بیماریوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ بعض دفعہ تو زندگی کی بازی بھی ہار جاتا ہے۔

ایک طرف غذا ہماری زندگی کی ضمانت ہے تو دوسری طرف اس کی اہمیت سے صرفِ نظر برتتے کے بے دریغ ضائع کیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کھانے کا ضیاع ہے کیا؟ اقوام متحدہ کی تنظیم برائے خوراک و زراعت کے مطابق ''کھانے کے ضیاع سے مراد یہ ہے کہ انسانی وسائل کے لیے ابتدائی سطح (فصلوں کی کاشت) سے لے کر آخری سطح (گھریلو کھپت) تک خوراک کی فراہمی کا ناکافی یا محدود سلسلہ''۔ یہ کمی یا ضیاع حادثاتی بھی ہو سکتا ہے اور جان بوجھ کر بھی لیکن جو بھی ہو بالآخر لاکھوں انسانوں کو خوراک کی کمی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دنیا بھر کی غذائی اجناس کی پیداوار کا تخمینہ ۸ء۳ سے ۴/ارب ٹن سالانہ ہے اور ضائع ہونے والی غذا کا تخمینہ تقریباً ۹ء۱ ارب ٹن یعنی تقریباً نصف غذا ہماری غفلت سے کوڑے کا ڈھیر بن جاتی ہے۔

عالمی ادارہ خوراک کے مطابق دنیا میں ہر سال بھوک مختلف مہلک اور وبائی امراض سے کئی گنا زیادہ اموات کا باعث بنتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا کے لگ بھگ اسی کروڑ افراد کو غذائی قلت کا سامنا ہے جبکہ ایک ارب افراد صحت مند خوراک تک رسائی سے محروم ہیں۔

اب نہ صرف ترقی پذیر بلکہ ترقی یافتہ ممالک میں بھی لوگ خوراک کی کمی کا شکار ہو چکے۔ دنیا بھر میں غذا کو کوڑے میں پھینکنے کا سب سے زیادہ رجحان ترقی یافتہ ممالک میں ہے۔ ایک عالمی تنظیم، ویسٹ اینڈ ری سائیکلنگ باڈی کے مطابق ۲۰۱۵ء میں برطانیہ میں ۳ء۷ ملین ٹن کھانا کوڑے کی نذر ہوا اور ہر گزرتے سال کے ساتھ اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مزید یہ کہ برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی ۴۰ لاکھ کے قریب افراد آج بھی مناسب خوراک تک رسائی نہیں رکھتے۔ اقوام متحدہ کی تنظیم برائے خوراک و زراعت کے مطابق برطانیہ میں ۳۰ فی صد تک اگائی جانے والی سبزیوں کی کٹائی محض اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ ایک تو وہ دیکھنے میں اچھی نہیں لگتیں اور دوسرے سپر مارکیٹیں ایسی غیر معیاری سبزی نہ خریدیں گی اور نہ ہی انھیں فروخت کریں گی۔ رپورٹ کے مطابق یورپ اور امریکا میں اس خوراک کا قریباً نصف حصہ ضائع کر دیا جاتا ہے جو لوگ استعمال کے لیے خریدتے ہیں۔ جاپان بھی اس دوڑ میں پیچھے نہیں رہا۔ وہاں ۶ء۱۰۱ ارب ڈالر مالیت کی خوراک تلف ہو جاتی ہے۔

ایک امریکی تنظیم، نیچرل ریسورسز ڈیفنس کونسل کے مطابق امریکا میں ۴۰ فیصد غذا ضائع ہوتی ہے جبکہ دوسری جانب ۵۰ ملین امریکی ایسے ہیں جن کو ناکافی خوراک میسر ہے۔ ہر آٹھ میں سے ایک امریکی ایسے خاندان سے منسلک ہے جسے غیر صحت مند خوراک میسر ہے اور جن کو تھوڑی سی خوراک کے حصول کے لیے بھی سخت محنت کرنا پڑتی ہے۔ عجیب بات ہے کہ یہ سب افراد اُن معاشروں میں بستے ہیں جہاں جدید سپر مارکیٹیں لاکھوں ٹن قابل استعمال بہترین خوراک کو کچرے میں بدل رہی ہیں۔

۲۰۱۴ء میں برطانیہ کے انسٹی ٹیوشن آف مکینیکل انجینئرنگ کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ دنیا بھر میں ایک طرف تو بھوک اور افلاس نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں وہیں دوسری طرف جس قدر خوراک ضائع ہوتی ہے، وہ حیرت انگیز ہے۔ دنیا بھر میں پیدا ہونے والی کل خوراک کا پچاس فیصد حصہ ضائع ہو جاتا ہے جبکہ کھانے کے لیے تیار خوراک کا ضیاع اس کے علاوہ ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق زیادہ تر خوراک

ترقی پذیر ملکوں میں کسانوں کی نااہلی، انفراسٹرکچر اور ذخیرہ کرنے کی مناسب سہولیات نہ ہونے کے باعث ضائع ہوتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں صارفین حد سے زیادہ صحت و صفائی کے اصول مدنظر رکھتے ہوئے اچھی خوراک کو بھی اپنے وہم کی وجہ سے ضائع کر دیتے ہیں۔

اقوامِ متحدہ کی تنظیم برائے خوراک و زراعت کے مطابق دنیا میں انسانی ضروریات پر صرف ایک تہائی خوراک استعمال ہوتی ہے۔ باقی ۲ ملین ٹن خوراک کوڑے کی نذر ہو جاتی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں ضائع شدہ خوراک کی مالیت ۶۸۰ بلین ڈالر بنتی ہے جبکہ ترقی پذیر ممالک میں ۳۱۰ بلین ڈالر۔ یہ ہی خوراک دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی اور ان لوگوں کی غذائی ضروریات پوری کر سکتی ہے جو آج بھی بھوک کا شکار ہیں۔ تنظیم کے مطابق عالمی سطح پر سب سے زیادہ ضیاع پھل اور سبزیوں کا ہے جو کہ کل خوراک کا ۴۰۔۵۰ فیصد ہے۔ ۳۰ فیصد اجناس، ۲۰ فیصد خوردنی تیل، جبکہ گوشت، مچھلی اور ڈیری مصنوعات کا ضیاع ۳۵ فیصد تک ہے۔

ہر سال ترقی یافتہ ممالک کے صارفین تقریباً ۲۲۲ ملین ٹن خوراک ضائع کرتے ہیں جو آدھے افریقا کی ۲۳۰ ملین ٹن غذائی ضروریات کے برابر ہے۔ اسی طرح لاطینی امریکا میں جو خوراک ضائع ہوتی ہے، وہ ۳۰۰ ملین اور جو یورپ میں ضائع شدہ ۲۰۰ ملین بھوکے افراد کا پیٹ بھرنے کے لیے کافی ہے۔ حتیٰ کہ عالمی سطح پر جو خوراک ضائع ہوتی ہے اس کا اگر ایک چوتھائی حصہ ہی محفوظ کر لیا جائے تو وہ دنیا کے ۸۷۰ ملین بھوکے افراد کے لیے کافی ہوگا۔ یورپ اور امریکا میں انفرادی طور پر صارفین کا ضیاع ۹۵۔۱۱۵ کلوگرام سالانہ جبکہ سب صحارا افریقا اور جنوب مشرقی ایشیا میں صارفین صرف ۶۔۱۱ کلوگرام سالانہ ضائع کرتے ہیں۔

گلوبل کمیشن اکانومی اینڈ کلائمیٹ ۲۰۱۵ء کی رپورٹ کے مطابق دنیا بھر کے امیر لوگ سالانہ چار سو ارب ڈالر کا کھانا، پھل، سبزیاں کوڑے کے ڈبوں کی نذر کر دیتے ہیں

کیون کارٹر کی انعام یافتہ تصویر

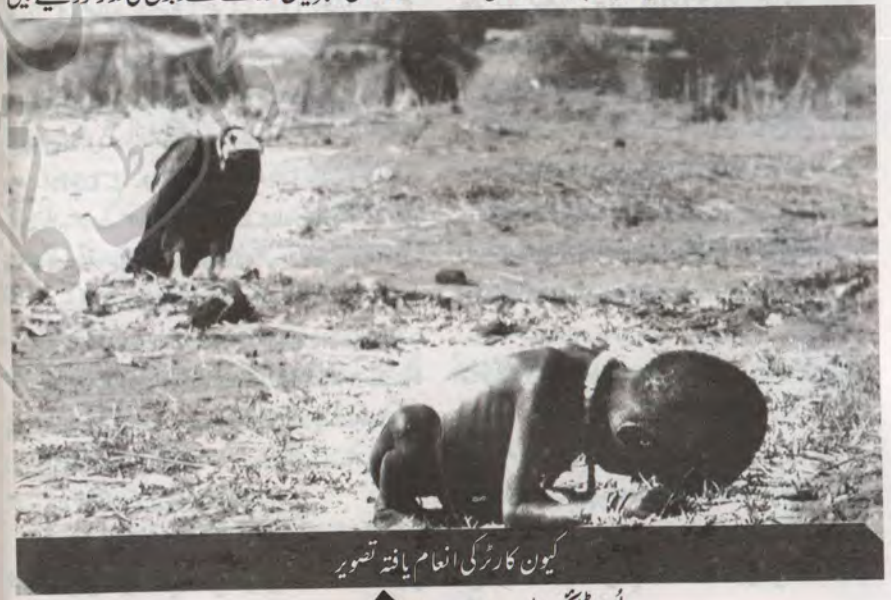

اور اس بات کا انہیں احساس تک نہیں ہوتا۔ مزید برآں دو ارب پچاس تک کھانے کا ضیاع اور بھی بڑھ جائے گا۔ اس لیے اگر بہترین حکمتِ عملی اپنائی جائے تو ۲۰۳۰ء تک سالانہ ۱۲۰ سے ۳۰۰ ملین ڈالر بچائے جا سکتے ہیں۔

خوراک کے ضیاع کا یہ رجحان اب یورپی ممالک سے ہوتا ہوا اسلامی ممالک میں بھی پہنچ چکا۔ ان ممالک میں سعودی عرب سرفہرست ہے۔ اس کے بعد خلیجی ریاستوں کا نمبر آتا ہے۔ سعودی عرب کے دو مقدس شہروں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں غذا کی بے حرمتی کا یہ عمل رمضان المبارک کے دوران سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ سعودی عرب کے کثیر الاشاعت انگریزی اخبار عرب نیوز کی ایک رپورٹ کے مطابق سعودی عرب میں روزانہ ۴ ہزار ۵۰۰ ٹن قابل استعمال غذا ضائع ہو رہی ہے۔ سعودی عرب میں رمضان المبارک کے علاوہ باقی مہینوں میں مجموعی طور پر قریباً ۱۶ ارب سعودی ریال غذا پر خرچ کیے جاتے ہیں مگر رمضان میں سعودی شہری صرف غذا کی مد میں ۲۰ ارب سعودی ریال خرچ کر دیتے ہیں۔ یوں اس خوراک کا ۴۵ فی صد پیٹ میں جانے کے بجائے کچرے دانوں میں چلا جاتا ہے۔ اخبار کے مطابق عالمی سطح پر اگر ضائع کی جانے والی خوراک کا اندازہ لگایا جائے تو یہ ۱۳ء۱ ارب ٹن ہے جس کی سعودی ریال میں ۸ء۲ ارب ریال قیمت بنتی ہے۔

پچھلے سال ایک سماجی تنظیم، انٹرنیشنل فوڈ ریسرچ انسٹیٹیوٹ کی جانب سے گلوبل ہنگر انڈیکس ۲۰۱۶ء جاری کیا گیا، جس میں ترقی پذیر ممالک کو صفر سے ۱۰۰ کے درمیان پوائنٹس دیے گئے۔ اس رپورٹ کے مطابق دنیا میں ۸۰۰ ملین لوگوں تک جاری مسلح تصادم کی وجہ سے خوراک نہیں پہنچ پا رہی جس سے صورتحال یا تو پریشان کن ہے یا پھر تشویشناک۔ ان ممالک میں آٹھ ممالک ایسے ہیں جہاں پر صورتحال خوفناک ہے اور ان میں سینٹرل افریقن ریپبلک ۴۶،۹ پوائنٹس کے ساتھ سرِفہرست ہے۔ دوسرے پر چاڈ جہاں ۹ ملین افراد کو غذائی قلت کا سامنا ہے اور تیسرے پر زیمبیا، مزید برآں صومالیہ، کینیا اور ایتھوپیا میں تقریباً گیارہ ملین انسان بھوک کے بحران کا شکار ہیں۔

اس فہرست میں پاکستان گیارہویں نمبر جبکہ بھارت ۲۵ ویں نمبر پر ہے جہاں صورتحال تشویشناک ہے۔ خوفناک حد تک صورتحال کی فہرست میں افغانستان بھی شامل ہے۔ انڈیکس میں یہ بتایا گیا کہ عوام کو درپیش خوراک کی کمی اور بھوک کے خاتمے کی موجودہ شرح کے تناظر میں بھارت، پاکستان اور افغانستان دنیا کے ان پینتالیس ممالک میں شامل ہیں جہاں بھوک کی صورتحال ۲۰۳۰ء میں معتدل سے پریشان کن سطح تک پہنچ جائے گی۔

عالمی ادارہ خوراک کے مطابق پاکستان کا شمار ان ممالک میں ہوتا ہے جہاں غذائی کمی کی وجہ سے ہونے والی اموات کی شرح بہت زیادہ ہے کیونکہ پچاس فیصد سے زیادہ پاکستانی آبادی کو صحیح خوراک تک رسائی حاصل نہیں۔ عورتیں اور بچے بھوک و غذائیت کے مسائل سے دوچار ہیں۔ ورلڈ فوڈ پروگرام کے مطابق پاکستان میں ہر ۱۰ میں سے ۶ افراد غذائی کمی کا شکار ہیں۔ ایک تہائی بچوں کی اموات مختلف غذائی اجزا کی کمی کے باعث ریکارڈ کی گئی۔ اس کے علاوہ قد کا چھوٹا رہ جانا، وزن میں کمی، ذہنی امراض، انیمیا، اندھا پن اور ہڈیوں میں ٹیڑھا پن جیسی بیماریاں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ بالخصوص جنوبی پنجاب اور دیگر پسماندہ علاقوں میں بچوں کے درمیان قد کے چھوٹے رہ جانے اور دبلے پن کی شرح میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

دنیا کا ہر تیسرا فرد غذائی کمی کا شکار ہے۔ یہ مسئلہ کسی ایک ملک کا نہیں، بلکہ ہر دیس خواہ وہ ترقی یافتہ ہو یا ترقی پذیر، اس کا نشانہ بن چکا۔ اس وقت مجموعی طور پر دنیا میں جتنی بھی خوراک پیدا ہوتی ہے، اس کا قریباً ایک تہائی حصہ ضائع کر دیا جاتا ہے۔ اس ضیاع کو روکنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ جتنی خوراک دستیاب ہے، اسے کھایا جائے اور جو اضافی خوراک ہے، اسے ضائع ہونے سے بچانے کے لیے فوری اقدامات کیے جائیں۔

فوڈ اینڈ ایگریکلچرل آرگنائزیشن کے مطابق دنیا کی کل آبادی کا ۵۴ فیصد شہروں میں آباد ہے اور شہر مسلسل پھیل رہے ہیں۔ آبادی میں اضافے کو کنٹرول کیا جائے کیونکہ جس طرح شہر پھیل رہے ہیں، ویسے ہی نہ صرف مزید خوراک کی ضرورت ہے بلکہ خوراک کے ضائع ہونے میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ اس ضائع ہونے والی خوراک کا سالانہ حجم ۱٫۹ ارب ٹن لگایا گیا ہے جس سے بہت سے بھوکے لوگوں کا پیٹ بھرا جاسکتا ہے۔

یہ ضروری ہے کہ حکومت اور سماجی تنظیمیں مل کر عام لوگوں کی معلومات میں اضافے اور تربیت کے لیے سیمینار اور ورک شاپس کا انعقاد کریں کیونکہ شعور اور آگاہی وہ پہلا قدم ہے، جس سے خوراک بچانے کا عمل شروع ہوسکتا ہے۔ شعور اور آگاہی کے ذریعے ضائع ہونے والے کھانے کو بچا کر نہ صرف بھوکے افراد کا پیٹ بھرا جاسکتا ہے، بلکہ اپنے ماحول کو بھی کئی مضر اثرات سے محفوظ رکھنا ممکن ہے۔

یہ ضائع شدہ خوراک نہ صرف آلودگی، گندگی اور مختلف قسم کی بیماریوں کا باعث بنتی بلکہ گلنے سڑنے کے بعد زہریلی گرین ہاؤس گیسوں کی شکل میں ڈھل کر ماحولیاتی نقصانات میں اضافہ کردیتی ہے۔

گھریلو سطح پر بھی ضیاع کو روکنے کے لیے بازار سے اتنی ہی اشیاء خریدیں جو آپ کی ضرورت کے عین مطابق ہوں اور ضرورت سے زیادہ کھانا بجائے اس کے کہ گھر میں پڑا گل سڑ جائے کسی ضرورت مند کو دے دیں یا پھر اگلی بار استعمال کے لیے محفوظ کرلیں۔ جتنا کم کھانا ضائع ہوگا اتنا ہی وہ کسی بھوکے کی سیر شکمی کا موجب بنے گا۔

عموماً ترقی پذیر ممالک میں پھل، سبزیاں اور اناج چناؤ اور کٹائی سے لے کر محفوظ ہونے تک ۴۰ فیصد تک ضائع ہو جاتا ہے اس لیے کسانوں کو اس کی تربیت دینے اور اس نقصان کو کم کرنے کے لیے پروگرام ترتیب دیے جائیں کیونکہ جب فصلیں اور پھل سبزیاں وغیرہ ضائع ہوتی ہیں تو یہ ایک طرح سے نہ صرف زمین، پانی اور توانائی کے ذرائع کا ضیاع ہے بلکہ اس ساری محنت کا بھی جو کسان اول دن سے شروع کرتا ہے۔ اس لیے خوراک کو زیادہ سے زیادہ مقدار میں اور اچھے و مناسب طریقے سے محفوظ کیا جائے۔

غذا کے ضیاع سے بچنے کے لیے متعدد ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک نے مستحق لوگوں تک مختلف طریقوں سے خوراک کو تقسیم کرنے کا کام شروع کر رکھا ہے۔ مثال کے طور پر جنوبی افریقا میں جنوبی افریقی فوڈ بینک اشیائے خورد و نوش کے ڈیلروں اور پرچون فروشوں سے اضافی خوراک کا سامان خرید کر باقاعدہ خوراک تیار کرتا ہے اور پھر اسے مستحق افراد میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ فوڈ بینک نے گزشتہ برس ۳۳۵۰ ٹن خوراک مستحقین میں تقسیم کی تھی۔ جنوبی کوریا نے اپنے شہریوں پر خوراک پھینکنے کی اضافی فیس عائد کردی ہے تاکہ ضیاع خوراک کی حوصلہ شکنی ہوسکے۔

ارجنٹائن میں ایک ریستوران کے مالک نے یخچی ریفریجریٹر کے نام سے ایک فریج اپنے ریستوران کے باہر رکھ چھوڑا ہے جس میں وہ اضافی کھانا رکھ دیتے ہیں۔ ضرورت مند اپنی ضرورت کے مطابق کھانا اس میں سے لے لیتے ہیں۔ اسی طرح بنگلہ دیش میں ہوٹل اور ڈھابے والوں نے ایک احسن کام شروع کر رکھا ہے جس کو مشعل راہ بنایا جاسکتا ہے۔ ایسی تمام خوراک جس کا اگلے دن خراب ہونا یقینی ہے، اس کو پھینکنے کے بجائے ہوٹل والے غربا میں تقسیم کردیتے ہیں۔

پاکستان میں بھی نجی یونیورسٹی کے تین طالب علموں نے ''رزق'' کے نام سے ایک ادارہ بنایا ہے جس کو لوگ اپنا زائد کھانا اور کھانے کی اشیاء عطیہ کردیتے ہیں۔ جس کو رزق ٹیم کے ممبران اکھٹا کرکے، اس کے صحت بخش ہونے کی تصدیق کرنے کے بعد پیک کرکے مستحق ۲۰۰ سے ۳۰۰ افراد روزانہ کی بنیاد پر تقسیم کرتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ امر افسوس ناک ہے کہ دنیا میں اب بھی ہر سات میں سے ایک فرد بھوکا سوتا ہے۔ ۵ سال سے کم عمر کے ۲۰ ہزار سے زیادہ بچے ہر روز بھوک سے موت کی وادی میں چلے جاتے ہیں۔ ●●●

انسانی دماغ کا انوکھا جہاں

عقل دنگ کردینے والی ربّ تعالیٰ کی حیرت انگیز کاریگری

قاضی مظہرالدین طارق

اللہ رب العٰلمین نے اس کائنات کو تخلیق کیا تو اسے چلانے کے اصول وضوابط بھی بنائے۔ اللہ ہی کے علم کے مطابق کائنات پر تحقیق وجستجو اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا نام ''سائنس'' ہے۔ سورۂ عنکبوت آیت نمبر ۲۰ میں آیا ہے:

''ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اُس (اللہ) نے کس طرح خلق کی ابتدا کی ہے''۔

اسی طرح سورۃ الغاشیۃ میں آیت نمبر ۱۷ سے ۲۰ تک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

''کیا یہ اُونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے تخلیق کیے گئے ہیں؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اُٹھایا گیا ہے؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے ہیں؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی ہے؟''

جب کچھ کرنے کی بات آئی ہے، تو غور طلب بات یہ ہے کہ انسان کام کیسے کرتا ہے؟ ہمارے ربّ نے اس کے لیے ہمیں ایک جسم اور بہت سارے اعضاء عطا کیے ہیں۔ دماغ سے ہم سوچتے اور منصوبہ بناتے ہیں۔ اس کام کے لیے وسائل جمع کرتے، پھر اپنے ہاتھ پیر کو کام میں لاکر اسے انجام دیتے ہیں۔ ہاتھ پیر سے کام کرنے کے لیے ربّ نے ہمیں عضلات (مسلز) سے نوازا ہے۔ عضلات کو مجتمع کرکے اعضاء بنائے۔

ہمارے جسم کے اعضاء میں تین قسم کے عضلات ہیں۔ ایک وہ جن کو ہم اپنے اِرادے سے چلا سکتے ہیں۔ دوسرے وہ جو خود بخود چل رہے ہیں، ہمارے اِرادے کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ تیسرے وہ عضلات جو ربّ تعالیٰ نے خاص صرف دل کو مرحمت فرمائے۔ ان کی مدد سے دل قوت کے ساتھ خون بدن کے آخری سرے تک بھیج رہا ہے۔

آخری دو کے کاموں میں ہمارے اِرادے و اختیار کا تو کوئی ذکر ہی نہیں، یہ خالص ربّ العٰلمین کی مرضی سے چل رہے ہیں۔ پہلے قسم کے عضلات جو ہمارے اِرادے و اختیار میں ہیں، آگے ان کا احوال بھی ملاحضہ فرمائیے، لیکن اس سے پہلے سمجھنے کے لیے اِختیاری اور غیر اِختیاری کاموں کی مثالیں دیکھتے ہیں۔

غیر اِختیاری افعال میں ایک مثال یہ ہے کہ جب ہم کچھ کھاتے ہیں، اس کو چبانے اور حلق کے اندر دھکا دینے تک ہمارا اختیار ہے۔ پھر ہماری کھانے کی نالی میں آخیر تک دو قسم کے عضلات موجود ہیں۔ ایک گول عضلات اور دوسرے لمبے۔ دونوں مل کر نوالے کو خاص طریقے سے معدے کی طرف دھکیلتے ہیں۔ یہ عضلات نظر بھی نہیں آتے، مگر اللہ کے حکم سے اپنا کام خوب انجام دیتے ہیں۔ یہ فضلے کو جسم سے باہر

نکالنے تک غذا کی جان نہیں چھوڑتے۔ اس عمل کو (peristalsis) کہتے ہیں۔ پھر ان کے درمیان جو ہاضمے کا کام ہوتا ہے، اس کی انسان کو صدیوں تک خبر نہ تھی کہ وہ کیونکر انجام پاتا ہے۔ اس کو عمل میں لانے کی خاطر کتنی گہری کیمیا کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہر مرحلے کے پورے ہونے تک یہ عضلات رُکے رہتے ہیں۔ جب دماغ اشارہ کرتا ہے کہ آگے بڑھو تب ہی یہ عمل آگے بڑھتا ہے۔

چند صدی پہلے انسان کو پتا چلا کہ اس میں کیا کیا کیمیائی تعاملات (reactions) پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً پیچیدہ کثیر العناصر سالمے (multi-molecular molecules)؛ سادہ سالموں میں تبدیل ہو کر خون میں داخل ہونے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

اس سب کیمیا دانی کا انسان کو ایک صدی پہلے تک کچھ پتا نہ تھا۔ اب بھی ہمارا اس کیمیا میں کچھ دخل اور اختیار نہیں۔ یہ ہمارے جسم میں اللہ ربّ عزیز و حکیم کے حکم سے ہو رہے ہیں۔ غیر اختیاری افعال کی اور بھی ہزاروں مثالیں ہیں، جن میں دل کا دھڑکنا یا آہستہ تیز ہونا، رگوں کا سکڑنا پھیلنا، سانس کا پھولنا، حواسِ خمسہ کا دماغ کو اپنی معلومات بجلی کے اشاروں میں تبدیل کر کے بھیجنا، وغیرہ وغیرہ۔ ان سب میں تو انسان کی آزادی کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ اللہ اور اس کے بنائے ہوئے قوانین پر مکمل عامل ہیں اور اس کے غلام ہیں، یعنی ساری کائنات کے ساتھ وہ بھی بندے، یعنی عبد ہیں، مسلم ہیں، چاہے وہ اس کو تسلیم کریں یا نہ کریں۔

اب اختیاری اَعمال کا حال دیکھتے ہیں۔ ان میں انسان کتنا آزاد ہے؟ ایک مثال یہ دی جا سکتی ہے کہ ایک فرد سڑک پر جا رہا ہے۔ اُس کو کوئی قیمتی چیز پڑی نظر آتی ہے۔ وہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس کو اُٹھا لے۔ یہ کام انجام دینے کے لیے اس کے کئی عضلات مختلف کام کرتے ہیں۔ رُکنے، جھکنے، ہاتھ بڑھانے، چیز کو گرفت میں لینے، پھر واپس کھڑے ہو کر چلنے کے لیے پورا کامل نظام رحمٰن نے ہم کو بخشا ہے۔

آیئے اس نظام کے بارے میں جانتے ہیں۔ ہماری کھوپڑی میں محفوظ عضو کو ہم دماغ کہتے ہیں۔ اللہ نے اس کی جبلّت میں یہ علم و اختیار رکھ دیا ہے کہ کس عضو کو کیا حکم دے نیز اس نے دماغ کو ایک مواصلاتی نظام بھی عطا کیا کہ وہ بجلی کے برقیروں (کوڈ اشاروں) کے ذریعہ اعضاء سے رابطہ کرتا اور ایک ساتھ سینکڑوں عضلات کی راہنمائی کرتا ہے کہ کس کو کیا کرنا ہے۔

یاد رہے ایک عضو میں بھی سینکڑوں ذیلی عضلات ہوتے ہیں۔ ایک بھی غلط اشارہ سارا کام بگاڑ سکتا ہے۔ ساتھ ہی ربّ نے ان عضلات کو یہ تعلیم بھی دی ہے کہ وہ دماغ کے برقی اشاروں کو سمجھیں اور برق رفتاری سے کام کو سلیقے اور ترتیب سے انجام تک پہنچائیں۔

بھلا بتایئے! اس سارے عمل میں سوائے فیصلے کے ہمارا کچھ دخل ہے؟ کیا ہم جانتے ہیں کہ ہمارا دماغ کس عضو کو کیا برقیرہ بھیج رہا ہے؟ اس کا کوڈ کیا ہے؟ اس کوڈ کی کوڈ کیسے کریں؟ یعنی کیونکر سمجھیں کہ اس میں کیا پیغام پوشیدہ ہے۔ چند دہائیوں پہلے تک تو انسان کو ان برقیروں کا احساس بھی نہیں تھا۔

توجہ کیجیے! اختیاری اَفعال میں ہماری آزادی اور اختیار کا حال یہ ہے۔ فیصلہ انسان کرتا ضرور ہے مگر کام ربّ کے کارندے ہی انجام دیتے ہیں، چاہے وہ ربّ کے حکم کے خلاف فیصلہ کرے، مگر سوال پیدا ہوتا کہ کیوں؟

یاد رہے! جب اللہ ربّ العزت نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو فرشتوں اور جنوں سمیت اس جہاں کی ساری مخلوقات کو کہا کہ میں اسے زمین پر اپنا نائب بنا رہا ہوں۔ میرا حکم ہے کہ تم سب اسے سجدہ کرو اور یہ جو بھی فیصلہ کرے میری طرف سے تم سب کو حکم ہے کہ اس کے فیصلے پر عمل کرو۔ ہاں! مگر جب تک میری مرضی ہو۔

یہ ہے انسان کا اس زمین بلکہ صرف اُس کے اپنے ہی جسم پر آزادی کا حال۔ انسان صرف فیصلے کا اختیار رکھتا ہے اور ایک بڑے اور یقینی آنے والے دن اس کو اپنی اسی نیت کا حساب دینا ہوگا!●●●

(مصنف کی کتاب: "انوکھے جہاں کی انوکھی سیر" سے ماخوذ)

نفسیات

عامر عباس ناصر اعوان

ایک مشہور فلاسفر اپنے ہمسائے کے مرغے کے شور و غل سے بہت تنگ تھا۔ جب بھی یہ مرغا شور مچاتا اس کی ساری سوچیں درہم برہم ہو کر رہ جاتیں اور اس کے تحقیقی کاموں میں خلل پڑتا۔ ایک دن اس نے اپنے ملازم کو کچھ پیسے دیے اور کہا کہ ہمسائے سے یہ مرغا خرید لے اور ذبح کر کے پکائے تاکہ وہ اپنی ساری کوفت کا بدلہ مرغے کے لذیذ گوشت کو کھا کر لے سکے اور یوں مرغے سے نجات بھی مل جائے۔

فلسفی نے اپنے دوست کو بھی دعوت پر بلا لیا۔ دوست کے آنے پر فلسفی نے بتانا شروع کیا کہ کیسے ہمسائے کے مرغے نے جینا محال کیا ہوا تھا جس کا حل اس نے یہ نکالا کہ آج وہ مرغا ہی خرید کر پکا لیا۔ محض چند ہی گھنٹے میں وہ بہت سکون و راحت محسوس کر رہا ہے۔ بلکہ آج اس نے اپنے تحقیقاتی کاموں پر جس توجہ سے کام کیا ہے وہ کئی مہینوں سے حاصل نہیں ہو رہی تھی۔ ابھی وہ دونوں باتیں کر ہی رہے تھے کہ ملازم کھانا اُٹھائے کمرے میں داخل ہوا اور فلسفی سے بولا: "جناب والا، بہت معذرت خواہ ہوں کہ میں نے ہمسائے سے مرغا خریدنے کی بہت کوشش کی مگر وہ بیچنے پر آمادہ نہ ہوا، لہٰذا میں نے بازار سے مرغا خرید کر پکایا ہے"۔

فلسفی نے حیرت سے اپنے ملازم کی باتیں سنیں اور غور کیا تو واقعی ہمسایوں کا مرغا تو اب بھی اپنی پوری آب و تب کے ساتھ شور مچا رہا تھا۔

شیخ طنطاوی رحمۃ اللہ علیہ اس قصے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: میں نے جب اس فلسفی کے معاملہ پر غور کیا تو یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ شخص اس مرغے سے بہت پریشان تھا کیونکہ یہ بہت شور مچاتا تھا، اور پھر یکا یک ہی یہ شخص بہت خوش بھی ہو گیا حالانکہ یہ مرغا تو ابھی تک زندہ تھا اور حالات و واقعات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ گویا تبدیلی خود انسان کے اپنے اندر پیدا ہوا کرتی ہے۔ یہ انسان کی اندرونی کیفیت ہی تھی جس نے فلسفی کو اس مرغے سے پریشان کر رکھا تھا اور پھر یہی انسانی اندرونی کیفیت ہی تھی جس نے اُسے خوش کر دیا۔ اگر یہ خوشی خود ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہی ہے تو کیوں ہم اسے دوسروں سے مانگتے پھرتے ہیں اور اگر یہ خوشی اتنی ہی قریب ہوتی ہے تو پھر ہم کیوں اسے اپنے آپ سے دور کر دیتے ہیں؟

ہم مرغے کو صرف اس لیے ذبح کر ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ اس کے شور سے راحت پا سکیں۔ اگر اس مرغے کے ذبح ہونے کے بعد اس کی جگہ ایک سو اور مرغے آ گئے تو پھر ہم کیا کریں گے، کیونکہ یہ دنیا ایک آدھ نہیں ایسے کروڑوں مرغوں سے بھری پڑی ہے؟

کیا ہی اچھا ہو کہ اگر ہم صرف اسی ایک مرغے کو ہی اپنے دماغ سے اتار پھینکیں کیونکہ ہم زمین پر موجود سارے مرغوں کو تو کرۂ ارض سے باہر پھینکنے سے رہے۔ اگر ہم سارے مرغوں کے منہ بند کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے تو اپنے کان بند کر لینے کی عادت کیوں نہیں ڈال لیتے؟ ہم اپنے احساسات کو ناپسندیدہ عناصر سے متاثر ہونے سے عاری کیوں نہیں کر لیتے؟ ہم اپنے گرد ایک غیر مرئی سی دیوار ہی کیوں نہیں کھڑی کر لیتے جو ہمیں ہمارے ناپسندیدہ محسوسات کے ہاتھوں زخم آلود ہونے سے بچاتی رہے۔●●●

تازہ افسانہ

پیاسی ندیا

شاہدہ ناز قاضی

ایک معصوم پنچھی کی دلگداز کہانی جسے صیاد نے ٹھنڈے میٹھے چشمے کے کنارے بٹھا کر بھی پیاسا رکھا اور اس کی زندگی جہنم بنادی

زندگی بہار کے پھول کی طرح ایک دم کھل اُٹھی۔ بات ہی ایسی تھی۔ بہار کا موسم تھا اور ایسے میں ایک من چاہے ساتھی کے سنگ سنگ ہم قدم ہونے کا احساس اپنائیت، محبت، سکون، تحفظ و فخر سب کچھ مل کر چاہت بھرا نغمہ بن گئے۔ اس نغمے کا نام تھا وجاہت!

وہ ریل میں جا رہے تھے۔ دور دور تک ہریالی اگلتے کھیت جھوم جھوم کر جیسے اُنہیں ہی خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ کھیت، کھیتوں میں کام کرنے والے کسان، نیلا آسمان، نیلے آسمان تلے اڑتے پرندے..... یہ سب کچھ کتنا دلفریب تھا۔ ایک تو وہ خوشبو تھی جو اُس نے نت نئے پرفیومز کے ڈھیر سے خود چُن کر لگائی تھی اور جس کی مہک نے اس کے کپڑوں، گردن، کانوں کی لو، نازک کلائیوں اور سر کے بالوں کے گرد ہالا سا بنا دیا تھا اور دوسری خوشبو وہ تھی جو وجاہت کی خوشگوار باتوں کی وجہ سے پھیل رہی تھی۔ وہ ان خوشبوؤں میں گھری بات بات پہ ہنس رہی تھی۔

اس کی چمکدار آنکھیں کبھی باہر دوڑتے مناظر کو دیکھنے لگتیں۔ کبھی وجاہت کو جو سیاہ سوٹ اور سرخ ٹائی میں نکھرا نکھرا اور کتنا اچھا لگ رہا تھا، کتنا اپنا اور قریب۔

ابھی ان کی شادی کو ہفتہ ہی ہوا تھا لیکن اُسے ایسے لگتا تھا جیسے برسوں سے آشنائی ہو۔ لبنیٰ کے چہرے پہ منزل پالینے کی خوشی سورج کی کرنوں کی طرح پھیل رہی تھی۔ وجاہت من موہنی ہمسفر کے ساتھ بڑا مسرور تھا۔ اس کی آنکھیں وارفتگی اور محبت سے چمک رہی تھیں۔

وقت کی گاڑی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات، مسرتوں اور بے فکری کے کھیتوں کے پاس سے گزرتی رہی۔ ان کی شادی کو ایک سال گزر گیا، پورے تین سو پینسٹھ دن مگر

لگتا تھا جیسے ابھی چند روز ہی ہوئے ہوں۔ وجاہت کی وارفتگی تو اور بھی سوا ہوگئی تھی۔ لبنیٰ بھی اس وارفتگی سرشاری پہ نازاں تھی۔ اس نے وجاہت کو پہلی سالگرہ پہ ایک پیارا سا بیٹا تحفے میں دیا۔ اب زندگی کا اصل سفر شروع ہو چکا تھا۔

شادی کے بعد سے اب تک وہ سسرال میں رہی تھی۔ وجاہت گورنمنٹ کنٹریکٹر تھا۔ چھاؤنی میں اس نے مختلف کاموں کے ٹھیکے لے رکھے تھے۔ جب اُسے دوسری چھاؤنی میں کام دیا گیا تھا تو اُنہیں اپنا شہر چھوڑ کر وہاں جانا پڑا۔ کینٹ میں وجاہت نے اچھا خوبصورت چھوٹا سا آرام دہ گھر کرایے پہ لے لیا۔ وہ صبح جاتا رات گئے واپس آتا۔ وہ مُنے کو کندھے سے لگائے گھر میں تنہائی سے گھبرا کر ٹہلتی رہتی اور دل میں سوچتی، یہ اب میرا گھر ہے۔ میں اسے جنت بنادوں گی۔

اُسے کبھی کبھی سسرال کی رونقیں یاد آتیں۔ چھوٹی نندوں کی چھیڑ چھاڑ، ہلا گلا، دیور بھیا کے شرارتی قہقہے..... ساس، سُسر کی الگ رونق تھی۔ صبح صبح نماز کے لیے ساس کا سب کو جگانا، کبھی پیار سے، کبھی ڈانٹ سے، کبھی لوٹے کو زور زور سے بجاتیں تاکہ ان کی نیند ٹوٹ جائے۔ بڑے ابو (سُسر) کا صبح صبح ریڈیو لگا لینا، تلاوت سننا، پھر سوئیاں گھما گھما کر ہر اسٹیشن سے خبریں سننا۔ پھر اخبار آجاتا۔ وہ اونچا اونچا پڑھ کر اپنی بیگم (ساس صاحبہ) کو سناتا: ''سُنتی ہو ایک نئی خبر آئی ہے۔''

امی ساس بھی سارے کام چھوڑ چھاڑ کر خبر سننے گوش برآواز ہو جاتیں۔ پھر خبر سُن کر کہتیں: ''آئے ہائے بڑا بُرا زمانہ آگیا ہے۔ ہمارے زمانے میں کبھی ایسا ہوتا تھا بھلا.....'' ''کتنا ظالم نکلا نگوڑا.....'' ہائے۔ آئے اللہ کی مار اس پر۔''

ابا جی ڈھونڈ ڈھونڈ کر دل دہلانے والی خبریں پڑھتے اور امی ساس بھی خوب خوب ردعمل دیتیں۔ گھر میں ساری نوجوان پارٹی خوب ہنستی۔

کیسے بھلے دن تھے۔ اچھا سسرال ایک عورت کے لیے گھنی چھاؤں ہوتا ہے۔ وہ سارا دن رونق میں رہتی تھی لیکن اب گھر میں تنہائی اُسے کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ وجاہت صبح کا گیا کبھی رات گئے لوٹتا۔ کبھی جلدی آجاتا۔ پھر آہستہ آہستہ گھر میں جی لگ گیا۔ پاس پڑوس والیاں ملنے چلی آئیں۔ ورنہ جھجک کے مارے وہ کسی کے گھر اب تک نہیں گئی تھی۔ وہ سب اُسے بہت اچھی لگیں۔ جاتے ہوئے اُسے بھی اپنے گھر آنے کا کہہ گئیں۔

اپنے گھر سے وہ زیادہ سامان نہیں لائے تھے حالانکہ جہیز میں والدین نے بہت سا فرنیچر اور کراکری دی تھی۔ امی ابو (ساس سسر) کی موجودگی میں سارا سامان اُٹھاتے شرم سی آگئی کیونکہ وہ استعمال بھی ہو رہا تھا۔ وجاہت نے ضرورت کی چند چیزیں لیں۔ ایک بیڈ، چند کرسیاں اور کچھ برتن۔ ابھی انہیں اس گھر میں بہت سی چیزوں کی ضرورت تھی، فوری طور پہ تاکہ گھر خوبصورت اور سجا سجایا لگ سکے۔

شادی کے دو سال ہونے کو آئے تھے۔ اچانک محلے سے خواتین آگئیں۔ ان کے لیے اہتمام کیا۔ پھر میکے سے اس کی خالہ اور ماموں ملنے چلے آئے۔ وہ اچانک آگئے تھے۔ بسکٹ اور کچھ نمکو پڑی تھی جو خواتین کے کام آگئی تھی لیکن ماموں اور خالہ کے لیے تو بہت اچھا اہتمام کرنا ضروری تھا۔ اس نے پہلے غور ہی نہیں کیا تھا کہ اس کا پرس خالی ہے۔ شادی کے بعد میکے سے دیے گئے مختلف مواقع کی رقم اس کے پاس تھی۔ پہلے سلامیوں اور پھر جب مُنا ہوا تو پرس بھر گیا تھا۔ وجاہت کو معلوم تھا کہ بیوی کے پاس آٹھ دس ہزار روپے موجود ہوتے ہیں۔ کسی نہ کسی ضرورت پہ وہ مانگتا رہا اور وہ پانچ سو ہزار دے دیتی۔ اب دیکھا تو پرس خالی۔ اپنی حماقت پہ اُسے افسوس ہوا کہ اُسے وجاہت سے رقم ضرور لے لینی چاہیے تھی تاکہ کچھ نہ کچھ پاس بھی ہو۔

ہمسائیوں سے رقم مانگی اور ان کے ہی بچے کو بیکری دوڑا دیا۔ اس نے فرج سے شامی کباب کبھی ختم نہیں ہونے دیے

تھے۔ منا بیمار رہا تو اسے کباب بنا کر رکھنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ دل میں سوچا' اب آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔

رات گئے وجاہت کام سے لوٹا تو دن بھر کی رُوداد سُنے بغیر ہی سو گیا۔ ''پلیز' میں سخت تھکا ہوا ہوں۔ بس کل آرام سے سنوں گا۔ تم نے مہمان داری بھگتالی۔ بہت اچھا کیا۔ وہ فون کر کے آتے تو بہتر انتظام ہو جاتا۔ خیر میں سونے جا رہا ہوں۔ کھانا میں باہر کھا آیا تھا۔''

اگلی صبح وہ پھر تیزی سے تیار ہو کر نکلنے جا رہا تھا۔ وہ اُسے مختلف چیزیں پکڑاتی، بھاگتی ہوئی گیٹ تک گئی اور بولی ''پلیز آپ بات سنیں۔ آپ کے پاس وقت ہی نہیں۔''

''جلدی بات کرو۔ مجھے کالیں آ رہی ہیں۔ میں نے میٹنگ میں جانا ہے۔ آج ایک نئے ٹھیکے کی بات کرنا ہے۔ جلدی بتاؤ کیا بات ہے۔''

''بات یہ ہے کہ میرے پرس میں ایک پیسا بھی نہیں کہ مہمان آئیں تو کچھ منگوالوں۔ آپ سے پیسے لینے یاد ہی نہیں رہے مجھے۔ کل ہمسائیوں سے ادھار لینا پڑا۔''

''آئندہ نہ لینا۔ چیزیں گھر میں پوری رکھنا۔''

''جی جناب' مگر کچھ پیسے تو دے دیں''۔

''ابھی میرے پاس نہیں' واپسی پہ دے دوں گا۔''

وجاہت رات گئے آیا۔ ''کھانا جلدی لاؤ۔ سخت بھوک لگی ہے'' وہ اس کے لیے باورچی خانے جا کر کھانا گرم کرنے اور تازہ پھلکے بنانے لگی۔ منا جاگ اُٹھا۔ بات بیچ میں رہ گئی اور وہ سو گیا۔

اگلی صبح وجاہت نے اسے روپے دیے تو وہ حیرت سے انھیں دیکھتی رہ گئی۔ اس کا خیال تھا وہ دو تین ہزار تو ضرور اُسے دے گا۔ جب سے اس کی شادی ہوئی اس نے وجاہت سے کبھی نہیں پوچھا کہ کتنا کماتے ہو' کتنا بچاتے ہو؟ وہ جھجک میں ہی رہ گئی تھی۔ پھر وہ گھر میں راشن ڈال دیتا تھا۔ کوئی جوتی کپڑا مانگنے پہ دلا دیتا۔ وہ اس لیے مانگتے مانگتے چپ رہ جاتی لیکن آج اُسے احساس ہوا کہ اپنے پرس میں بھی کچھ رقم ہونا کتنی ضروری ہے۔

اگر خدانخواستہ بچہ بیمار ہو جائے اور ڈاکٹر کے پاس ایمرجنسی جانا پڑے۔ تو رکشے اور ڈاکٹر کی دوائی کے لیے بھی رقم نہ ہو تو یہ شرمندگی کی بات ہے۔ وہ سوچ رہی تھی' ہو سکتا ہے آئندہ مہینے بھر کا خرچ چلانے کے لیے مخصوص بجٹ کے مطابق مجھے رقم دے دے گا۔ تب میں گھڑا پے سے کچھ ذاتی بچت بھی کر لوں گی اور گھر کو ذمہ داری سے چلا کر بھی دکھا دوں گی۔ بالکل اس طرح جس طرح اس کی والدہ جنہیں ابا جان اپنی تنخواہ لا کر دے دیتے تھے اور سارا مہینا بے فکر ہو جاتے کہ اب بیگم جانیں اور ان کا کام۔ اس نے جیب سے جو رقم نکالی وہ صرف سو کا ایک نوٹ تھا۔ شاید مذاق تھا۔ وہ ہنس پڑی۔

''کیوں تھوڑے ہیں؟'' وجاہت سنجیدہ تھا۔

''نہیں بہت زیادہ ہیں۔ کہاں خرچ کروں گی۔ اتنی بڑی رقم تو مجھ سے سنبھالے نہیں سنبھلے گی۔'' وہ مسلسل ہنس رہی تھی۔ شاید وجاہت مذاق میں چھیڑنے تنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔

''بند کرو یہ دانت نکالنا۔ بتاؤ ہنسی والی کون سی بات ہے۔'' وجاہت کا لہجہ اسے مار ڈالنے کے لیے کافی تھا

''سارا راشن پانی خرچہ کر رہا ہوں۔ تمہیں کیا ضرورت ہے پیسوں کی؟''

''کیا.....؟'' وہ صدمے سے گنگ سے رہ گئی۔

''ضرورت پڑ سکتی ہے۔'' وہ تڑپ کر بولی۔

''کوئی ایمرجنسی ہو تو مجھے فون کر دینا۔ میں گھر آ جاؤں گا۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ کہہ کر جھپاک سے باہر نکل گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں ایک پیسا نہیں ملے گا۔ ضروریات پوری ہو جائیں گی لبنیٰ بیگم۔ لبنیٰ نے خود کو ٹوٹتے بکھرتے ہوئے سنبھالا اور اپنا سر دیوار سے ٹیک دیا۔ یہ کیسا غم ہے کہ چھپائے نہ چھپے اور بات بتائے نہ بنے۔

زندگی کی گاڑی شاید کسی سرنگ میں سے گزر رہی تھی۔ باہر لہلہاتے کھیت، پھول' دمکتا سورج سب اندھیرے میں چھپ گئے۔ وہ باورچی خانے میں برتن دھو رہی تھی۔ آج وجاہت کے بہت سے ملنے والے آئے تھے۔ ان کے چائے پانی اور اب کھانے کا بندوبست کر رہی تھی۔ نوکر کوئی گھر میں تھا نہیں' اکیلے بھاگ بھاگ کر اس کی ہمت جواب دیتی جا رہی تھی لیکن یہ اس کے فرائض میں شامل تھا۔ گھر میں دوسرے بچے کی آمد متوقع تھی لیکن بے آرامی نے اسے ہلکان کر رکھا تھا۔ دعوت کے بعد ڈھیروں برتن اُٹھانا اور دھو کر رکھتے ہوئے اُسے چکر آ گیا۔ وہ وہیں باورچی خانے میں گر گئی۔ چھوٹا بچہ جو اب توتلی زبان میں باتیں کرنے لگا تھا۔ اپنے والد کو بیٹھک میں بتانے چلا گیا:

''بابا، ماما گر گئیں۔''

وجاہت کے آنے سے پہلے وہ سنبھل کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا چہرہ املتاس کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ وجاہت کو احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ کام کے کتنے دائروں میں اُلجھی تھکتی جا رہی ہے۔ چند روز بعد ساس خود ہی ملنے چلی آئیں۔ انہیں معلوم تھا زچگی کا وقت قریب ہے۔ لبنیٰ کی والدہ حیات نہیں تھیں ورنہ اس حالت میں وہ بچی کو اکیلا نہ چھوڑتیں۔ وہ بہو کی حالت دیکھ کر چونکیں۔ ''لو' یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ اتنا کام تنہا کرتی ہو؟ وہ بھی اس حالت میں! اوپر سے ہر ہفتے دعوتیں ہو رہی ہیں۔ آخر کس لیے؟ چار چار گھنٹے کھڑے ہو کر کھانے پکاؤ پھر برتن دھونے کھڑے ہو جاؤ۔ یہ کام کرنے والی اب تک کیوں نہیں رکھی؟''

شام کو امی نے وجاہت کی آتے ہی خبر لی۔ ''امی' آپ کو پتا ہے پردیس میں چور اچکے تو کافی مل جاتے ہیں مگر ڈھنگ کے اچھے نوکر ملنا مشکل ہے۔ پھر میں کس طرح کسی غیر کو اپنے گھر میں گھسا لوں۔''

''اچھا تو پھر میں بہو کو اپنے ساتھ لے جاتی ہوں۔ چھلے کے بعد آ کر لے جانا۔ آرام کرنے سے صحت بھی بہتر ہو جائے گی۔''

''امی آپ ایسے ہی فکرمند ہو گئیں۔ دعوتیں اتفاق سے ذرا زیادہ ہو گئیں ورنہ لبنیٰ کام سنبھال لیتی ہے۔ میں جب وقت قریب آئے گا آپ کو بُلوا لوں گا اور میں نے اپنے ملنے ملانے والوں کو کسی ملازمہ کا کہا ہوا ہے۔ جونہی مل گئی میں رکھ لوں گا۔''

وقت آیا اور گزر گیا۔ اللہ تعالیٰ نے گود میں بیٹی ڈالی تھی۔ خیر خیریت سے سب لمحات گزر گئے۔ چھلے تک اماں ساتھ رہیں۔ فیملی سے بھی سب ملنے ملانے آتے رہے۔ اماں نے خود ہی محلے سے کہہ کہلوا کر ایک اچھی سی کام کرنے والی عورت برتن' کپڑے اور جھاڑو پہ رکھ لی۔ لبنیٰ کو بھی آرام ہو گیا۔ ننھے بچوں کو سنبھالنا' آئے گئے کو بھی دیکھنا پھر صفائی ستھرائی کرنا' کپڑے لتے دھونا' استری کرنا اس کے بس سے باہر ہو گیا تھا۔ جونہی اماں رخصت ہوئیں دوسرے ماہ وجاہت نے کام والی کو بھی چھٹی دے دی۔

وہ حیرانی سے دیکھتی رہ گئی..... یہ یہ کیا ہو رہا تھا۔ وہ بولی ''وجی میں اکیلی کام نہیں سنبھال سکتی۔ یہ آپ نے میرے پوچھے بغیر اُسے چھٹی کیوں دے دی۔ کتنی مشکل سے ملی تھی۔''

''سچ بات یہ ہے کہ میں چار ہزار کا خرچ نہیں اٹھا سکتا۔ ادھر بچے کے دودھ اور ڈائپرز کا خرچہ بڑھا ہے اُدھر ایک کام والی ماسی کا۔ اب تم خود گھر کو دیکھو' سنبھالو۔ باہر جو عورتیں ہیں وہ کام والی کے بغیر ہی سارا کام سنبھالتی ہیں نا۔''

''ان کے شوہر مدد کرواتے ہیں۔'' وہ منمنائی۔

''کوئی شوہر نہیں کرواتا۔ سب کام عورت کو ہی کرنا ہوتے ہیں۔ تم کسی ملازمت پہ جا رہی ہو کہ تمہیں کام والی کی ضرورت ہے۔ سارا دن کیا کام ہے تمہارا؟ ایک گھر ہی تو سنبھالنا ہوتا ہے۔ اسے خود سنبھالو۔ سب عورتیں سنبھالتی ہیں۔''

''لیکن......وجی۔یہ......سب......''

''دیکھو......میں نے ایک اور ٹھیکہ لیا ہے۔اس کا ٹینڈر بھر کر بھیجنا ہے مجھے۔صرف یہ چند سال آزمائش کے ہیں۔ میں نے ابھی کل ہی دو لاکھ جمع کروانے ہیں اگر یہ ٹھیکہ مجھے مل گیا تو مجھے بہت فائدہ ہوگا۔یہ ساری محنت تمہارے اور بچوں کے لیے ہی تو کر رہا ہوں......''

وہ چپ چاپ ہراساں سی سوچتی رہ گئی۔شاید واقعی اس کے پاس اتنی رقم نہ ہو۔پھر وہ جھوٹ تو نہیں بول رہا اور پھر عورت تو دکھ سکھ کی ساتھی ہوتی ہے۔

''دیکھو مہینا ختم ہو رہا ہے۔اگلے ماہ کے لیے جو کچھ منگوانا ہو اس کی لسٹ بنا دو۔میں لے آوں گا۔''

وہ باورچی خانے میں برتن دھو رہی تھی۔بیٹا کھلونوں کے ساتھ مگن تھا۔چھوٹی بیٹی جھولے میں سو رہی تھی۔ابھی ابھی وجاہت کے ملنے والے دوستوں کو بھگتا کر وہ کچن سنبھالنے گئی تھی۔وہ کام چھوڑ کر نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کاغذ قلم سنبھال کر لکھنے لگی: آٹا، گھی، گرم مسالہ، چائے، جام، مکھن، ڈھیروں چھوٹی بڑی بچوں کے استعمال کی چیزیں۔

لبنیٰ نے گھر کے سودے کی فہرست اسے تھما دی تو جھجک کر کھڑی ہو گئی۔یہ سب چیزیں تو روزمرہ کے استعمال کی تھیں۔وہ بھی اس گھر میں جیتی جاگتی وجود تھی۔اُسے بھی تو بہت سی چیزوں کی ضرورت تھی۔

''اس بار میں خود آپ کے ساتھ بازار جاؤں گی۔ہم اکٹھے راشن لائیں گے۔میں دو نئے سوٹ سلوانا چاہ رہی ہوں۔اکلوتے بھائی کی شادی ہے۔ایک دن تو میں چلو پرانا کوئی سا سوٹ پہن لوں گی لیکن اگلے دو دن میں نئے سوٹ پہننا چاہتی ہوں......''اس نے کہا۔

''تم عورتوں کی یہ بڑی مصیبت ہے۔احساس کمتری کی مریضائیں ہوتی ہو تم لوگ۔ہم مرد ہیں کہ نہ کپڑوں کی فکر ہوتی ہے نہ میک اپ کی۔جیسے کپڑے ہوں پہن کر مزے سے فنکشن چلے جاتے ہیں۔سادگی اپناؤ لبنیٰ بیگم سادگی اپناؤ۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی اپنا ماتھا مت پھوڑو۔''

''وجی' شادی کے چار سال ہو گئے ہیں۔آپ نے دیکھا کہ میں خود کتنی سادہ ہوں۔آپ سے برانڈڈ کپڑوں کی فرمائش نہیں کی کبھی۔جو آپ کبھی میرے لیے لے آتے ہیں یا ایک آدھ بازار سے لیتے ہیں' سب درمیانے ریٹ کے کپڑے ہوتے ہیں۔میں شوباز بھی نہیں۔میری ضروریات بے لگام بھی نہیں ہیں۔یہ آپ کو بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا لیکن میں یہ بات بھی آپ کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ میں کسی سے بھی پیچھے نہیں رہنا چاہتی۔''

''مطلب کیا ہے تمہارا اب؟......صاف صاف بات کرو۔یوں گھما پھرا کر بات مجھے اچھی نہیں لگتی۔''

''وجی میں وقت کے تقاضوں کے ساتھ چلنا چاہتی ہوں۔یہ میرا حق بھی ہے۔میرا لباس میری پہچان ہے۔وہاں ساری برادری اکٹھی ہو رہی ہے۔سب نت نئے کپڑے سلوا رہے ہیں۔میری سب تایازاد بھابیاں، بہنیں خوب خریداری کر رہی ہیں۔آپ کے گھر میں بھی سب تیاریوں میں مصروف ہیں۔میں بھی اپنی الگ حیثیت سے اپنے چھوٹے بھائی کی شادی میں شریک ہونا چاہتی ہوں۔''

''حیثیت! حیثیت؟ یہ کس بلا کا نام ہے لبنیٰ بیگم؟ حیثیت کپڑوں سے نہیں خاوند کے رتبے اور دولت سے بنتی ہے۔صدر پاکستان کی بیگم سوتی لباس میں بھی آجائے گی تو لوگوں کے دلوں میں اس کا احترام کم نہیں ہوگا بلکہ الٹا لوگ سادگی کی تعریف کرنے لگیں گے''

''پلیز وجاہت' مجھے تنگ نہ کریں۔آپ کو پتا ہے میری بڑی بہن فائزہ مجھے کہہ رہی تھی کہ کپڑوں پہ گلے کا اچھا سا ڈیزائن وہ مجھے بھجوا دے گی۔میں بھی ہلکا سا کام کروا لوں گی۔ نہیں تو اچھا سا ریڈی میڈ سوٹ لے لوں گی......''

''میں تمہیں ایک بھی سوٹ خرید کر دینے کی پوزیشن میں

اُردو ڈائجسٹ کے سالانہ خریدار بن کر

560 روپے
کی غیر معمولی بچت پائیے
اس قیمت میں خصوصی نمبر
بھی حاصل کیجیے

0300-4005579
urdudigest.pk
www.urdudigest.pk
subscription@urdudigest.pk

اُردو سے محبت کریں......اُردو ڈائجسٹ پڑھیں

اُردو کے ہمہ رنگ، باوقار ڈائجسٹ کو اپنا دوست بناتے ہوئے
معلومات کی ایک نئی دنیا سے اپنے دامن کو بھریئے
دِلچسپ انٹرویوز، کہانیوں اور شگفتہ ادبی تحریروں سے اپنی زندگی کو پُرلطف بنائیے

قیمت فی پرچہ -/100 روپے	12 شماروں کی قیمت	سالانہ رجسٹرڈ ڈاک خرچ	کل رقم سالانہ	سالانہ بدل اشتراک	بچت
سالانہ خریداری	1200 روپے	360 روپے	1560 روپے	1000 روپے	560 روپے

سالانہ خریداری فارم

نام ---------------- فون نمبر ----------------
پتا ---------------- ای میل ----------------
میں ماہ ------ 20ء سے اُردو ڈائجسٹ کا سالانہ خریدار بننا چاہتا ہوں۔مجھے اُردو ڈائجسٹ ارسال کر دیجیے۔
1۔بذریعہ وی پی میں سالانہ قیمت پوسٹ مین کو ادا کر دوں گا۔یا
2۔میں مطلوبہ رقم ---------- روپے کا بینک ڈرافٹ / منی آرڈر ارسال کر رہا ہوں۔یا
3۔میں نے ------ روپے اُردو ڈائجسٹ کے اکاؤنٹ نمبر IBAN#-Pk18 BPUN 1100 0280 0380 0000 بینک آف پنجاب سمن آباد میں آن لائن جمع کروا دیے ہیں۔یا
4۔ہماری ویب سائٹ پر جا کر سبسکرپشن فارم پُر کریں اور ہمیں ای میل کر دیں۔یا
5۔ہمیں 0300-4005579 پر ایس۔ایم۔ایس کریں۔ہمارا نمائندہ آپ سے رابطہ کرے گا۔
تاریخ ---------------- دستخط ----------------

اُردو ڈائجسٹ۔سرکولیشن منیجر۔325,G-III جوہر ٹاؤن لاہور' پاکستان
فون نمبر: +92-42-35290734-8,+92-42-35290707

نہیں لبنیٰ بیگم۔ تم سمجھتی کیوں نہیں؟ تمہاری عقل گھاس کھانے چلی گئی ہے؟ تمہارے شادی کے جوڑے پڑے ہوئے ہیں' وہ استعمال کرو۔''

''وہ پرانے ہوگئے ہیں۔ میں تین چار بار انہیں مختلف تقریبات میں پہن چکی۔'' وہ دکھ سے روہانسی ہو رہی تھی۔

''کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایک دن ہوتا ہے۔ کسی کو یاد نہیں رہتا کہ کس نے کیا سوٹ پہنا تھا۔ اچھا اب میرا وقت مت ضائع کرو..... میں یہ نئی بک بک سننے نہیں کھڑا ہوا۔ میرے اور بہت کام ہیں۔ بہت مسائل ہیں۔ بیویوں کو مرد کے مسائل سمجھنے چاہئیں۔ میں ایک پلاٹ بیچ کر اس سے بڑے پلاٹ کا سودا کر رہا ہوں۔ اچھا دروازہ بند کرلو۔ میرا ایسے منہ نہ دیکھو۔ سودا لے آوں گا۔''

اس نے لڑکھڑاتے قدموں سے جا کر دروازہ بند کیا۔

''میں کیا اچھی بیوی نہیں یا میں اس کے مسائل سمجھ نہیں پا رہی۔ وہ پلاٹ پہ پلاٹ بیچ رہا ہے' خرید رہا ہے..... اور ہر وقت پیسے کی تنگی کا شکار بھی ہے۔ وہ کہتا ہے' میں پہلے سے بڑا سودا کر رہا ہوں۔ اچھی جگہ پلاٹ لے رہا ہوں۔ میں ایسے وقت کیا کروں؟ صبر..... صرف صبر..... یہ وقت گزر ہی جائے گا اور شاید ہم خوشحال ہو جائیں۔

شادی کے ہنگاموں میں وقت گزر گیا۔ بہنوں اور بھابیوں نے ایک بار ضرور پوچھا ''آپا کوئی نیا سوٹ نہیں سِلوایا آپ نے؟''

اپنی عزت بچانے کو اس نے کہہ دیا۔ ''درزی کو دیا تھا۔ عین وقت پہ سِل کر ہی نہ آیا۔ ہم نے اِدھر آنا تھا۔ جلدی میں.....''

''ہاں کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے..... عین موقع پر درزی دھوکا دے جاتے ہیں۔''

شادی کے بعد میکے اور بھائیوں کی طرف سے تین سوٹ اسے مِل گئے لیکن وہ خوش ہوتے ہوئے بھی مغموم تھی.....

اگلے چند برسوں میں وہ تین بچوں کی ماں بن گئی..... مصروفیات کا پہاڑ تھا جو اُسے صبح سے شام تک سَر کرنا ہوتا..... گھر کی ضروریات مزید بڑھ گئی تھیں۔ اپنے گھر کو سجانے سنوارنے کا شوق کہیں جا کر چھپ گیا۔ وہی چند روزمرہ کی چیزیں' وہی پرانے پردے' پرانا سیکنڈ ہینڈ کارپٹ اور پرانے صوفے۔ چھوٹی نند افشاں اس کے پاس رہنے آئی تو گھر کی اُڑی اڑی سی حالت دیکھ کر بات کیے بغیر رہ نہ سکی۔

''بھابھی' ہمارے بھیا لکھ پتی ہیں اور آپ کا رہن سہن ایسے ہے جیسے اللہ معاف کرے کوئی غریب بھٹیارا ہو۔ آپ کو پتا ہے بھابھی' نسرین جن کے میاں صرف تنخواہ دار ہیں' انہوں نے تو کمال کر دیا۔ ایسا گھڑا پاہے ان میں کہ کیا بتاؤں۔ نئے پردے لیے ہیں۔ صوفہ لیا ہے۔ باورچی خانے میں نئے برتن اور الیکٹرک کا سامان تک قسطوں پہ لے آئی ہیں۔ بھابھی بُرا نہ منانا۔ نہ تو آپ کے کپڑے اچھے ہیں نہ بچوں کے اور گھر کی حالت بھی بہت تکلیف دہ لگ رہی ہے۔ دس سال ہو گئے ہیں بھیا کو ٹھیکیداری کرتے ہوئے۔ سنا ہے بڑا بنگلہ تیار کرنے کے موڈ میں ہیں۔ آج کل نقشے وغیرہ دیکھے جا رہے ہیں۔''

''بس دُعا کرو اللہ اپنا گھر عطا کر دے۔''

''بھابھی گھر ضرور اللہ آپ کو دے گا لیکن گھر میں ذرا چمک تو پیدا کریں۔ یہاں آ کر طبیعت بجھ گئی۔''

''تمہارے بھائی میرے ہاتھ پہ کچھ رکھیں تو میں بچت کروں۔''

''چلیں آج بھائی کو آنے دیں۔ میں خود بات کروں گی۔''

وہ یہ بات کہنا نہیں چاہ رہی تھی۔ مُنہ سے خود ہی نکل گئی تھی۔

دوسرے کمرے میں دونوں بہن بھائی کے درمیان زور وشور سے بحثا بحثی ہو رہی تھی۔ ''میں اُسے تمام راشن ڈال دیتا

اوں۔ اُسے سودا لینے گھر سے باہر نہیں جانا پڑتا۔ نہ خود کمانا پڑتا ہے۔ اسے میں نے بہت خوش رکھا ہوا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ اپنے کام سے کام رکھو۔ جتنا کما رہا ہوں ان پر ہی لگا رہا ہوں۔ بے شک پوچھ لو.....'' ان دونوں میں جھڑپ ہوتے ہوتے بچی تھی۔

لبنیٰ کا دِل دھڑکنے لگا تھا۔ تو وہ اب صفائیاں دے گی کہ نہیں وہ بہت خوش ہے۔ اسے کوئی تکلیف نہیں وغیرہ وغیرہ اور ایسے ہی ہوا۔ وہ کمرے میں آئے تو وہ سوتی بن گئی۔ ''اوہ یہ تو سو گئی ہے۔''

''دیکھو تم ہمارے گھریلو معاملات میں دخل اندازی مت دو۔ ہمارا گھر بہت اچھے طریقے سے چل رہا ہے۔''

وجاہت نے غرّا کر بہن سے کہا۔

''اچھا بھائی ٹھیک ہے۔ پھر ایسا کریں مجھے چار ہزار دے دیں۔ میں نے بھابھی کے ساتھ بازار جانا ہے۔ کچھ شاپنگ ہو جائے گی۔''

وجاہت کو دفتر بھیج کر اپنے بچے لیے وہ نند کے ساتھ رکشے میں بازار جا اتریں۔ جگ مگ بازار کی رونقیں اُسی طرح پرکشش تھیں۔ اتنے لمبے عرصے بعد بازار جا کر اُسے بہت مزہ آیا تھا۔ لبنیٰ نے نند کے سنگ جی بھر کر لطف اٹھایا۔ جہاں پیاس لگی وہاں کوک پی۔ جہاں بھوک لگی وہاں چاٹ کھائی اور شفو تو تھی ہی بڑی نٹ کھٹ..... دکانوں پہ خوب بھاؤ تاؤ کیے۔ بچوں کے کپڑے' اپنے سوٹ اور ایک ننھا سا ڈیکوریشن پیس لیا۔ ہاتھوں میں مونگ پھلی اور چپس کے پیکٹ پکڑے وہ کھاتے کھاتے ساتھ ساتھ گھومتی رہیں۔ بازاروں کی چمک دمک، ریل پیل، شور شرابہ، ہلا گلا سب اُسے بہت اچھا لگ رہا تھا' بے حد جاندار!

لبنیٰ کے اندر جیسے سوئی ہوئی روح اس ہلچل سے بیدار ہو گئی تھی۔ وہ دونوں خریداری کر کے لوٹیں تو اگرچہ بہت تھکی ہوئیں مگر بے حد تازہ دم تھیں۔ شفو نے آتے ہی نفیس ڈیکوریشن پیس کوٹی وی کی زینت بنا دیا۔ یہ ایک گھڑی تھی۔ اس کے ساتھ کیلنڈر رکھی تھا۔ درمیان میں تصویر لگانے کی جگہ خالی تھی۔ لبنیٰ نے اپنی شادی کی تصویر پرانے فریم سے نکال کر اس جگمگاتے فریم میں لگا دی اور یہ پیس اتنا مہنگا بھی نہیں تھا۔ کتنا پیارا لگ رہا تھا۔ رات کو اشیاء دکھائی گئیں۔ خریداری دیکھ کر اس نے خاص خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ بس ملا جلا سا تاثر تھا۔ دو روز بعد شفو واپس چلی گئی۔ کتنی رونق تھی اس کے دم سے۔ وہ شفو کو بھیج کر بہت اداس ہو رہی تھی۔

شفو کے جانے کے دوسرے دن وہ جلدی جلدی اپنے بالوں میں برش کر رہی تھی۔ بچے اسکول جا چکے تھے۔ وجاہت رات کو کسی پارٹی میں مدعو تھا۔ وہ دیر سے گھر آیا تھا۔ اب صبح کے آٹھ بجے تک محوِ خواب تھا۔ وہ اس کے اُٹھنے تک کچھ کام نپٹا لینا چاہتی تھی۔ تبھی وہ اُٹھ بیٹھا۔ کسلمندی سے چپل پاؤں میں ڈالے وہ باتھ روم کی طرف جاتے جاتے ٹی وی کے پاس رک گیا۔ لبنیٰ نے دیکھا' وہ بہت غور سے اس کا لایا ہوا شوپیس دیکھ رہا تھا۔

''پسند آیا جناب'' وہ لہکی.....

''اب سچ کہوں گا تو مرچیں لگ جائیں گی۔''

اُسے اس تلخ لہجے کی توقع نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا وہ تعریف کرے گا۔ عرصے بعد کی جانے والی شاپنگ کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے گا۔ آخر وہ اس کی بیوی تھی۔ رفیقِ سفر تھی۔ اس کا حق تھا شوہر کی کمائی پر..... اسے اختیار تھا اپنی پسند کی چیزیں لینے کا! شفو نیم طرار باتیں کر کے اسے جھنجھوڑ گئی تھی۔ وہ ساری باتیں اس کے دماغ میں تازہ تھیں۔ چنانچہ وہ اپنے دِفاع میں بولنے کو تیار تھی۔

''ک۔ کیا ہوا.....؟'' وہ جارحانہ انداز میں بولی۔

''فضول سی چیز اُٹھا لائی ہو۔ اور چاہتی ہو کہ میں اس کی تعریف بھی کروں۔

شفو کو یہ پٹی تم نے پڑھائی تھی کہ میں تمہیں پیسے نہیں دیتا

تاکہ تم اپنی مرضی سے کوئی چیز نہ خرید سکو۔ آخر میں جو اتنے پیسے کمار ہا ہوں تو اپنے سر میں مارنے کے لیے کما رہا ہوں؟ تمہارے اور بچوں کے لیے ہی خون پسینا ایک کر رہا ہوں مگر وہ مجھ سے لڑ جھگڑ کر تمہارے لیے چار ہزار مانگ کر لے گئی۔ چلو تمہیں ضرورت تھی۔ تمہاری روٹی ہضم نہیں ہو رہی تھی تو تم مجھ سے پیسے مانگ لیتیں۔ مجھے تم نے ضرور ذلیل کروانا تھا اس کی نظروں میں؟ وہ کیا سمجھے گی کیسا خاوند ہے جسے بیوی کی پروا ہی نہیں۔ تم نے آخر ایسا کیوں کیا؟ تمہیں جو ضرورت تھی مجھے کہتی۔ سارے گھر کا سودا سلف' یہ بجلی پانی فون کے بل ادا کرتا ہوں نا..... پھر اس کے آگے رونے کی کیا ضرورت تھی؟ اب چار پانچ ہزار کو آگ لگا کر آ گئی ہو تو تمہیں خوشی ہو رہی ہے۔ آخر کیا لائی ہو؟ یہ دو تین گل دان' چند پھول' چند جوڑے' کپڑے' کچھ جوتیاں۔ ان کے بغیر بھی تو گزارہ ہو رہا تھا۔ بولو ہو رہا تھا نا تو پھر خواہ مخواہ اتنی فضول خرچی۔''

برش لبنیٰ کے ہاتھوں سے گر گیا۔ لمبے کھلے بال پنکھے سے اڑ اڑ کر اس کے شانوں کو ڈھانپنے لگے جیسے غم کی سیاہ چادر ہوں۔ وہ اداسی کا پیکر لگ رہی تھی۔ وہ بولی ''یہ کیا کہہ رہے ہو وجاہت؟ میں تمہیں تمہاری ایک ایک بات کا الگ الگ جواب دوں گی۔ شفو کو میں نے نہیں کہا تھا تم سے پیسے مانگے۔ اس نے خود ہی ایسا کیا اور کیا یہ فضول خرچی ہے؟ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ تم کہہ رہے ہو۔ مجھے پتا ہوتا تم نے غصے سے پیسے دیے ہیں تو میں کبھی اس کے ساتھ بازار نہ جاتی۔ میں لعنت بھیجتی اس پیسے پہ'' وہ بُری طرح رو رہی تھی۔ اس کا جسم آندھیوں کی زد میں پتے کی طرح شدتِ گریہ سے لرز رہا تھا۔

''اتنا اونچا مت بولو میرے آگے۔ مت نام لو شفو کا۔ تم میں اور شفو میں بہت فرق ہے۔ وہ ابھی شادی شدہ نہیں۔ اس پر گھر کی ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں ہے۔ تمہارا اور اس کا کیا مقابلہ ہے۔''

''میرا اپنی ذات پر تو حق ہے نا.....'' وہ ایسے تڑپ کر بولی جیسے آواز میں روح کی چیخ بھی شامل ہو گئی ہو۔

وجاہت چند لمحے اسے گھورتا رہا۔ پھر لہجے کو نرم کرتے ہوئے بولا ''میں کب کہتا ہوں تمہارا حق نہیں۔ دیکھو جو کما رہا ہوں تمہارا ہی تو ہے۔ صرف چند سال اور صبر کر لو۔ میں گھر کے لیے پلاٹ ڈیفنس میں لینا چاہتا ہوں۔ آج کل سودا طے ہو رہا ہے۔ لے چلوں گا تمہیں دکھانے۔ ذرا بات پکی ہو لینے دو۔''

وہ ڈریسنگ ٹیبل پہ سر رکھے روتی رہی۔ شادی کے بعد ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

''اپنے گھر کے لیے کنال کا پلاٹ لے رہا ہوں اور تمہیں خوشی نہیں ہو رہی۔'' یہ کہتے ہوئے وجاہت اس کے قریب بیٹھ گیا اور بڑی آہستگی سے اس کے بکھرے بال سمیٹنے لگا۔

''آپ کو مجھے پہلے بتانا چاہیے تھا۔ میں یہ ہرگز نہ خریدتی۔'' ہچکیوں سسکیوں کے درمیان بمشکل بولی۔

''تمہیں کیا پتا میں کیسی محنت سے بھاگ دوڑ کر رہا ہوں۔ میری خواہش ہے تمہیں اور بچوں کو ڈھیر ساری خوشیاں دوں۔ تم لوگ اچھے گھر میں رہو۔ میری زندگی میں بھی اور میرے بعد بھی۔'' وہ بڑی نرمی سے سمجھانے کے انداز میں اس کا ہاتھ پکڑے بول رہا تھا۔

وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔

''مجھے ایسے مت دیکھو۔ چلو اب مسکرا دو۔ میں تمہاری آنکھوں میں یہ ستارے نہیں دیکھ سکتا۔ تم تو میری جان سے بھی زیادہ قیمتی چیز ہو۔ پیسا تو کوئی چیز نہیں۔ یقین کرو میرا سارا پیسا تمہارا ہی ہے۔ بس یہ مشکل دور گزر جانے دو۔ پھر دیکھنا میں تمہیں کس طرح ڈھیر ساری شاپنگ کرواؤں گا۔''

ہاں وہ اس کا وجاہت تھا' اس کا اپنا وجی! اس کے ہونٹ مسکرانے لگے۔ معاف کر دینے والی بے حد خوبصورت مسکراہٹ لیے اس نے اپنا سر شوہر کے شانے پہ ٹیک دیا۔ شاید وہ سچ کہہ رہا تھا۔ اس کی محبت کی سرشاریاں اور بے تابیاں اسی طرح تھیں۔ وہ مطمئن ہو گئی۔

وقت کی گاڑی تیز رفتاری سے گزرتی چلی جا رہی تھی۔ بچے اب بڑے ہو رہے تھے۔ پہلے وہ کام کرتے کرتے بے سدھ سو جایا کرتی تھی۔ اب بوکھلائی بوکھلائی رہنے لگی۔ اس نے صفائی والی ملازمہ رکھ لی لیکن ڈھیروں چھوٹے چھوٹے کام تھے جنہیں اُسے ہی سنبھالنا تھا۔ ان کی اسکول کی تیاری، یونیفارم، پڑھائی، کپڑوں کی دھلائی استری، مہمانوں کی دیکھ ریکھ.....

''یہ تمہیں ہوش ہے گھر کا.....'' وہ صبح صبح چیخا۔ وہ کچن سے بوکھلائی ہوئی نکلی..... ''میری قمیص کا بٹن ٹوٹا ہوا ہے مگر تمہیں پروا ہی نہیں ہے۔''

''ابھی لگاتی ہوں۔'' وہ سوئی دھاگا لیے پلٹی۔ ''اپنی تو تمہیں بہت پروا ہوتی ہے کہ تمہارے پاس کس چیز کی کمی ہے تاکہ باہر سے کوئی نند یا رشتہ دار آئے تو تم اُسے کہہ سکو۔''

''اف میرے اللہ وہ سال گزشتہ کی بات دہرا کر زہر اگل رہا تھا۔ ''اگر مجھے معلوم ہوتا آپ کو اتنا بُرا لگا تھا پیسے دینا! میں مر جاتی لیکن شفو کے ساتھ کبھی نہ جاتی۔''

''چلو اب ٹرٹر مت کرو..... جلدی لگاؤ.....''

وہ بٹن لگاتے ہوئے سوچنے لگی' کاش کوئی ایسا سوئی دھاگا بھی ہوتا جس سے اپنے دل کے بے شمار سوراخوں کو بھی سی سکتی۔

وقت کی گاڑی بے آب و گیاہ، چٹیل ریگستان سے گزر رہی تھی۔ باہر دھول تھی۔ اس کا حلق ریت اور مٹی سے بھر گیا تھا۔ آنکھوں میں بھی جلن ہونے لگی تھی۔ اس نے من کی کھڑکی بند کر دی جس سے روح کی گھٹن کا احساس اور دو چند ہو گیا۔ اس کی شادی کو پندرہ برس بیت گئے تھے۔ رشتے دار احباب بازار جانے کا کہتے' وہ انکار کر دیتی۔ اگر جانا بھی پڑ جاتا تو الگ تھلگ خاموش بے حس سی کھڑی رہتی۔ کتنے فیشن آئے اور بدل گئے۔ اب سسرال یا میکے سے کسی نے اسے عادتاً یا طنزاً کہنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کی بہن، بھابھیاں دیورانیاں جدید فیشن کے ستھرے کپڑوں میں کتنی تروتازہ اور بااعتماد نظر آتی تھیں حالانکہ ان کے میاں تنخواہ دار ملازم تھے۔

''بس آپا..... ہمارا تو یہ ہے کہ جو آیا کھایا پیا۔ موج اڑائی اور اگلے مہینے کی تنخواہ کا سوچنے لگے۔'' وہ کہا کرتیں ''ہماری آپا تو سادہ کی سادہ ہی رہیں۔''

''سادہ مگر لکھ پتی۔'' اس کی نند چوٹ کر جاتی۔

''بھئی ایسے تو نہیں پیسے جڑتے۔ کنجوسی تو کرنا ہی پڑتی ہے نا!''

''بھئی آپا مبارک ہو۔ سنا ہے تمہارے میاں نے زرعی زمین بھی خریدی ہے۔ کوئی باغ واغ لگانے کا ارادہ ہے کیا؟''

وہ صرف سر ہلا کر رہ گئی۔ واقعی اس کے میاں نے پلاٹ بیچ کر ایک زرعی زمین کا سودا طے کیا تھا۔ اب اُس زمین کی کاشتکاری اور پھل کا باغ لگانے کے متعلق مشورے ہو رہے تھے۔ وجاہت کا ہاتھ اس لیے بھی تنگ تھا کہ یہ کافی بڑا سودا تھا۔ ٹیکس اور عشر کی مد میں کافی رقم خرچ ہو گئی تھی اسی لیے وہ چڑچڑا بھی ہو رہا تھا۔

وقت کی گاڑی اپنی مخصوص رفتار سے چلتی رہی۔ اپنے بچوں کے لیے اُسے اب ڈھیر ساری چیزوں کی ضرورت تھی۔ بچیوں کے کپڑے، جوتے اور یونیفارم۔ وجاہت اُسے بچوں کے لیے شاپنگ کرنے کے پیسے دینے لگا تھا لیکن یہ اس کا حکم تھا کہ خریدی ہوئی تمام چیزوں کے بل بنوا کر لاؤ تاکہ بقایا رقم کا حساب اُسے واپس کیا جا سکے..... کبھی کبھی چھوٹی سی بات پہ تلخی ہو جاتی..... کبھی وہ اچانک چیخنے لگتا۔ ''یہ گھی کیوں اتنا استعمال ہو رہا ہے؟ یہ آٹا اتنی جلد کیسے ختم ہو گیا؟ یہ پتی کیوں اتنی جلدی اُڑ گئی؟''

وہ کہتی ''اللہ کا واسطہ وجاہت مجھے ان کانٹوں میں مت گھسیٹو..... مجھ سے آنے آنے پائی پائی کا حساب نہیں رکھا جاتا۔ میں پانچ بچوں کی ماں ہوں۔ میرا آئے گئے والا گھر ہے۔ آئے روز بچوں کے دوست اور سہیلیاں آ جاتی ہیں۔ پھر

کیوں مجھ سے ایسے سوال پوچھتے ہو۔ مجھے دُکھ ہوتا ہے۔''

''میں ذمے دار ہوں نا..... اس لیے پوچھتا ہوں۔ دس ہزار کا راشن ڈال کر دیا تھا۔ ابھی مہینا ختم نہیں ہوا تم نے نوٹس دے دیا۔ پوچھنا میرا حق ہے۔ تم سے نہ پوچھوں تو کس سے پوچھوں۔''

وقت کا پہیہ پٹڑیوں کو روندتا گزرتا رہا۔ شاید ان پٹڑیوں کی قسمت میں روندے جانا ہی لکھا ہے۔ اس کی شادی کو اٹھارہ برس گزر گئے۔ بچے کالجوں میں جا پہنچے۔ اس دن جیٹھ شفقت بھائی اور بھابھی میمونہ بچوں کے ہمراہ ملنے آئے۔ اگلے روز ان کا پروگرام مری جانے کا تھا۔ رات کو دیکھا تو شفقت بھائی ہاتھوں میں بہت سے ڈبے اُٹھائے اندر داخل ہو رہے ہیں؟

''ہاں یہ کیا؟'' جیٹھانی کی حیرت بھری آواز اُبھری۔

''ارے بھول گئیں رانی' آج ہماری شادی کی بائیسویں سالگرہ ہے۔''

''اوہ ہاں۔''

''میں یہ چیزیں لایا ہوں کھانے پینے کی۔ شام کو فرسٹ کلاس چائے ہوگی اور جناب آپ کے لیے یہ ایک بے حد معمولی تحفہ' ایک پرس..... کیونکہ ہماری جیب کی حیثیت ہی اتنی ہے ورنہ آپ کو اس سے بھی اچھا تحفہ دیتے۔ چلیے اللہ نے چاہا تو شادی کی سلور جوبلی پر ایک چھوٹی سی تقریب کا اہتمام کریں گے اور یہ ہیں پھولوں کے گجرے۔ آپ جب تیار ہو جائیں تو ان کو باندھ لیجیے گا۔''

وہ باورچی خانے کے دراز ے میں کھڑے ہو کر نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اس کی جیٹھانی میمونہ خوشی سے گلنار تھی۔

''آپ نے یہ تحفے کا تکلف کیوں کیا؟ کیا ہر سال تحفہ دینا ضروری ہے؟ بہت پیارا پرس ہے۔ سچ آپ بڑے چالاک ہیں' ہر دفعہ پہل کر جاتے ہیں۔ میں سوچتی رہ جاتی ہوں۔

اِدھر آؤ لبنیٰ' دیکھو تمہارے بھیا نے کیا کچھ کر ڈالا۔ میں سمجھی تھی ہم یہاں آئے ہوئے ہیں تو.....:

''تو یہ سالگرہ گول کر جائیں گے۔ ہے نا'' شفقت بھائی بیچ میں بول پڑے۔

خوشی انسان کو کتنا نکھار بخش دیتی ہے آج اُسے معلوم ہوا کہ جیٹھانی اس کی نسبت زیادہ جوان اور اسمارٹ اسی لیے ہی نظر آتی ہے۔ مالی جن پودوں کی حفاظت کرتا ہے' میٹھی پھوار سے ان کی سیرابی شادمانی کا سامان کرتا ہے' وہ پودے کبھی نہیں مرجھاتے۔

شفقت بھائی نے وجاہت کو حیرت زدہ کرنے کے لیے فون کیا۔ ''بھائی جان میں بہت مصروف ہوں میں دو گھنٹے ٹھہر کر آجاؤں گا۔'' انھوں نے کہا۔

''نہیں بھئی' ابھی آنا ہوگا۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر۔ تمہارا کون سا دفتر لگا ہوا ہے۔ مرضی کے بادشاہ ہو۔ جلدی آجاؤ۔ ایک بہت ضروری کام ہے' بہت ضروری..... ہاں..... فون پر نہیں بتا سکتا۔ نہیں نہیں پریشانی کی کوئی بات نہیں بلکہ خوشی کی بات ہے۔ آرام سے گاڑی چلانا۔ ہاں او کے۔ تم پہنچ رہے ہونا۔ آدھے گھنٹے کے اندر ہم تمہارا انتظار کریں گے۔''

وجاہت شام کو گھر پہنچا تو سارے گھر کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا..... ڈرائنگ روم میں ہلکی موسیقی بج رہی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پر انواع واقسام کی چیزیں چنی تھیں۔ لبنیٰ اور اس کی جیٹھانی نے مل کر سینڈوچ اور کباب تیار کر لیے تھے۔ شفقت میز درست کرنے میں مدد کر رہا تھا۔ وجاہت نے آتے ہی یہ سب کچھ دیکھا اور چونکا۔ آج بچے اور لبنیٰ بڑے خوش نظر آرہے تھے۔ اتنے میں بڑی بھابھی اندر سے نکلیں۔ اچھا سا میک اَپ، کمال کا سوٹ پہنے۔ بانہوں میں گجرے لپٹے ہوئے۔

''یہ آج کیا ہو رہا ہے۔ آخر.....'' وجاہت نے حیرت سے پوچھا۔

''وجاہت آگیا ہے۔'' بھابھی نے جواب دینے کے بجائے بہ بآواز بلند اطلاع دی۔

''واہ بھئی کمال کر دیا۔ بس تمہارا ہی انتظار تھا۔ شکر ہے وقت پر پہنچ گئے۔'' شفقت بولے۔ سب چہک رہے تھے۔ سب اس کی آمد پر ایسے کھِل اُٹھے تھے جیسے وہ مہمان خصوصی ہو۔

''بھی کچھ پتا تو چلے'' وہ بہت حیران سا ہو رہا تھا۔ ''یہ سب کیا.....''

''بات یہ ہے کہ آج دس مارچ ہے۔''

''دس مارچ ہے تو پھر؟''

''ابے نالائق، آج میری شادی کی بائیسویں سالگرہ ہے۔ سب اچھی سی چائے کے بعد لمبی ڈرائیو پہ جائیں گے۔ کسی باغ کے کونے میں بیٹھیں گے۔ رات کا کھانا اگر دل چاہا تو باہر ہی کچھ ہلکا پھلکا کھا کر ہی لوٹیں گے۔''

رات تک خوب رونق ہلا گلا رہا..... موبائل سے تصویریں بنائی گئیں۔ رات گئے وجاہت اپنے کمرے میں لوٹا تو اس کا موڈ آف تھا۔

''آج ایسے ہی بلا کر میرا قیمتی وقت ضائع کر دیا۔ کراچی سے میرے پارٹنر کا فون آیا تھا۔ وہی میرا پرانا دوست! بتا رہا تھا کہ فیصل آباد کپڑے کی مل بک رہی ہے۔ مالک ضرورت مند ہے۔ وہ کہہ رہا تھا' زمین فوراً بیچ کر اس مل کا سودا کر لو۔ میرے پاس پچاس لاکھ تو زمین کے آجائیں گے۔ ڈیفنس والا پلاٹ بھی اگر بیچوں گا تو وہ بھی ساٹھ ستر لاکھ تو دے گا لیکن مجھے دو کروڑ کی ضرورت ہے۔ بانڈ لے رکھے ہیں۔ بیس تیس لاکھ کے ہیں۔ پانچ لاکھ پھر بھی کم پڑ رہے ہیں۔ کسی سے ادھار مانگنے کا سوچ رہا ہوں۔ پتا نہیں کوئی پانچ لاکھ ادھار دے نہ دے۔ لوگوں کے پاس تو کھلا پیسا ہے۔ اگر یہ موقع نکل گیا تو میرا مل اونر بننے کا خواب کبھی پورا نہیں ہو سکے گا۔ میں سوچ رہا ہوں' کسی سے ادھار نہ مانگوں۔ تمہارا زیور اس موقع پر کام آجائے گا۔ فکر نہ کرنا' تمہیں ایک سیٹ نہیں کئی سیٹ بنوا دوں گا بلکہ ہیروں سے لاد دوں گا۔ دنیا دیکھے گی' کس کی بیوی' کس شان سے جا رہی ہے۔''

وہ خاموشی سے اُٹھی۔ الماری کھولی اور تمام زیورات اپنے ناخدا کے آگے ڈھیر کر دیے۔ دس پندرہ تولے سے بھی زیادہ سونا تھا۔ ان وقتوں کا جب لوگ بھاری زیور ڈالا کرتے تھے۔ لمبے لمبے بھاری سہ لڑیا ہار' لمبے لمبے آویزے' گلوبند، کڑے، جھومر، نتھ، کلپ.....

کتنی بار لبنیٰ کا دل چاہا تھا کہ اپنے پُرانے زیور بیچ کر ان کی جگہ چھوٹے' ہلکے اور نفیس سے سیٹ بنوالے مگر وجاہت نے اس کی بات پر کبھی کان ہی نہیں دھرے تھے۔ آج اُسے اچانک یہ سارے زیور بہت پیارے لگے۔ یہ سب اس کے سہاگ کی نشانیاں تھیں۔ ان سب زیورات کے پیچھے ایک پیار بھری کہانی تھی۔ امی کے گھر کا زیور کچھ نانی اماں نے دیا تھا۔ ایک سیٹ ابو خرید کر لائے تھے۔ اس دن وہ کتنی شرمندہ سی ہو کر سوچ رہی تھی' ہم لڑکیاں ساری عمر ماں باپ پر بوجھ کیوں بنی رہتی ہیں؟ وہ ہمیں پڑھاتے لکھاتے ہیں۔ اچھا اوڑھنے کو دیتے ہیں۔ ہم پر لاکھوں روپے لٹا دیتے ہیں۔ جہیز کی صورت اور ہم بیٹیاں کیا دیتی ہیں' کچھ بھی نہیں' کچھ بھی تو نہیں۔''

اُسے اپنے متوسط درجے کے ابو پر بہت ترس اور رحم آرہا تھا جب وہ بھاگ بھاگ کر اس کے لیے جہیز کا سامان اکٹھا کر رہے تھے۔

''میں یہ سب کچھ نہیں لوں گی.....'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

''ہشت پاگل۔ ہم یہ خوشی سے دے رہے ہیں۔ والدین کی طرف سے تحفہ۔''

''کیا سوچنے لگیں؟'' وجاہت کی آواز اُسے حال میں لے آئی۔

''آپ سارا زیور لے جائیں۔ میرا زیور تو آپ ہیں۔''

"واقعی۔" وجاہت مسکرا دیا اور زیور پوٹلی میں باندھنے لگا۔

"کیا آپ کو یاد ہے آپ نے مجھے کون سا تحفہ دیا تھا؟"

"شاید یہ کڑے تھے۔"

"شاید نہیں یقیناً۔" وہ یہ کڑے بیچنا نہیں چاہ رہی تھی۔

یہ موٹے موٹے کڑے اس نے کافی عرصہ پہنے بھی تھے۔ جب وہ کچھ خراب ہو گئے تو اُس نے اتار کر رکھ دیے۔ وجاہت کو ٹھیک کروانے کا کبھی نہ وقت ملا نہ خیال آیا۔

"آپ کو یاد ہے، آپ سے گھبراہٹ میں کڑے پہنائے نہیں جا رہے تھے اور....."

وہ بہت دور، بہت پیچھے ماضی میں کھو گئی۔ اس کی آنکھیں ٹھیکیدار برنس مین وجاہت کے اس پار اپنے وجی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اس کے کان کسی گم گشتہ جزیرے سے آتی ہوئی محبت کی میٹھی آواز سُننا چاہ رہے تھے۔ وہ اس پیاسے کی طرح صحرا میں ریت کی تہیں کھرچ کھرچ کر ہٹا رہی تھی جیسے کسی مدفون میٹھے چشمے کا یقین ہو۔ "آپ نے کتنی مشکلوں سے مجھے پہنائے تھے اور مجھے ہنسی آ گئی تھی۔"

وہ لگاتار ریت ہٹا رہی تھی۔ وہاں وقت کی تہ کے نیچے اس کی محبت کا خزانہ چھپا تھا۔

"اچھا، اچھا مجھے کچھ یاد نہیں..... تم پتا نہیں کیا کہہ رہی ہو۔ میرا دماغ اس وقت الجھا ہوا ہے۔ اللہ کرے یہ پانچ یا سات لاکھ تک میں بک جائیں۔ ورنہ پھر کسی سے کسی سے ادھار مانگنا پڑے گا۔ آج خواہ مخواہ مجھے بلا کر میرا وقت ضائع کیا۔ میں نے آج شام اپنے دوسرے پارٹنر کے ساتھ میٹنگ کرنا تھی۔ پتا نہیں شفقت بھائی کو اپنی شادی کی سالگرہ اس دھوم دھام سے منانے کی کیا سوجھی؟"

"وہ تو ہر سال شادی کی سالگرہ مناتے ہیں۔"

"فضول رسمیں ہیں۔ ہم کوئی انگریز تھوڑے ہی ہیں کہ یہ رسمیں مناتے پھریں۔"

"یہ تو تجدید محبت کا دن ہوتا ہے۔ قابل رشک ہے ان کی زندگی۔"

"ایسے محبت نہیں ہوتی؟ کوئی ڈراما ہی رچایا جانا ضروری ہے بھلا محبت کے اظہار کے لیے۔"

"میرے مجازی خدا.....! کیا تو زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے اپنا دامن نہیں بھر سکتا۔ تو بڑی بڑی خوشیوں کے تعاقب میں آج کی ننھی کلیوں اور خوشیوں کو روندتا چلا جا رہا ہے۔ تو زندگی کی اصل خوشبو اور حُسن سے محروم ہے۔ اس نے دل میں سوچا اور یہ لفظ کانٹوں کی طرح روح میں چبھ گئے۔ اس کا حلق نمکین ہو گیا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ رو رہی تھی۔ آنسو خود بخود آنکھوں کی درزوں سے بہ نکلے تھے۔

وجاہت زیورات اپنی الماری میں رکھ رہا تھا۔ یہ اچھا ہی ہوا اس نے لبنیٰ کے آنسو نہیں دیکھے ورنہ وہ یہ سمجھتا کہ شاید وہ زیور دینے کے دکھ میں رو رہی ہے۔ وہ اٹھی اور غسل خانے جا کر اپنے آنسو دھونے لگی۔

زندگی کا سفر رکتا نہیں، دریا کے تیز بہاؤ کی طرح پتھروں کو اچھالتا، لڑھکاتا، شور مچاتا آگے جا کر پرسکون ہو جاتا اور آخر میں تھک کر سمندر کی آغوش میں پناہ لے لیتا ہے۔ بچے بڑے ہو رہے تھے۔ ان کے کالجوں یونیورسٹیوں کے اخراجات بڑھ گئے تھے۔ وجاہت اور خود اُس کی فکریں بچوں کے گرد گھومنے لگی تھیں۔

اس کے بچے بہت لائق نکلے تھے۔ پڑھ لکھ کر سب اچھے عہدوں پہ چلے گئے۔ وجاہت ہمیشہ کی طرح بہت مصروف تھا۔ اس وقت وہ آرمی کا سب سے بڑا سپلائر تھا۔ تین چار ایجنسیوں کو اس نے سنبھال رکھا تھا۔ مل میں کچھ گھپلا ہو گیا۔ اُسے اونے پونے فروخت کرنا پڑی۔ اُسے بہت گھاٹا ہوا۔ لبنیٰ نے اُسے اُس وقت ٹوٹنے سے بچایا۔ اس کا حوصلہ بلند رکھا۔ اچھی وفا شعار بیویوں کی طرح لیکن جواب میں اُسے ایک اور طعنہ بھی سننے کو ملا..... "پتا نہیں کس بُرے دل سے

زیورات دیے تھے کہ اتنا نقصان ہو گیا....."

وہ چُپ رہی..... اپنی زندگی کے ساتھ اس نے خاموش سمجھوتہ کر لیا تھا۔ اسے تو صرف چُپ رہنا تھا۔ وجاہت کا کاروبار سنبھل گیا اور ایک وقت آیا کہ بچوں کی شادیاں کر دیں۔ زندگی کے سارے کام ہوتے چلے گئے۔

اُس عید پہ سب بیٹے بیٹیاں، بہویں داماد اکٹھے ہو گئے تھے۔ بہویں آدھا دن اِدھر اور آدھا دن میکے گزارتیں۔ گھر میں چہل پہل تھی۔ رونق تھی۔ قہقہے تھے۔ جیسے سب محبتیں ایک مرکز پہ جمع ہو گئی تھیں۔ کوئی کسی شہر سے آیا تھا، کوئی کسی شہر سے۔ صبح عید تھی۔ کھانا کھانے کے بعد بیٹوں نے اپنی اپنی کاریں سنبھال لیں۔

"امی، ہم کچھ ضروری شاپنگ کرنے جا رہے ہیں۔"

"امی آج تو میں جی بھر کے چوڑیاں پہنوں گی۔"

"میں مہندی لگواؤں گی۔"

"مجھے اپنے سوٹ کے لیے لیس لینی ہے۔ میں نے دوپٹا بھی ڈائی کروانا ہے۔"

"میں نے مُنے کے لیے نئے شوز لینے ہیں۔"

ننھی ننھی خواہشوں کی لاتعداد تتلیاں ان کے گرد رقص کر رہی تھیں۔

"ہاں ہاں جاؤ بھئی، خیر سے جاؤ۔ بچوں کا دھیان رکھنا....."

"ذرا رکو....." وجاہت نے ایک لمحے بعد انہیں جاتے جاتے روکا۔

"اپنی امی کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ عید کے لیے یہ بھی کچھ لے آئے گی۔"

"نہیں عید کے لیے سب چیزیں تو آپ لے آئے ہیں۔ دہی، گریاں، میوے، دودھ، کیک وغیرہ۔ عید کے لیے مجھے کچھ نہیں لینا۔"

وجاہت نے اُس کی سونی کلائیوں کو شاید بہت عرصے بعد دیکھا تھا۔ شاید بہت عرصے بعد دیکھا کہ اس کے کانوں میں پڑے ٹاپس بہت بدرنگے ہو گئے ہیں۔ یہ کہ اس کی انگلیاں انگوٹھیوں سے محروم ہیں۔ گلے میں سونے کی چین جو کبھی ہوا کرتی تھی، اب نہیں ہے۔ اس کے باز و خشک ٹہنیوں کی طرح بے رونق تھے اور چہرہ بجھی ہوئی راکھ کے مانند تھکا تھکا۔ اُس نے بچوں کو ایک آواز دے کر روکا:

"ٹھہرو، اپنی ماں کو بھی ساتھ لے جاؤ۔"

بچے رک گئے۔ وجاہت نے جیب سے چند ہزار کے نوٹ نکال کر لبنیٰ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "بیگم آج اپنے لیے بھی کچھ لے لو، اپنی مرضی سے۔"

لبنیٰ نے حیرت سے وجاہت کو دیکھا۔ نوٹ تھامتے ہوئے وہ زمین پر گر گئے۔ بچے رک گئے۔ ماں کا جواب سننے کے لیے۔

"نہیں آپ لوگ جاؤ..... میں نے نہیں جانا۔" اس نے ٹھوس لہجے میں کہا

"کیوں بھئی..... کیوں نہیں لیے تم نے پیسے..... چلی جاؤ نہ۔"

لبنیٰ کا چہرہ پتھر کی طرح سخت ہو گیا۔ آنکھوں میں اُداسیوں کے کھنڈر کا پٹ کھل گیا جسے بہت عرصہ ہوا اس نے خاموشی اور بے حسی کی سِل سے بند کر دیا تھا۔

"وجاہت! میں نے بہت عرصہ پہلے ایک شعر پڑھا تھا۔ آج تمہارے سوال کے جواب میں وہی شعر سناؤں گی۔ پھر آہستہ آہستہ، مدھم، ٹوٹی آواز میں اُس نے پڑھا۔

وقت پر قطرہ سے کافی ابر خوش ہنگام کا
جل گیا جب کھیت مینہ برسا تو پھر کس کام کا

ہزار ہزار کے نوٹ پنکھے کی ہوا سے زمین پر اِدھر اُدھر اڑنے لگے۔ ہوا میں اچانک گرمی اور گھٹن بڑھ گئی۔ وجاہت بڑے تاسف سے لبنیٰ کو دیکھتا رہ گیا جسے اُس نے ٹھنڈے میٹھے چشمے کے کنارے بٹھا کر بھی پیاسا ہی رکھا تھا۔

دین پر جان قربان

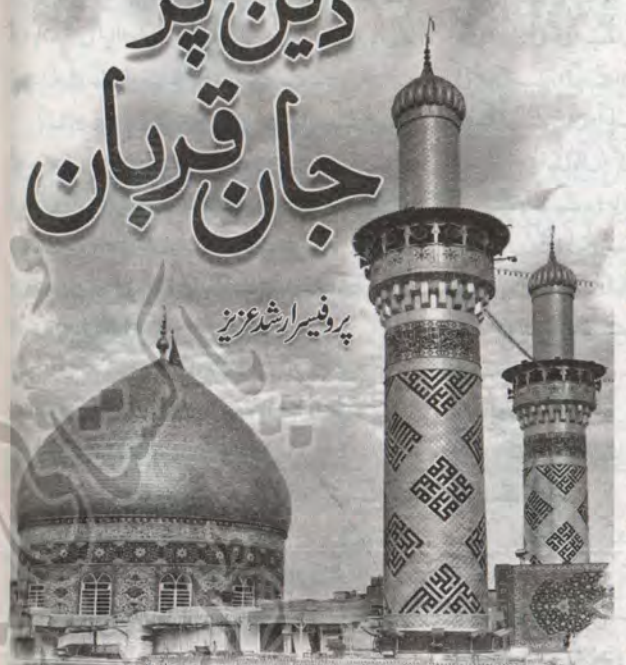

پروفیسر ارشد عزیز

اسلام کی سربلندی کے لیے سر کٹوا دینے والے نواسہ رسول ﷺ کا قصہ حیات

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ولادت باسعادت کی بشارت حضور اکرم ﷺ کے چچا، حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیوی ام فضل ؓ بنت حارث کو خواب میں دی گئی تھی۔ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ آپ ﷺ کے جسم مبارک سے ایک ٹکڑا کاٹ کر میری گود میں رکھ دیا گیا ہے۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا ''تو نے اچھا خواب دیکھا ہے۔ ان شاء اللہ (حضرت) فاطمہ ؓ کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تیری گود میں آئے گا۔''

ام فضل ؓ کہتی ہیں پھر حضرت فاطمہ ؓ نے حضرت حسین ؓ کو جنم دیا جو میری گود میں ہوتے تھے۔ (بیہقی، دلائل النبوۃ بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح)۔ یہ اشارہ حضرت امام حسین ؓ کی ولادت کی طرف تھا۔ آپ شعبان ۴ھ کو مدینہ میں پیدا ہوئے۔ خاتم المرسلین حضرت محمد ﷺ نے آپ کی تحنیک فرمائی یعنی کھجور چبا کر اس کا رس ان کے منہ میں ڈالا، کان میں اذان دی اور ان کے لیے دعا فرمائی۔ آپ ﷺ نے نواسے کا نام حسین ؓ رکھا اور ساتویں روز عقیقہ کیا۔

حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم ﷺ سے مشابہت رکھتے تھے۔ حضرت انس بن مالک ؓ سے روایت ہے لوگوں میں حسین ؓ سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کے مشابہ کوئی اور نہ تھا۔ (جامع ترمذی مترجم) حضرت انس بن مالک ؓ سے یہ بھی روایت ہے کہ میں ابن زیاد کے پاس تھا کہ وہاں حضرت امام حسین ؓ کا سر مبارک کربلا سے لایا گیا، سو وہ ان کے ناک میں چھڑی مارتا تھا اور کہتا' میں نے ایسا حسن نہیں دیکھا اور یہ کیوں ذکر کیا جاتا ہے؟ راوی نے کہا کہ میں بولا، وہ سب لوگوں سے زیادہ تر رسول اللہ ﷺ سے مشابہ تھے۔ (جامع ترمذی مترجم)

حضرت علی ؓ سے یہ روایت بھی منقول ہے کہ امام حسن ؓ سب سے زیادہ مشابہ تھے رسول اللہ ﷺ کے سینہ سے سر تک اور امام حسین ؓ سینہ سے نیچے۔ (جامع ترمذی مترجم)

امام الانبیاء حضرت محمد ﷺ کو حضرت حسن ؓ اور حضرت حسین ؓ سے بے پناہ محبت تھی۔ آپ ﷺ ان کو چومتے اور

سینہ پر لٹاتے۔ خاتم النبیین ﷺ نے دنیا میں اپنے نواسوں کو پھول اور آخرت میں جنتی جوانوں کا سردار قرار دیا۔ ایک مرتبہ حضرت حسین ؓ آپ ﷺ کے قدم مبارک پر قدم رکھ کر کھڑے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا' اوپر چڑھ آؤ۔ انہوں نے آپ ﷺ کے سینہ پر قدم رکھ دیے۔ آپ ﷺ نے منہ چوم کر فرمایا: اے اللہ میں اس سے محبت رکھتا ہوں آپ بھی اس سے محبت کیجیے۔ (الادب المفرد)۔ ایک موقع پر حضور ﷺ نے حسنین کریمین ؓ کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ جس نے ان دونوں سے محبت کی' اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے ان دونوں سے بغض رکھا' اس نے مجھ سے بغض رکھا۔ (سنن ابن ماجہ)۔ اسی طرح ایک مرتبہ آپ ﷺ نے حضرت حسین ؓ کے رونے کی آواز سنی تو فرمایا کہ ان کا رونا مجھے غمگین کرتا ہے۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ کہیں دعوت میں شرکت کے لیے جا رہے تھے۔ حضرت حسین ؓ کھیل رہے تھے۔ آپ ﷺ نے آگے بڑھ کر ہاتھ پھیلا دیا۔ وہ ہنستے ہوئے پاس آ کر نکل جاتے، بالآخر آپ ﷺ نے ان کو پکڑ لیا۔ ایک ہاتھ ان کی ٹھوڑی اور ایک سر پر رکھ کر سینہ سے لپٹا لیا، پھر فرمایا: حسین ؓ میرا ہے اور میں اس کا ہوں۔ (الادب المفرد)۔ اسی طرح آپ ﷺ اکثر حضرت حسین ؓ کو گود میں لیتے' ان کے منہ میں منہ ڈالتے اور فرماتے کہ خدایا میں اس کو چاہتا ہوں اور اس کو بھی چاہتا ہوں جو اس کو چاہے۔ (سیرۃ النبی)

قرآن مجید کی رو سے اولاد ایک آزمائش ہے۔ ایک مرتبہ حضور ﷺ خطبہ دے رہے تھے کہ حسن ؓ اور حسین ؓ آئے۔ وہ دونوں سرخ کرتے پہنے ہوئے تھے۔ چلتے تھے لیکن چھوٹی عمر اور کمزوری کی وجہ سے گر پڑتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ منبر سے اترے۔ دونوں کو اٹھایا' اپنے آگے بٹھا لیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سچ فرماتا ہے کہ مال اور اولاد تمہارے لیے آزمائش ہے۔ میں نے ان دونوں لڑکوں کو دیکھا کہ چلتے تھے اور گر پڑتے۔ سو میں رہ نہ سکا یہاں تک کہ میں نے اپنی بات کاٹی اور ان کو اٹھا لیا۔ (جامع ترمذی مترجم)

حضرت حسین ؓ نے بہت چھوٹی عمر میں قرآن پاک پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ پانچ سال کی عمر میں آپ ؓ روانی سے تلاوت کرنے لگے تھے۔ چھ سال کی عمر میں روزے رکھنا شروع کیے اور درس تجوید میں بیٹھنے لگے۔ آپ جونہی فارغ ہوتے ٹھہر ٹھہر کر غور و فکر کے ساتھ قرآن عظیم کی تلاوت کرتے۔ سات سال کی عمر تک آپ کو اپنے عظیم نانا کی محبت، صحبت اور رفاقت نصیب ہوئی۔ کسی بچے کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے عمر کا یہ حصہ انتہائی اہم ہوتا ہے۔

حضرت فاطمہ ؓ نے آپ ؓ کی پرورش اور تربیت میں کوئی کمی نہ آنے دی۔ حضرت فاطمہ ؓ کی رحلت کے بعد آپ ؓ کی تربیت اور پرورش کی ذمہ داری آپ کی نانی ام سلمہ ؓ کے سپرد ہوئی۔ اپنے والد گرامی حضرت علی ؓ سے فقہ اور حدیث کا درس لیتے۔ اس طرح آپ نے زیادہ تر تعلیم اپنے والد گرامی، باب مدینۃ العلم حضرت علی ؓ سے حاصل کی۔ حضرت حسین ؓ نے قرآن مجید کی جمع و تدوین میں بھی حصہ لیا تھا آپ ؓ نے صاحب خلق عظیم ﷺ کی آغوش میں تربیت حاصل کی اور صاحب فقر ؓ کے حلقہ درس سے مستفید ہوئے، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ ؓ کی شخصیت اعلیٰ اخلاقی اوصاف زہد و تقویٰ، شجاعت، سخاوت، رحم دلی وغیرہ سے مزین تھی۔

حضرت حسین ؓ کو خلافت راشدہ کے زمانہ میں اہم مقام حاصل تھا۔ حضرت حسین ؓ جب بچپن میں پہلی مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے سامنے آئے تو بے اختیار عقیدت و محبت میں خلیفہ اول ؓ نے فرمایا کہ علی ؓ کا بیٹا ہے لیکن مشابہ نبی کریم ﷺ کے ہے۔ عہد صدیقی میں جب حضرت خالد بن ولید ؓ کے ہاتھوں ''حیرہ'' فتح ہوا تو مال غنیمت میں سے ایک نہایت ہی قیمتی چادر حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے حضرت حسین ؓ کی خدمت میں بطور ہدیہ بھیجی جو انھوں نے بخوشی قبول کی۔

ایک مرتبہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے ساتھ حضرت حسینؓ کھیل رہے تھے کہ دونوں بچوں میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ عبد اللہ بن عمرؓ کہنے لگے کہ میرے والد خلیفہ ہیں، میں ان کا بیٹا ہوں۔ حضرت حسینؓ نے جواب دیا کہ جاؤ تمہارا باپ میرے نانا کا غلام ہے۔ عبد اللہ بن عمرؓ یہ سن کر روتے ہوئے اپنے والد کے پاس گئے۔

حضرت عمرؓ نے جب یہ سنا تو عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر فوراً امام حسینؓ کے پاس تشریف لے گئے اور پوچھا کہ آپؓ نے عبد اللہ بن عمرؓ سے کیا فرمایا تھا؟ آپؓ نے اپنے الفاظ دہرا دیے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، الحمد للہ کہ مجھے ان کی غلامی کا شرف حاصل ہو جائے اور حضرت حسینؓ سے درخواست کی کہ یہی الفاظ ایک کاغذ پر لکھ دیں۔ حضرت حسینؓ نے وہ الفاظ لکھ دیے۔ حضرت عمرؓ نے وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو یہ کاغذ میرے کفن میں رکھ دیا جائے۔ یہ دستاویز سند رہے گی کہ دنیا میں ان کا غلام ہونے سے بڑا کسی عہدے کو تصور نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں بدری (غزوہ بدر میں شرکت کا اعزاز پانے والے) صحابہ کرامؓ کے وظائف سب سے زیادہ یعنی پانچ ہزار درہم سالانہ مقرر کیے تھے۔ انھوں نے حسنین کریمینؓ کے وظائف بھی بدری صحابہ کرامؓ کے برابر مقرر کیے۔ حضرت عمرؓ حسنین کریمینؓ سے اپنے حقیقی بیٹے عبد اللہ بن عمرؓ سے بھی زیادہ محبت کرتے تھے۔ عہد فاروقی میں ایک مرتبہ یمن سے کچھ پوشاکیں آئیں۔ حضرت عمرؓ کو ان میں سے حضرات حسنین کریمینؓ کے شایان شان کوئی پوشاک نہ ملی تو آپ نے خصوصی طور پر یمن کی طرف آدمی بھیج کر مناسب لباس منگوایا۔ اس لباس کو حسنین کریمینؓ نے زیب تن کیا۔ حضرت عمرؓ نے دیکھا تو فرمایا اب میری طبیعت خوش ہوئی ہے۔

حضرت عثمانؓ کے زمانے میں ان کے خلاف فتنہ بغاوت کا آغاز ہوا۔ باغیوں نے خلیفہ اسلام کے گھر کا چالیس روز تک محاصرہ کیا۔ اس دوران حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ ان کے گھر کے باہر پہرہ دیتے رہے۔ حضرت عثمانؓ کے گھر کی نگرانی وہ اپنے والد حضرت علیؓ کے حکم سے کرتے رہے۔ یہ دونوں بھائی دروازے پر پہرہ دے رہے تھے کہ باغی گھر کی پچھلی طرف سے داخل ہو گئے۔

جنگ صفین کے بعد حضرت علیؓ ایران اور عراق وغیرہ کے مشرقی ملکوں کے حکمران بن گئے جبکہ حضرت امیر معاویہؓ شام اور مغرب کے آزاد حکمران بنے۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد حضرت حسن بن علیؓ ان کی جگہ حکمران بنے۔ مسلمان دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ حضرت حسنؓ کے بارے میں نبی مکرم ﷺ نے ارشاد فرمادیا تھا ”بے شک میرا یہ حسن بیٹا سردار ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح کروائے گا۔“ (صحیح بخاری)

منافقین نے ایک طرف تو حضرت حسنؓ کا ساتھ دینے کا اظہار کیا تو دوسری طرف امیر معاویہؓ کو خط لکھا کہ آپ عراق کی طرف خروج کریں، ہم حضرت حسنؓ کو پکڑ کر آپ کے حوالے کریں گے۔ حضرت امیر معاویہؓ نے ان منافقین کے یہ خطوط حضرت حسنؓ کو بھیجے اور ان غداروں کی غداری اور منافقت سے آگاہ رہنے کی نصیحت کی۔

حضرت حسنؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کو صلح کا پیغام بھیجا جس میں انہوں نے چند شرائط کے تحت صلح کے لیے آمادگی ظاہر کی۔ حضرت امیر معاویہؓ نے ایک خالی سفید کاغذ پر دستخط کر دیے کہ جو شرائط چاہیں لکھ لیں، مجھے منظور ہوں گی۔ حضرت حسنؓ نے حضرت حسینؓ سے مشورہ کرنے کے بعد درج ذیل شرائط تحریر کیں:

مجھے اور میرے تمام ساتھیوں کو جان کی امان حاصل ہو گی۔ ہم دونوں بھائیوں حسن اور حسینؓ کو بیت المال سے سالانہ ایک ایک لاکھ درہم وظیفہ دیا جائے گا۔ لوگوں کے

ساتھ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے مطابق سلوک کیا جائے گا اور خلفائے راشدین کی طرح فیصلے کیے جائیں گے۔ مسلمانوں کی خلافت اور امامت کا معاملہ مسلمانوں کے باہمی مشورہ سے طے ہو گا۔ (کشف الغمہ) حضرت امیر معاویہؓ نے یہ تمام شرائط قبول کر لیں۔ اس کے بعد حضرت حسنؓ حسینؓ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ حضرت امیر معاویہؓ کی بیعت کر لی۔

حضرت امیر معاویہؓ کی وفات کے بعد ان کا بیٹا یزید مسند خلافت پر متمکن ہوا۔ حضرت حسینؓ نے یزید کی بیعت نہیں کی کیونکہ وہ اسے خلافت کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔ ادھر کوفہ والوں نے حضرت حسینؓ کو خطوط لکھے۔ ابن اثیر کے مطابق حضرت امام حسینؓ کو پندرہ ہزار خطوط لکھے گئے۔ ان خطوط میں آپ کو کوفہ آنے اور خلافت راشدہ کو از سر نو قائم کرنے کی دعوت دی گئی۔

اس دوران کچھ صحابہ کرامؓ نے حضرت امام حسینؓ کو کوفہ جانے سے منع کیا۔ آپ نے اپنے چچا زاد بھائی، مسلم بن عقیلؓ کو حالات کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا۔ ابتدا میں ان کے ہاتھ پر ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے بیعت کر لی لیکن بعد میں ابن زیاد کے خوف سے علیحدہ ہو گئے۔ فتنہ پسندوں نے پھر مسلم ابن عقیلؓ شہید کر دیا۔ ابن زیاد نے پھر ایک قاصد کے ذریعے امام حسینؓ کو واپس جانے کا مشورہ دیا۔ مشہور عربی شاعر فرزدق کی بھی دوران راہ حضرت حسینؓ سے ملاقات ہوئی جس نے کہا کہ اہل کوفہ کے دل آپ کے ساتھ لیکن تلواریں یزید کے ساتھ ہیں۔

حضرت حسینؓ نے واپسی کا ارادہ کیا لیکن مسلم ابن عقیلؓ کے بھائیوں نے کہا کہ ہم اپنے بھائی کا قصاص لیے بغیر نہیں جائیں گے۔ بالآخر امام حسینؓ کے لشکر کو کربلا کے میدان میں روک لیا گیا۔ ۱۰ محرم الحرام ۶۱ھ کو آپ اپنے جانثاروں کے ساتھ مظلومی کی حالت میں شہید کر دیے گئے۔

کتاب سیدنا علیؓ و حسینؓ کے مطابق اکثر اہل سنت علماء اور فقہاء کے نزدیک یزید فاسق تھا۔ یزید نہ تو خلیفہ راشد ہے اور نہ ہی اس کی خلافت، خلافت علیؓ منہاج نبوت کی مصداق ہے۔ وہ عام دنیاوی حکمرانوں کی طرح ایک حکمران تھا۔ حضرت حسینؓ کی کوشش امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی آئینہ دار ہے۔ آپ کا یہ عمل افضل جہاد ہے کیونکہ حدیث نبویؐ کے مطابق ظالم و جابر بادشاہ کے سامنے کلمہ حق کہنا ہی افضل جہاد ہے۔ ●●●

شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ

مصحفِ دینِ نور کا دل ہے شہادتِ حسینؓ
ظلمتِ کفر کے مقابل ہے شہادتِ حسینؓ
معنیِ لا الٰہ ہے معرفتِ رسول ہے
حق مشاہدہ کی منزل ہے شہادتِ حسینؓ
ترکِ رسوم ناقصاں نیلِ مقامِ کاملاں
قرب کی روشنی کو شامل ہے شہادتِ حسینؓ
علم و یقیں کی انتہا حسنِ عمل کا منتہیٰ
حَیٌّ لَّمۡ یَمُتۡ کی محفل ہے شہادتِ حسینؓ
گرمیِ وعدۂ ازل خوابِ خلیل کا عمل
دینِ متیں کا ماہِ کامل ہے شہادتِ حسینؓ
سرِّ مکان و لامکاں حرفِ نگاہ و قلب و جاں
کعبۂ زندگی کا حاصل ہے شہادتِ حسینؓ
لمحۂ کشمکشِ حیات نظمِ درونِ کائنات
فتح مبیں کا نورِ مجمل ہے شہادتِ حسینؓ
جرأتِ بے مثال بھی خدمتِ لایزال بھی
امتِ احمدیؐ کی منزل ہے شہادتِ حسینؓ

(ڈاکٹر عازم بیگ قادری)

دو بھائی

ناراضی اور خوشی کے انوکھے جذبات سے مملو برادرانہ محبت کی لازوال داستان

بین سٹیرن بیان سن / احمد فواد

اس استاد کا نام بارڈ تھا۔ کبھی اُس کا ایک بھائی ہوا کرتا تھا جس کا نام اینڈرس تھا۔ انہیں ہر وقت ایک دوسرے کی فکر لگی رہتی۔ کئی سال پہلے دونوں ایک ساتھ فوج میں شامل ہوئے۔ جنگ میں حصّہ لیا۔ ایک ہی کمپنی میں خدمات انجام دیتے کارپورل کے عہدے تک پہنچے۔ جنگ کے بعد جب دونوں گھر لوٹے تو ساری بستی اُن کی خوبیوں کی معترف تھی۔ ان کے باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ خاصی بڑی جائیداد اُن کے لیے چھوڑ گیا تھا۔

اُس کی تقسیم خاصا مشکل کام تھا۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس مسئلے کو آپس میں وجہ نزاع نہیں بناتے بلکہ ساری اشیاء کو نیلام کے لیے پیش کریں گے تاکہ جسے جو چیز پسند آئے وہ اُسے خرید سکے۔ اس طرح حاصل ہونے والی رقم بعد میں بانٹ لیں گے۔

باپ کے پاس سونے کی ایک گھڑی تھی جو پورے علاقے میں مشہور تھی۔ ایسی گھڑی علاقے میں کسی اور کے پاس نہیں تھی۔ اس لیے جب اُسے نیلامی کے لیے پیش کیا گیا تو کئی امیر لوگ بولی لگانے آگے آگئے۔

دونوں بھائی اپنے باپ سے ازحد محبت کرتے تھے۔ اسی لیے جب طلائی گھڑی نیلامی میں پیش ہوئی، تو ہر بھائی کو خیال آیا کہ وہ باپ کی قیمتی ترین یادگار خرید لے۔ چناں چہ وہ بھی گھڑی کی بولی میں حصہ لینے لگے۔ لوگوں نے انہیں بھی حصہ لیتے دیکھا تو احتراماً پیچھے ہٹ گئے۔ بارڈ کو توقع تھی کہ اینڈرس یہ گھڑی اُسے لینے دے گا مگر اینڈرس بھی بھائی سے یہی توقع لگائے ہوئے تھا۔

بڑھتی بولی اُن دونوں کے لیے آزمائش بننے لگی۔ بولی لگاتے ہوئے ان کے رویے میں سختی آتی چلی گئی۔ جب بولی بیس ڈالر تک پہنچی تو بارڈ سوچنے لگا کہ اُس کا بھائی جو کر رہا ہے وہ صحیح نہیں۔ اس لیے وہ بولی بڑھاتے بڑھاتے تیس تک لے گیا۔ جب اینڈرس پھر بھی پیچھے ہٹنے پر آمادہ نظر نہیں آیا تو بارڈ سوچنے لگا کہ میرا بھائی یقیناً میری ساری مہربانیاں بھلا چکا۔ اُسے یہ بھی خیال نہیں کہ میں اس کا بڑا بھائی ہوں اور یہ کہ اب بولی تیس ڈالر تک پہنچ چکی۔

اینڈرس مقابلہ کرتا رہا۔ پھر اچانک بارڈ نے بولی چالیس تک بڑھادی اور اپنے بھائی کی طرف دیکھنا بند کر دیا۔ نیلام گھر میں یکسر خاموشی چھا گئی۔ اب صرف نیلامی کرنے والے کی آواز سنائی دے رہی تھی جو پُرسکون انداز سے بولی بتا رہا تھا۔ اینڈرس وہاں کھڑا سوچ رہا تھا کہ اگر بارڈ چالیس ڈالر دے سکتا ہے تو اس کے پاس بھی اتنی رقم ہے۔ اگر بارڈ یہ گھڑی مجھے نہیں دینا چاہتا تو ٹھیک ہے میں بھی اُسے حاصل کرنے کے لیے آخر تک جاؤں گا۔ یہ سوچ کر اُس نے بولی بڑھادی۔

یہ بات بارڈ کو اپنی بدترین بے عزتی لگی۔ اُس نے سخت لہجے میں بولی پچاس تک پہنچادی۔ اردگرد بہت سے لوگ کھڑے تھے۔ اینڈرس کو یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ اُس کا بھائی ہجوم کی موجودگی میں کیسے اُس کا یوں تمسخر اڑا سکتا ہے۔ اُس نے بولی کو اور بڑھادیا۔ آخر کار بارڈ ہنسا اور بولا:

''سو ڈالر اور میری برادرانہ محبت کی قیمت پر!'' یہ کہہ کر وہ مڑا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد کوئی اُس کے پاس آیا۔ وہ تب نئے خریدے ہوئے گھوڑے پر زین کس رہا تھا۔

''گھڑی تمہاری ہو چکی۔'' آدمی نے کہا۔ ''اینڈرس اس معاملے سے الگ ہو گیا ہے''۔

جب بارڈ نے یہ بات سُنی تو اُس کے اندر پشیمانی کا جذبہ ابھرا اور اُس نے اپنے بھائی کے بارے میں سوچا۔ گھڑی اُس کے ذہن سے نکل گئی۔ گھوڑا تیار ہو گیا تھا۔ بارڈ اُس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھے بے یقینی کے عالم میں سوچ رہا تھا کہ چلا جائے یا رُکے۔ اب کئی لوگ باہر آگئے۔ اینڈرس بھی اُن کے ساتھ تھا۔ اس نے اپنے بھائی کو تیار گھوڑے کے پاس کھڑے دیکھا۔ اُسے علم نہیں تھا کہ بارڈ کیا سوچ رہا ہے۔ وہ چیخ کر اُس سے بولا:

''گھڑی کے لیے شکریہ بارڈ! اب تم بھی اُسے چلتا نہیں دیکھ سکو گے۔ میں نے اُسے خرید لیا ہے۔''

''اب میرا گھوڑا بھی تمہاری زمین پر کبھی قدم نہیں رکھے گا۔'' بارڈ نے جواب دیا۔ اُس کا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا تھا۔ وہ اچھل کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

اُس دن کے بعد اُن میں سے ایک نے بھی اُس گھر میں قدم نہیں رکھا جہاں وہ اپنے باپ کے ساتھ رہا کرتے تھے۔

کچھ دن بعد اینڈرس نے ایک چھوٹے کاشتکار گھرانے میں شادی کر لی۔ بارڈ کو نہ شادی میں بلایا گیا اور نہ وہ چرچ میں منعقدہ تقریب میں آیا۔ شادی کے پہلے سال اینڈرس کی واحد گائے گھر کے شمال کی جانب مُردہ پائی گئی جہاں اُسے باندھا گیا تھا۔ اس بات کا کبھی پتا نہ چل سکا کہ وہ کیونکر مری۔ اس کے بعد بدقسمتی کے کئی اور واقعات رونما ہوئے۔ اینڈرس کی حالت مسلسل رُوبہ زوال رہی لیکن بدترین واقعہ اُس وقت پیش آیا جب موسمِ سرما کی ایک رات اُس کے جانوروں کا باڑہ جل کر راکھ ہو گیا۔ سارے مال مویشی جل گئے۔ کوئی نہ جان سکا کہ آگ کیسے لگی۔

''یہ یقیناً کسی ایسے شخص کی کارستانی ہے جو مجھ سے پرخاش رکھتا ہے۔'' اینڈرس نے سوچا۔ اُس رات وہ پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ اب وہ خاصا غریب آدمی ہو گیا تھا۔ اُس میں کچھ کرنے کی امنگ باقی نہ رہی۔

آنے والی شام بارڈ اُس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اینڈرس لیٹا ہوا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی اچھل کھڑا ہوا۔ ''تم یہاں کیا کرنے آئے ہو'' وہ چیخا۔ پھر خاموشی سے بھائی کو گھورنے لگا۔

بارڈ نے جواب دینے سے پہلے تھوڑا سا توقف کیا۔ پھر بولا: ''اینڈرس، میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ تمہارے مالی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔''

''میرے ساتھ وہی کچھ ہو رہا ہے بارڈ! جیسا تم چاہتے تھے۔ تم چلے جاؤ۔ مجھے یقین نہیں کہ میں خود کو قابو میں رکھ سکوں گا۔''

''اینڈرس، تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے۔ میں پشیمان ہوں۔''

''جاؤ بارڈ، ورنہ خداوند ہی ہمارا نگہبان ہو۔''

بارڈ کچھ قدم پیچھے ہٹا اور لرزتی آواز میں آہستگی سے بولا:

''اگر وہ گھڑی تمہیں درکار ہے تو وہ تمہیں مل جائے گی۔''

''جاؤ بارڈ''! وہ دوسری دفعہ چیخا۔ بارڈ مزید رکنے کی ہمّت نہ رکھتے ہوئے چلا گیا۔

بارڈ کے ساتھ جو ماجرا پیش آیا تھا، وہ کچھ یوں ہے۔ جیسے ہی اُسے اپنے بھائی کے ساتھ پیش آنے والے المناک واقعہ کا

پتا چلا اُس کا دل نرم ہو گیا لیکن ہٹ دھرمی نے اُسے روکے رکھا۔ پھر وہ چرچ گیا۔ وہ خود کو مزید نہیں روک سکتا تھا۔ وہاں اُس نے کئی طرح کے ارادے باندھے لیکن اُن میں سے کسی ایک پر بھی عمل کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ کئی بار وہ اینڈرس کے گھر کے بالکل قریب تک گیا۔ پھر یا تو کوئی اچانک دروازے سے برآمد ہو گیا، کبھی وہاں کسی اجنبی کی موجودگی سدِ راہ بن گئی یا اینڈرس کو گھر سے باہر لکڑیاں چیرتے دیکھا۔

الغرض گھر کے اندر جانے میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ حائل ہوتی رہی لیکن ایک اتوار دیر سے وہ چرچ گیا۔ اینڈرس بھی وہاں موجود تھا۔ بارڈ نے اُسے دیکھا۔ وہ بہت دُبلا اور زرد رُو نظر آیا۔ اُس نے وہی پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھے جب دونوں بھائی اکٹھے ایک ساتھ رہا کرتے تھے۔ اب وہ بوسیدہ ہو گئے تھے اور اُن میں پیوند لگے تھے۔

وعظ کے دوران اینڈرس نے اپنی نظریں پادری کے چہرے پر گاڑے رکھیں۔ بارڈ نے سوچا کہ وہ اچھا اور مہربان نظر آتا ہے۔ اُسے اپنا بچپن یاد آیا۔ اُس نے خدا سے پکا عہد کیا کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ مفاہمت کرے گا چاہے کچھ بھی ہو۔ یہ عزم اُس کی روح میں دُور تک اتر گیا۔ جب وہ اٹھا تو اُس کا خیال تھا کہ وہ سیدھا بھائی کے پاس جا کر قریب بیٹھ جائے لیکن راہ میں ایک آدمی حائل ہو گیا اور اینڈرس نے اُس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

عبادت کے بعد بھی اس کام میں رکاوٹیں حائل رہیں۔ بڑا ہجوم تھا۔ اینڈرس کی بیوی اُس کے قریب چل رہی تھی لیکن اُس کی خاتون سے واقفیت ہی نہیں تھی۔ آخر اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ بھائی کے گھر جا کر اُس سے سنجیدگی سے تفصیلی گفتگو کرے۔ یہ زیادہ مناسب رہے گا۔ جب شام ہوئی، وہ چل پڑا۔ وہ سیدھا بیٹھنے والے کمرے کے دروازے تک گیا اور وہاں ہونے والی باتیں سننے لگا۔ پھر اُس نے اپنا نام سُنا۔ یہ بیوی کی آواز تھی۔

''اُس نے آج عشائے ربانی لیا۔'' وہ بولی ''وہ اُس وقت یقیناً تمہارے بارے میں سوچ رہا تھا۔''

''نہیں، وہ میرے بارے میں نہیں سوچتا۔'' اینڈرس نے کہا۔ ''میں اُسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ صرف اپنے بارے میں سوچتا ہے۔''

پھر خاصی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ سرد شام ہونے کے باوجود بارڈ کے چہرے سے پسینا ٹپکنے لگا۔ بھائی کی بیوی چولھے پر چڑھی ایک کیتلی کے ساتھ مصروفِ عمل تھی جس سے چرچرانے اور سیٹی نما آواز پر آواز آ رہی تھی۔ گاہے گاہے ایک دودھ پیتے بچے کے رونے کی آواز بھی آتی جسے اینڈرس جھلا رہا تھا۔ بالآخر بیوی نے ان الفاظ میں اپنی رائے ظاہر کی:

''مجھے یقین ہے کہ تم دونوں ہر وقت ایک دوسرے کے بارے میں سوچتے رہتے ہو لیکن یہ بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔''

''چلو کوئی اور بات کریں۔'' اینڈرس نے کہا۔

کچھ دیر بعد وہ اٹھا اور دروازے کی طرف گیا۔ بارڈ کو لکڑیاں رکھنے کے گودام میں چھپ جانا پڑا۔ اینڈرس کچھ لکڑیاں لینے اُسی جگہ آیا۔ بارڈ ایک کونے میں کھڑا اُسے قریب سے دیکھتا رہا۔ اب اُس نے وہ اتوار والا بوسیدہ لباس بدل لیا تھا۔ اُس کی جگہ وہ یونیفارم پہن لیا جو جنگ کے خاتمے پر وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس کے بارے میں انہوں نے عہد کیا تھا کہ اسے خاندانی ورثہ جان کر بطور امانت رکھا جائے گا۔

اینڈرس کے یونیفارم میں بھی پیوند لگے ہوئے تھے۔ بہت پھٹا پرانا لگ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اُس نے اپنے مضبوط بدن کو چیتھڑوں میں چھپا رکھا ہو۔ اس دوران بارڈ نے جیب میں رکھی طلائی گھڑی کی ٹِک ٹِک کی آواز سُنی۔ اینڈرس ایندھن والی لکڑیوں کے قریب گیا۔ فی الفور جھک کر انہیں اٹھانے کی بجائے اُس نے لکڑی کے ڈھیر سے کمر لگائی اور آسمان پر چمکتے ستاروں کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اُس نے ایک آہ بھری اور منہ ہی منہ میں بڑبڑایا:

''ہاں..... ہاں..... ہاں؛ اوخدایا..... اوخدایا''

بارڈ کو لگا، زندگی بھر یہ الفاظ سنائی دیتے رہیں گے۔ وہ قدم بڑھانا چاہتا تھا لیکن اُسی لمحے اُس کا بھائی کھانسا اور اُسے اپنا کام انتہائی کٹھن لگنے لگا۔ یہ رکاوٹ اُسے روکنے کے لیے کافی ثابت ہوئی۔ اینڈرس نے بازو بھر لکڑیاں اٹھائیں اور بارڈ کے بالکل قریب سے گزرا اتنے قریب سے کہ لکڑیوں کے کچھ سرے اُس کے چہرے پر لگ لگے۔

پورے دس منٹ تک وہ اس جگہ کھڑا رہا جیسے کسی نے اسے وہاں گاڑ دیا ہو۔ جذبات کی اُتھل پُتھل جاری تھی۔ پھر اُس پر لرزنے کا دورہ سا پڑ گیا جس نے اُسے ہلا ڈالا۔ وہ وہاں سے چل پڑا۔ بارڈ نے خود سے کھُل کر اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ اندر جانے کی جرأت نہیں رکھتا اُس لیے اب بارڈ نے ایک اور منصوبہ بنایا۔

کونے میں ڈبے سے کچھ کوئلے کے ٹکڑے لیے۔ وہیں اُسے چیڑ کی لکڑی کی ایک چھوٹی پٹی ملی جو آسانی سے جل سکتی تھی۔ پھر وہ جانوروں کے باڑے کی طرف آ گیا۔ دروازہ بند کیا اور روشنی کر کے چیڑ کی لکڑی کی پٹی کو جلایا۔ اُس کی مدد سے اسے وہ کھونٹا ملا جس سے اینڈرس اپنی لالٹین لٹکاتا تھا جب وہ صبح سویرے اپنا اناج گاہنے آتا تھا۔

بارڈ نے کلائی پر بندھی سونے کی گھڑی اتاری اور اُسے وہاں لٹکا دیا پھر روشنی بجھا کر باہر نکل آیا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اسے کسی بڑی مصیبت سے نجات مل گئی ہو۔ وہ خوشی میں برف پر اچھل کود کرتا یوں چلا گویا اُس کا لڑکپن لوٹ آیا ہو۔

دوسرے دن اُس نے سُنا کہ جانوروں کا وہ باڑہ جل کر راکھ ہو گیا۔ یقیناً اس کی جلائی لکڑی سے کچھ چنگاریاں وہاں گری ہوں گی جس وقت وہ وہاں اپنی گھڑی لٹکا رہا تھا۔

اس بات سے بارڈ جذباتی طور پر اتنا متاثر ہوا کہ سارا دن اپنے کمرے میں بند ہو کر کتاب سے یوں بلند آواز میں حمد گاتا رہا کہ ارد گرد بستے لوگ سوچنے لگے شاید اُس کا دماغ چل گیا ہے۔ شام کو وہ گھر سے نکلا۔ چاندنی سے ہر طرف روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اپنے بھائی کی رہائش گاہ کی طرف گیا۔ جلے باڑے کی جگہ کھدائی کرنے سے حسبِ توقع وہ ڈلا اُسے مل گیا۔ یہ یقیناً اُس پگھلی ہوئی گھڑی کی باقیات تھی۔

اسے مٹھی میں بند کر کے وہ اپنے بھائی کی طرف گیا تاکہ اُس سے مفاہمت کی التجا کرے۔ وہ ہر بات کی وضاحت کرنے کے لیے تیار تھا۔

ایک چھوٹی بچّی نے اُسے راکھ کریدتے دیکھ لیا۔ کچھ لڑکوں کو جو ایک ناچ میں شرکت کے لیے جا رہے تھے، واقعہ سے پہلے والے اتوار کی شام اُسے اُس جگہ کی جانب جاتے نظر آیا تھا۔ جس محلے میں اُس کی رہائش تھی، وہاں کے باسیوں نے بھی اُس دن بارڈ کی عجیب حرکات کی توثیق کی چونکہ ہر کوئی جانتا تھا کہ دونوں بھائی ایک دوسرے کے دشمن ہیں لہٰذا معلومات جمع کی گئیں اور بارڈ پر ایک مقدمہ قائم کر دیا گیا۔

بارڈ پر کوئی کچھ ثابت نہیں کر سکتا تھا لیکن شک اُس پر تھا۔ اب پہلے کے مقابلے اُسے اپنے بھائی کے پاس جانا اور بھی مشکل لگنے لگا۔

❁❁

جب اُس کا باڑہ جل گیا تو اینڈرس کو یہی خیال آیا کہ یہ بھائی کی کارستانی ہے لیکن اُس نے یہ بات کسی سے نہیں کی۔ جب آنے والی شام اُس نے اسے زرد رنگت اور جذباتی کیفیت کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو سوچا: ''اب پشیمانی نے اسے توڑ ڈالا ہے لیکن اپنے بھائی کے خلاف ایسے شرمناک جرم کے مرتکب کو کیسے معاف کیا جا سکتا ہے؟ بعد میں اُس نے لوگوں کو کہتے ہوئے سنا کہ کس طرح آگ لگنے والی شام بارڈ کو باڑے کی طرف جاتے دیکھا گیا تھا۔ مقدمے میں کوئی قابلِ قبول ثبوت نہیں پیش کیا گیا اینڈرس کو پورا یقین تھا کہ یہ کام اُس کے بھائی نے کیا ہے۔

مقدمے کے دوران وہ آمنے سامنے ہوئے۔ بارڈ عمدہ کپڑوں میں ملبوس تھا۔ اینڈرس پھٹا پرانا لباس پہنے ہوئے تھا۔ بارڈ نے اندر آتے ہوئے بھائی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں

میں اس قدر قابل رحم التجا والی کیفیت تھی کہ اینڈرس نے اُسے اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کیا۔ ''وہ نہیں چاہتا کہ میں اُسے کچھ کہوں۔'' اینڈرس نے سوچا۔ جب عدالت نے اُس سے پوچھا کہ کیا اُسے اپنے بھائی پہ شک ہے تو اُس نے اونچی آواز میں فیصلہ کُن انداز میں کہہ دیا ''نہیں۔''

اُس دن کے بعد اینڈرس بہت پینے لگا اور جلد تباہی کے کنارے پر پہنچ گیا۔ بارڈ کی حالت اُس سے بھی خراب تھی۔ حالانکہ اُس نے پینا شروع نہیں کیا لیکن بارڈ کی حالت ایسی ہو گئی کہ پرانے جاننے والے اُسے بمشکل ہی پہچان پاتے تھے۔

شام گئے ایک غریب عورت بارڈ کے کرایے پر لیے گئے چھوٹے کمرے میں داخل ہوئی اور اُسے اپنے ساتھ کچھ دُور چلنے کا کہا۔ وہ اُسے جانتا تھا۔ وہ اُس کے بھائی کی بیوی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ عورت اُسے کیا بتانے آئی ہے۔ اُس پر موت کی زردی چھا گئی۔ اُس نے کپڑے بدلے اور بغیر کچھ کہے اُس کے ساتھ چل پڑا۔ اینڈرس کے کمرے کی کھڑکی سے روشنی کی لکیر باہر آ رہی تھی جو کبھی مدھم پڑتی اور کبھی روشن ہو جاتی۔ عورت کی راہنمائی میں وہ آگے بڑھ رہے تھے ورنہ برف میں کوئی راستہ نہیں تھا۔

جب بارڈ ایک بار پھر اُس راہداری میں کھڑا ہوا تو عجیب سی بُو محسوس کی۔ اس نے بارڈ کی طبیعت خراب کر دی۔ وہ اندر داخل ہوئے۔ ایک چھوٹا بچہ چولہے کے پاس کھڑا کوئلہ کھا رہا تھا۔ اُس کا پورا چہرہ سیاہ ہو گیا تھا۔ جب اُس نے ہنستے ہوئے اوپر دیکھا تو اُس کے سفید دانت نظر آئے۔ یہ اُس کے بھائی کا بچہ تھا۔

وہاں بستر میں کپڑوں کے ڈھیر کے نیچے اُس کا بھائی اینڈرس لیٹا ہوا تھا۔ انتہائی نحیف حالت، ہموار اونچی پیشانی اور اپنے بھائی پر جمی ہوئی خالی آنکھوں کے ساتھ۔ بارڈ کے گھٹنے کانپنے لگے۔ وہ پلنگ کی پائنتی کے پاس بیٹھ گیا اور اس پر رونے کا شدید دورہ پڑ گیا۔ بیمار آدمی انہماک کے ساتھ اسے دیکھنے لگا لیکن خاموش رہا، بالآخر اُس نے اپنی بیوی سے باہر جانے کا کہا۔ بارڈ نے اُسے رُکنے کے لیے اشارہ کیا اور پھر دونوں بھائی ایک ساتھ بول پڑے۔

ان کی داستان گھڑی کی نیلامی کے وقت سے شروع ہوئی۔ انھوں نے اب تک کی ساری روداد بیان کر دی۔ بارڈ نے پگھلی گھڑی کی باقیات سامنے لا کر اپنی بات ختم کی جسے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ لیے پھرتا تھا۔ دونوں بھائیوں پر یہ بات اچھی طرح منکشف ہو گئی کہ اس پورے عرصے میں دونوں نے خوشی کا ایک لمحہ بھی نہیں دیکھا۔

اینڈرس نے کچھ زیادہ نہیں کہا۔ اس میں اتنی طاقت ہی نہیں تھی۔ بارڈ اُس کی بیماری کے دوران بھائی کے پلنگ کے آس پاس رہا۔

''اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اینڈرس نے ایک صبح جاگ کر کہا۔ ''اب میرے بھائی، ہم دونوں بہت زمانے تک زندہ رہیں گے اور کبھی ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہوں گے۔ جیسا کہ کبھی ہم رہا کرتے تھے۔''

لیکن اُسی دن وہ فوت ہو گیا۔ بارڈ نے اس کی بیوی اور بچے کو سنبھالنے کی ذمہ داری اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اُس وقت سے اُن کے دن پھر گئے۔

اُس دن پلنگ کے پاس دونوں بھائیوں نے جو باتیں کی تھیں، وہ دیواریں اور چھت پھاڑ کر باہر آ گئیں۔ وہ بستی کے سارے لوگوں تک پہنچ گئیں۔ سب کے لیے بارڈ ایک معزز شخصیت کی شکل اختیار کر گیا۔ اُس کا ایسے شخص کی طرح احترام کیا جانے لگا جسے بہت دُکھ سہنے کے بعد خوشی نصیب ہوئی یا جو بہت عرصہ غائب ہونے کے بعد واپس آیا ہو۔

اس دوستانہ سلوک سے بارڈ اندر ہی اندر بہت مضبوط ہو گیا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک پرہیزگار آدمی بن گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ خلق خدا کی خدمت کرے۔ اس لیے سابقہ کارپورل نے معلّمی شروع کر دی۔ وہ ہمیشہ اپنے شاگردوں کو پیار محبت کی تلقین کرتا۔ خود بھی اس پر عمل پیرا رہتا۔ بچے ہر وقت اُس کے ساتھ یوں چپکے رہتے جیسے وہ بیک وقت ان کا باپ اور کھیل کا ساتھی ہو۔ ●●●

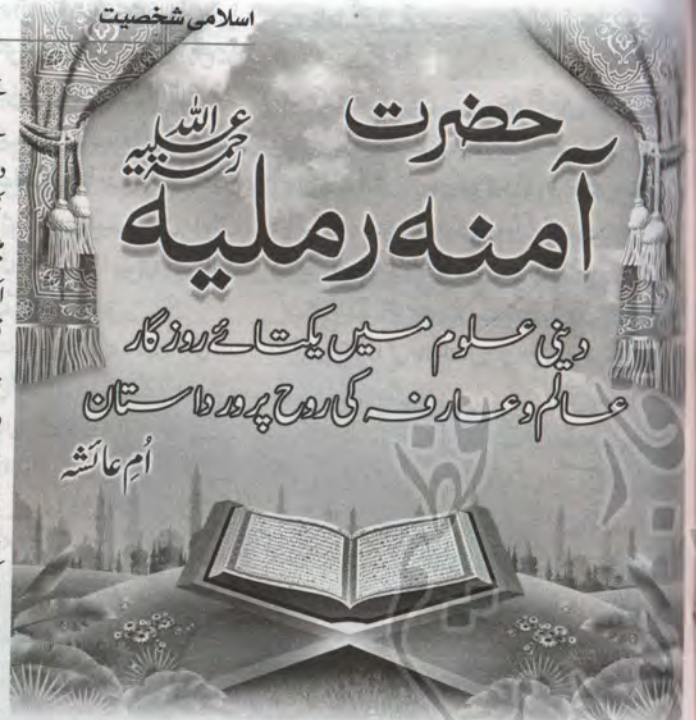

حضرت آمنہ رملیہ رحمۃ اللہ علیہا کا شمار تیسری صدی ہجری کی جلیل القدر عالمات و عارفات میں ہوتا ہے۔

تقریباً ۱۶۳ھ میں بغداد کے ایک نواحی شہر، رملہ میں پیدا ہوئیں۔ بچپن ہی سے بہت ذہین تھیں۔ علم حاصل کرنے کا بہت شوق رکھتیں۔ والدین بہت غریب تھے اس لیے ان کے شوق کے آڑے ان کی غربت آ گئی اور تعلیم کا کوئی خاص بندوبست نہ کر سکے۔ البتہ گھر پر جو معمولی تعلیم دے سکتے تھے، وہ دے دی گئی۔

جب ذرا بڑی ہوئیں تو اِن کی والدہ محترمہ حج کے لیے گئیں۔ آپ بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ اس زمانے میں ایک بہت بڑے بزرگ عالمِ دین مسجد حرام میں درس دیا کرتے تھے۔ حضرت آمنہ رحمۃ اللہ علیہا نے جب ان کو درس دیتے دیکھا اور سنا تو وہ بھی ان کے حلقہ درس میں داخل ہو گئیں اور ایک عرصہ تک ان سے قرآن و حدیث کا علم حاصل کرتی رہیں۔ جب وہ بزرگ وفات پا گئے تو حضرت آمنہؒ مدینہ منورہ چلی گئیں جہاں امام مالک رضی اللہ عنہ نے مسندِ حدیث بچھا رکھی تھی۔

حضرت آمنہؒ مدت تک ان سے علم حدیث حاصل کرتی رہیں اور بہت سی احادیث زبانی یاد کر لیں۔ حافظ ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ کے اندازے کے مطابق سو کے لگ بھگ احادیث ان سے مروی ہیں۔ اس کے بعد وہ دوبارہ مکہ معظمہ گئیں اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے علم فقہ کی تعلیم حاصل کی تب ان کی عمر تقریباً چھتیس سال تھی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ مصر تشریف لے گئے تو وہ کوفہ پہنچ گئیں جہاں بہت سے علما فضلا عارفین موجود تھے۔ حضرت آمنہؒ بڑے ذوق و شوق سے ان سے بھی فیض یاب ہوئیں اور تمام دینی علوم میں یکتائے روزگار ہو گئیں۔

جب کوفہ سے وطن واپس گئیں تو ان کے علم و فضل کا چرچا دور دور تک پھیل چکا تھا۔ انہوں نے مخلوقِ خدا کو دینی علوم سے مستفید کرنے کے لیے حلقہِ درس قائم کر لیا۔ لوگ علم کے

حصول کے لیے جوق در جوق ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ بڑے بڑے علما بھی حدیث سننے کے لیے درس میں شریک ہوتے۔ ۲۰۹ھ میں انہیں بغداد جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ان کی مُلاقات ایک اللہ والے درویشِ کامل سے ہوئی۔ ان سے ملاقات کے بعد حضرت آمنہؒ کی زندگی میں انقلاب برپا ہوگیا۔ اپنا تمام مال واسباب اللہ کی راہ میں دے دیا اور درویشانہ زندگی اختیار کرلی۔ اب ہر وقت اللہ کی عبادت اور گریہ وزاری میں مشغول رہتیں۔

اسی حالت میں سات حج پیدل کیے۔ زہد وتقویٰ اور عبادت وریاضت کی بنا پر لوگ ان کو اللہ کے ولیوں میں شمار کرتے تھے اور دل وجان سے عزت واحترام کرتے۔ آپؒ کی جلالت وقدر کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ اس دور کے عظیم المرتبت ولی اللہ، حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۲۲۷ھ) کبھی کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح اہل سنت والجماعت کے چوتھے امام حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بھی ان کی عظمت وجلالت کے معترف تھے۔

ایک دفعہ حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ بیمار ہوئے تو حضرت آمنہؒ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئیں۔ اتفاق سے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف لے آئے۔ انہوں نے حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا 'یہ کون خاتون ہیں؟ انہوں نے فرمایا 'یہ آمنہ رملیہؒ ہیں' میری عیادت کو آئی ہیں۔ امام صاحب نے ان کی شہرت سُن رکھی تھی۔ اب انہیں قریب رُوبرو پا کر بہت خوش ہوئے اور حضرت بشر رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا' ان سے کہیے کہ میرے لیے دعا فرمائیں۔ حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت آمنہؒ سے ان کا تعارف کروایا اور عرض کی کہ امام صاحب آپ سے دعا کے خواستگار ہیں۔ حضرت آمنہؒ نے ہاتھ اُٹھا کر نہایت خشوع وخضوع سے دعا مانگی: ''اے اللہ! احمد بن حنبل اور بشر دونوں جہنم کی آگ سے پناہ مانگتے ہیں تو سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے۔ ان کو اس آگ سے محفوظ فرما۔''

ایک دفعہ کسی رئیس نے دس ہزار اشرفیاں نذر کرنا چاہیں تو انہوں نے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ جب بہت اصرار کیا تو انہوں نے رکھ لیں لیکن ان کو ہاتھ نہ لگایا اور شہر میں اعلان کروا دیا کہ جس کو روپے کی ضرورت ہو وہ آکر مجھ سے لے جائیں۔ چنانچہ ضرورت مند لوگ آتے تھے اور بقدرِ ضرورت رقم لے کر چلے جاتے۔ شام ہونے سے پہلے انہوں نے تمام اشرفیاں تقسیم کردیں حالانکہ اس دن ان کے گھر میں کھانے کے لیے کوئی چیز نہ تھی۔

حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آمنہ رحمۃ اللہ علیہا کا معمول تھا کہ آدھی رات کو بیدار ہوجاتیں اور صبح تک نہایت خشوع وخضوع سے اللہ کی عبادت میں مشغول رہتیں۔ حضرت بشر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے انہیں یہ دعا مانگتے ہوئے سنا' ''اے میرے پیارے آقا! میری عزت تیرے ہی ہاتھ ہے۔ قیامت کے دن سب کے سامنے مجھے رسوا نہ کرنا۔ اگر ایسا کیا تو لوگ یہی کہیں گے کہ اللہ نے اپنی بندی کو رسوا کیا جو اس سے محبت کرتی تھی۔ اے میرے پیارے آقا تجھ کو یہ بات ہرگز گوارا نہ ہوگی۔ اگر تو نے اس کو گوارا کیا تو میں ہرگز ہرگز گوارا نہ کروں گی کہ لوگ تجھے الزام دیں۔''

حضرت آمنہؒ کا دستور تھا کہ کسی کے ہاں کھانا نہ کھاتیں مبادا اس میں مال حرام یا مشکوک چیز شامل نہ ہو۔ البتہ کسی کے بارے میں یقین ہوتا کہ وہ متقی اور پرہیز گار ہے تو اس کے ہاں کھانا کھا لیتیں۔ آپؒ کا سال وفات کسی کتاب میں درج نہیں۔ انہوں نے تیسری صدی ہجری میں کسی وقت وفات پائی (دائرہ معارف اسلامیہ، باکمال مسلمان عورتیں)

اے رب ارض وسما اے ارحم الرحمین ہمیں بھی ان باکمال اور پارسا عورتوں جیسا بنا دے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔ آمین۔ ●●●

ابا میاں باورچی خانے میں!

ازدواجی نوک جھونک کے چٹکلوں سے آراستہ ایک دلچسپ روداد

سارہ خالد

خوبرو نصیر احمد کی پُراثر شخصیت وقت کے تیز رفتار پہیے کے ساتھ ساتھ بزرگی کی گاڑی پہ چڑھ گئی۔ بالوں کے جھرمٹ سے سفید بال جھانکنے لگے۔ چہرے کی تروتازگی ڈھا ہونے لگی اور جھریوں نے قدم رنجہ فرمالیا۔ چند سال پہلے دانتوں کی کارکردگی میں خلل کا معاملہ شروع ہوا۔ اب تک کئی دانت داغِ مفارقت دے چکے۔

چشمہ نوجوانی میں ہی لگ گیا تھا۔ اب سنہرے نازک فریم کی جگہ پلاسٹک کا چوڑے فریم والا چشمہ ناک کی پھنک پہ ٹک گیا۔ وقت کے اس سفر نے موصوف کو خاصا بدل ڈالا مگر شخصیت کو رعب ضرور عنایت کر گیا۔

پہلے جو ہوا کے گھوڑے پہ سوار رہتے تھے، اب ذرا ٹھہر کے چلتے۔

ملنے جلنے والوں میں بڑی عزت تھی۔ راستے میں لوگ رک کر سلام کرتے۔ زندگی لگے بندھے اصول کے تحت بڑے آرام سے گزر رہی تھی۔ ان کی صبح اذانِ فجر کے ساتھ ہی ہوجاتی۔ نماز کے بعد لمبے راستے سے چہل قدمی کرتے گھر آتے۔ اللہ نے خیر سے ایک نعمت اور ایک رحمت دے رکھی تھی۔ بڑی بیٹی کو رخصت کیے برسوں ہو رہے تھے۔ اس کا سسرال خاصا دور تھا لہٰذا کم ہی چکر لگاتی۔ کبھی کبھار جو اپنے بچوں کے ہمراہ آتی تو بھائیں بھائیں کرتے گھر میں زندگی کی رمق دوڑ جاتی۔

بہن سے چھوٹا حمید بغرض ملازمت دوسرے شہر میں مقیم تھا۔ ابتدا میں تنہا گیا، پھر بیوی بچوں کو بھی بلا لیا۔ ماں باپ پہ بھی بہت زور دیا مگر نصیر احمد اپنا آبائی مکان اور ملازمت چھوڑ کر پرائے شہر کیوں جا کر رہتے لہٰذا اب اتنے بڑے گھر میں بوڑھا بوڑھی اکیلے پڑے تھے۔ جب تک بہو پوتے پوتیاں گھر میں تھے، خانم کے لیے مصروفیت ہی رہتی۔ بچوں کی شرارتوں اور بڑوں کی ڈانٹ ڈپٹ سے ہلچل کا احساس رہتا۔

اب سب کے چلے جانے سے جیسے گھر میں سناٹے اتر آئے۔ اس سناٹے سے گھبرا کے انہوں نے خود کو مصروف کرلیا۔ دن بھر کام کاج میں مشغول رہتیں۔ سب کے لاکھ کہنے پہ بھی ماسی نہ رکھی۔ ویسے بھی کسی اور کا کیا کام پسند نہیں آتا تھا لہٰذا ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتیں۔ کبھی سناٹے سے زیادہ دل گھبراتا تو پاس پڑوس ہو آتیں۔ دن میں ایک بار بیٹا بیٹی کو خیریت کا فون ضرور ہوتا۔

جوں جوں دن گزرے، نصیر احمد کی ریٹائرمنٹ کے دن قریب آتے جارہے تھے۔ دفتر کے آخری روز ان کے اعزاز میں لائے بنا ''سرپرائز'' پارٹی رکھی گئی تھی۔ ساتھیوں نے خیر سگالی کے جذبات کے ساتھ بڑی عزت و محبت سے انہیں رخصت کیا اور وہ فخر و انبساط سے سینہ تانے گھر روانہ ہوئے۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے کاندھوں سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا۔ انہیں اپنا وجود بادل کی طرح ہلکا محسوس ہو رہا تھا۔ اندر کے موسم نے پلٹا کھایا اور مزاج میں خوشگواریت آبیٹھی۔ اندر کا موسم مہک رہا ہو تو باہر خود بخود ٹھنڈی ہوائیں چلنا شروع ہوجاتی ہیں۔ انہیں اس آگ اگلتے موسم میں ہوا کے تازہ جھونکے کا احساس ہو رہا تھا۔

گھر آکر بیٹے کو فون کیا تو اس کی وہی ایک رٹ..... اب آپ دونوں میرے پاس آجائیں مگر یہاں میں نہ مانوں والی صورتحال تھی۔ بیٹے نے لاکھ حجت کی۔ بے شمار دلائل دیے گئے' آخر کار جیت نصیر احمد ہی کی ہوئی۔ قریب ہی بی خانم بیٹھی تھیں۔ وہ بیٹے کے حق میں لقمہ دیے جاتی تھیں مگر میاں کے کان پہ جوں نہ رینگتی۔ بیٹی کو خبر ہوئی تو وہ اگلے ہی روز آموجود ہوئی۔ گھر اس کے بچوں کی پارہ صفت طبیعت کے باعث چڑیا گھر کا منظر پیش کرنے لگا۔ ہمیشہ کی طرح نواسے نواسیوں کی ہر شے میں گھسنے کی عادت سے وہ جھنجھلائے ضرور مگر منہ سے کچھ نہ بولے۔

دو روز ٹھہر کے بیٹی رخصت ہوئی تو چڑیا گھر پھر سے گھر نظر آنے لگا۔ اشیاء اپنی ترتیب پہ درستگی سے ساکت بیٹھ گئیں۔ مزید چند روز پرانے احباب سے ملاقاتوں میں نکل گئے مگر چاندنی کی عمر صرف چار دن تھی۔ سو کچھ دن تو خیریت سے گزرے مگر پھر طبیعت پر بیزاری طاری ہونا شروع ہوگئی۔ دن کا بیشتر حصہ یوں ہی گزر جاتا تھا اور کرنے کو کوئی کام نہ ہوتا۔

وہ کام کرنے کے عادی تھے۔ بیکار بیٹھنا ان کے مزاج کا حصہ نہ تھا۔ عمر بھر ایک مخصوص اوقات کار کے تحت نوکری کی تھی۔ اب جب نوکری سے کنارہ ملا تو کام کی عادت ایسی پختہ پڑ گئی تھی کہ خالی بیٹھنا عجیب معلوم ہوتا۔ یوں خوشی و شادمانی نے رخصت پکڑی اور بے زاریت نے انہیں اپنے شکنجے میں دبوچنا شروع کیا۔ اب انہیں یہ فکر کھانے لگی کہ وہ بقیہ تمام زندگی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے کیوں کر بیٹھے رہ سکتے ہیں؟ یہی سوچ بڑھتے بڑھتے اژدھا بن گئی اور انہیں دن رات ڈسنے لگی۔

کئی دن یوں ہی گزر گئے پھر انہوں نے اپنی بے کلی پہ قابو پانے کے لیے خود کو مصروف رکھنا شروع کردیا۔ اب نصیر احمد گھر کا سامان روز لے آتے، اسی بہانے بازار کا چکر بھی لگ جاتا۔ نت نئے دوست بھی بن گئے۔ دکاندار، سبزی والے، پھل والے، موچی وغیرہ وغیرہ۔ فائدہ اس کا یہ ہوا کہ جب بھی بازار کا رخ کرتے کئی دکاندار بٹھا لیتے۔ پھیری والوں سے حالاتِ حاضرہ پہ تبصروں سے جب فارغ ہو کے گھر آتے تو خاصی تاخیر ہو چکی ہوتی۔ خانم خوب بڑبڑایا کرتیں۔ وہ منتظر ہوتیں کب سامان آئے اور وہ ہنڈیا چڑھائیں۔ نصیر احمد بھی کسی نہ کسی طرح وقت کاٹنا چاہتے تھے، سو بازار جاتے تو واپس آنے کا نام ہی نہ لیتے۔

وہ گھر آتے تو خانم جھاڑ پونچھ سے فارغ ہو کر انہی کی منتظر ہوتیں۔ نگاہیں دروازے پر جمی ہوتیں۔ وہ آتے تو سامان لے کر باورچی خانے کا رخ کرتیں اور وہ وہیں کرسی ڈالے اپنی پسندیدہ کتاب میں سے اقتباسات پڑھ پڑھ کر سنایا کرتے۔ خانم بڑا عمدہ ادبی ذوق رکھتی تھیں۔ کتاب ہاتھ میں ہو اور سر پر

سے بارات گزر جائے تو کبھی خبر نہ ہو، یہ حال تھا ان کا وہ بڑے ذوق و شوق سے سنتی چلی جاتیں پھر دونوں میاں بیوی اس پر تبصرہ کرتے۔ اس دوران ہانڈی بھی چڑھ جاتی۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا مگر انہیں لگتا کہ ان کی زندگی دھیرے دھیرے نقطۂ انجماد کی طرف چلتی جارہی ہے۔ جہاں تحریک رک جاتی ہے اور سکوت طاری ہوجاتا ہے۔ ان کی ابلے پانی کے مانند بے چین طبیعت کو یہ سکوت و وحشت میں مبتلا کرتا تھا۔ راتیں یہ سوچتے ہوئے گزر جاتیں کہ کل ایسا کیا کروں جو نیا ہو اور وقت بھی خوب کٹ جائے۔ یہی سوچیں چین نہ لینے دیتیں اور نیند کا راستہ روک لیتیں۔

ایک روز صبح سبزی لینے بازار گئے تو بہت سی سیم کی پھلی اٹھا لے آئے۔ باریک باریک پھلیاں بنانے میں کافی وقت لگنا تھا۔ کچھ دیر خانم کو پھلیاں بناتا دیکھتے رہے پھر مدد کی خاطر خود بھی بنوانے لگے۔ یوں دھیرے دھیرے انہوں نے خانم کے کئی کاموں میں حصہ لینا شروع کردیا۔ کپڑے دھوتیں تو نچوڑ کے لٹکا دیتے، سبزی بنوا دیتے، پونچھا لگا لیتے، ضرورت پڑنے پر پلمبر بھی بن جاتے۔

ایک روز سٹپٹا کے کہنے لگے ''بڑا کہتی تھیں ریٹائرمنٹ کے بعد آرام ہی آرام ہوگا۔ اب یہی آرام میرے لیے مصیبت بن چکا۔ اب بتاؤ کیا کروں؟ خالی ہاتھ میں بیٹھ نہیں سکتا۔ لاؤ آج تمہارے ساتھ آٹا گوندھوا تا ہوں۔''

خانم ہیں ہیں کرتی رہ گئیں اور یہ حقیقتاً آٹا تسلے میں لے بیٹھے۔ گھر میں دو ہی تو افراد تھے، لہٰذا آٹا دن میں ایک بار ہی گوندھتا تھا جو دو وقت با آسانی چل جاتا۔ بعض اوقات صبح ناشتے میں بھی وہی کام آتا۔ خانم کے لاکھ روکنے کے باوجود اپنی ہی کی اور ڈھیروں ڈھیر آٹا نکال لائے۔

خانم چلائیں ''ارے کچھ تو عقل کرو، اتنا آٹا کیوں نکال رہے ہو۔ کم کرو کم۔ یہاں کون سی بارات کھانے بیٹھی ہے جو اتنا گوندھو گے۔ بلکہ ہٹو تم سے نہیں ہوگا..... ستیاناس کردو گے۔ اب ہٹو بھی۔''

وہ جل بھن گئے' بولے ''تم عورتیں بس خود کو ہی عقل کل سمجھنا۔ ارے بھئی میں جانتا ہوں کیسے گوندھتا ہے آٹا۔ ہزار بار تمہیں گوندھتے دیکھا ہے۔ اب تو یاد ہو چلا ہے۔ کرنے دو مجھے بس تم دیکھتی جاؤ۔''

''اف میرے اللہ یہ چیچ بھر نمک کون ڈالتا ہے۔ کم کرو..... ارے میں کہتی ہوں کم کرو..... سنتے نہیں ہو کیا!'' خانم کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کس طرح نصیر احمد کو روکیں۔

''تم تو اتنا کم نمک ڈالتی ہو اسی لیے بدمزہ روٹیاں پکتی ہیں..... بس ٹھیک ہے اتنا۔ ہر بات میں ٹانگ اڑانے نہ کھڑی ہوجایا کرو۔'' نصیر احمد نے بے خیالی میں جلتی پر تیل چھڑک دیا۔

''اے ہے میں بدمزہ پکاتی ہوں تو تم ذائقہ پیدا کرنے کے لیے ہلدی مرچ کا ڈبہ بھی انڈیل لو۔ ارے تمہاری اماں مرحومہ جیسی بدمزاج عورت بھی کبھی میری پکائی روٹی میں عیب نہ نکال سکی..... ہائے میرے اللہ! اتنا پانی ایک دم سے کیوں انڈیل دیا! ٹھہرو..... نکالو اسے ورنہ سارا آٹا گیلا ہوجائے گا.....!''

''لو بھلا! آٹا گیلا ہوگا تو ہی گوندھے گا نا۔ اور دور بیٹھی رہو' ہاتھ نہ لگاؤ میں خود کرلوں گا۔'' نصیر احمد کو اپنی صلاحیتوں پر بڑا ناز تھا۔ تھا کوئی کام جس میں ہاتھ ڈالا ہو اور پورا نہ کیا ہو!

''اب تم سے کون مغز ماری کرے۔ کرو گے تم اپنی ہی مرضی۔ کچھ کہنا بے کار ہی ہے۔''

خانم تلملا کے دور جا بیٹھیں۔ نصیر احمد بڑے سے تسلے میں آٹا بھر کے پانی کا جگ اس میں انڈیلے کشتی کر رہے تھے۔

کافی دیر ہاتھ چلانے کے بعد جب کچھ بن نہ سکا تو سر اٹھا کے بیگم کو دیکھا۔ آٹے کے تسلے میں پتلی سی لئی میں گٹھلیاں تیر رہی تھیں۔ دونوں ہاتھوں میں کہنیوں تک آٹا سنا ہوا تھا۔ کچھ بالوں میں بھی چپک گیا تھا۔ گول برتن کے گرد دائرے

میں بھی گرا آٹا مصوری کا شاہکار معلوم ہو رہا تھا۔

''کیا ہوا میاں؟ گوندھ گیا آٹا؟'' خانم طنزیہ لہجے میں بولیں۔

دل ہی دل میں شرمندہ تو وہ خوب ہو رہے تھے مگر اقرار کرنا شان کے خلاف تھا۔

''اتنی دیر سے تمہاری چخ چخ سن رہا ہوں۔ یکسوئی سے تو کوئی کام کرنے نہیں دیتی ہو۔ بول بول کے کام خراب کر دیا۔ اب سمیٹو خود ہی اس سب کو۔'' وہ شانِ بے نیازی سے کندھے اچکاتے اٹھ کھڑے ہوئے۔ خانم بڑبڑاتی ہوئی گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے اٹھیں۔ آخر کار انہیں ہی یہ سب سمیٹنا تھا۔ بمشکل مزید آٹا ملا کر دوبارہ گوندھا۔ کم از کم ہفتہ بھر آٹا گوندھنے سے فرصت مل گئی تھی۔

اب خانم انہیں سب کچھ کرنے دیتیں سوائے باورچی خانے میں گھسنے کے! بلکہ اب تو وہ ان کی باقاعدہ نگرانی کرتی تھیں۔ پانی پینا چاہتے تو خود اٹھ کر لا دیتیں۔ اِدھر وہ باورچی خانے میں کھانا پکانے کے لیے پہنچتیں وہ خود بھی ساتھ پہنچ جاتے، اس سے پہلے کہ وہ کسی کام میں ہاتھ ڈال کے جنگی صورتحال پیدا کریں وہ کہتیں:

''کل جو آپ افسانہ سنا رہے تھے وہ ادھورا رہ گیا تھا۔ آگے تو سنائیے بڑا دلچسپ موڑ پہ تھا۔ آغا جی کیا خوب لکھتے ہیں!''

وہ بہانے تلاشنے لگیں اور جب وہ باورچی خانے کا رخ کرتے کسی نہ کسی طرح انہیں اِدھر اُدھر کر دیتیں۔ ایک روز خانم الماریاں صاف کر رہی تھیں تو ان کے ساتھ مل کر کپڑوں کی الماری ترتیب دی۔ خانم ویسے تو ہر کام کر لیتی تھیں مگر دیواروں کے جالے جھاڑنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ پہلے بہو کرتی تھی۔ پھر اس کے جانے کے بعد جب کبھی بیٹی آتی تو وہی کرتی تھی یہ کام مگر اب یہ کام اس کے ابا نے اپنے سر لے لیا تھا۔

اب وہ اسٹول پر چڑھے چھتوں کے جالے صاف کرتے، فرنیچر کی جگہ تبدیل کرتے۔ خانم چادریں پردے بدل دیتیں تو گھر کی شکل ہی بدل جاتی۔

بیٹی آئی تو گھر چمکتا دمکتا دیکھ کے حیران ہو گئی۔ کہنے لگی:

''امّی گھر کے جالے آپ نے اتارے ہیں؟ میں نے منع بھی کیا تھا آپ کو کہ دیواریں وغیرہ نہیں جھاڑیں گی' آپ کے ہاتھوں میں درد ہو جاتا ہے مگر آپ نے مانی نہیں میری بات!''

بیٹی ناراضگی کا اظہار کر رہی تھی، ابا میاں مسکرا رہے تھے، کہنے لگے:

''ارے بھئی یہ صفائی ستھرائی تمہاری امّی کہاں کرتی ہیں، انہوں نے تو گھر اتنا گندہ کر رکھا تھا، ہم ہی نے یہ جھاڑ پونچھ کی تھی ابھی دو روز پہلے۔''

''واقعی ابا؟ آپ نے یہ صفائی کی ہے۔'' سر اٹھا کے کونے دیکھتی بیٹی کے لیے کبھی ہل کر پانی نہ پینے والے ابا کا یہ روپ نیا تھا۔

ابا میاں فخر سے سینہ تانے اپنے کارنامے بتانے لگے تو امّاں بی نے بھی منہ بنا کر ان ساری تباہ کاریوں کے پول کھولے جو وہ بیچاری کئی دنوں سے خود ہی سہے جا رہی تھیں۔ ماحول میں قہقہے گونجنے لگے، خوشگوار سا سماں بندھ گیا۔

نصیر احمد کی ریٹائرمنٹ کو مہینے ہو گئے تھے۔ شروع شروع میں خانم اس مغالطے میں رہیں کہ میاں جی کا دماغ پھر گیا ہے۔ وہ خوب ہی بڑبڑایا کرتیں۔ میاں جی لطف لیتے اور جی جلانے کو ایک سے ایک نئی حرکت دریافت کر لیتے۔ شروع میں تو انہوں نے خانم کو خوب ہی تگنی کا ناچ نچایا مگر جب دھیرے دھیرے انہیں نصیر احمد کی اس امداد سے سہولت ہونے لگی تو انہیں بھی اچھا محسوس ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ دونوں مل جل کر ہر کام کرنے لگے، ساتھ ساتھ باتیں بھی ہوتی رہتیں۔ خانم کی تنہائی دور ہو رہی تھی تو نصیر احمد کے ہاتھ نت نئے مشغلے آتے جا رہے تھے۔

جب خانم سے جھڑپ ہوئے کئی روز گزر جاتے اور راوی چین لکھنے لگتا تو نصیر احمد کے تن بدن میں اداسی چھا جاتی۔ اس اداسی کو دور کرنے کے لیے چیزیں ان کے ہاتھوں سے پھسل پھسل کر زمین پر سجدہ ریز ہونے لگتیں۔ ان کے بے چین قدم انہیں باورچی خانے میں لے آتے اور وہ کچھ پکانے کی سعی کرتے اور ایسا کرتے وقت خوب شور کرتے۔ خانم جو گھوڑے گدھے بیچ کر سو رہی ہوتیں' شور سے ان کی آنکھ کھل جاتی اور وہ دوڑی چلی آتیں۔

جب وہ جائے واردات پر پہنچتیں تو ان کے پیروں تلے زمین نکل جاتی۔ کچن تلپٹ ہوتا اور میاں جی اس میں شغل فرما رہے ہوتے۔ پھر جو وہ شروع ہوتیں تو ان کی ساری نقاہت دور ہو جاتی، وہ بھی خوب تاک تاک کے وار کرتے اور لطف لیے جاتے۔

ایسا نہیں تھا کہ نصیر احمد نے باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا بلکہ وہ اب بھی اسی طرح شام کو گراؤنڈ کے کنارے اپنے ہم عصر احباب کے جھرمٹ میں بیٹھتے تھے۔ سبزی والے کے پاس جاتے تو بھی گھنٹوں بعد واپس آتے اور صبح کی چہل قدمی بھی جاری و ساری تھی۔ بلکہ اس میں اب یہ اضافہ ہو گیا تھا کہ نماز کے بعد گھر واپس آتے تو خانم کو زبردستی ساتھ لیتے اور پھر انہی کے ساتھ چہل قدمی کرتے گھر واپس آتے۔

ابتداً وہ بہت بوکھلائیں۔ اتنا چلنے کی وہ عادی نہیں تھیں۔ کمر میں الگ درد رہتا تھا۔ پھر یہ بہانا کہ چہل قدمی کو گئے تو ناشتا کب بنے گا' تاخیر ہو جایا کرے گی۔

میاں جی کے پاس ہر بات کا جواب تھا۔ انہیں کون سا دفتر جانا ہوتا تھا کہ وہ نو بجے سے چند منٹ تاخیر سے ناشتا نہ کر سکیں۔

''مل کر بنا لیا کریں گے۔ یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' ان کے اطمینان بھرے مشورے نے ان کی سٹی گم کر دی۔ وہ اس شرط پہ چلنے پہ راضی ہوئیں کہ وہ آئندہ کبھی ناشتا بنانے کے سلسلے میں اپنی خدمات پیش نہیں کریں گے۔

یہ ایک نئی زندگی تھی جو وہ جی رہے تھے۔ زندگی کے سب سے قیمتی سال پیسا کمانے اور بچوں کو کسی قابل بنانے کی دھن میں گزر گئے تھے۔ کبھی گھریلو معاملات کی طرف توجہ نہ دی تھی مگر اب کئی ان کہی شکایتوں کو دور کرنے کا وقت تھا۔ زندگی کی جس ساتھی نے ساری عمر انہیں اور ان کی ضروریات کو دیکھا بھالا تھا' وہ دل سے ان کی قدر کرتے تھے۔ اب ان کے نزدیک اسے خوش رکھنے اور اہمیت دینے کا وقت تھا۔

صحن میں کیاریاں اگ آئی تھیں۔ وہ وقفے وقفے سے طرح طرح کے پودے لے آتے اور کچی جگہ پہ لگا دیتے۔ ایک روز بکری لے آئے تو خانم خوش ہو گئیں۔ گھر میں جیسے نیا بچہ آ گیا۔ دن رات اس کی خبر گیری کرتیں۔ خوشی کا ایک سبب یہ تھا کہ گوالا انتہائی بدمزہ کیمیکل ملا دودھ دیتا تھا، اب اس کو فارغ کر کے بکری کا تازہ دودھ استعمال میں لایا جاتا۔

میاں جی کی زندگی میں بہار آ گئی مگر دل میں یہ خلش چبھتی کہ ان کی نصف بہتر انہیں باورچی خانے میں گھسنے نہیں دیتی۔ کبھی کبھار جی میں آئی کہ کوئی خوب چٹخارے دار چیز بنائیں مگر کب؟ اور کیسے؟ یہ جواب نہ مل پاتا اور وہ دل مسوس کر رہ جاتے۔ دل کی حسرت دل میں ہی دبی ہوئی تھی مگر باہر نکلنے کو بے تاب تھی اور پھر انہیں یہ موقع میسر آ ہی گیا۔

ہوا یوں کہ ایک دن خانم بیمار پڑ گئیں۔ بدلتے موسم کی کاریگری تھی۔ موسم کا بخار تھا۔ الٹیاں بھی ہو گئیں۔ سو نقاہت بھی بہت تھی۔ وہ انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر نے دوائیوں کا لمبا سا پرچہ تھماتے ہوئے آرام کا مشورہ دیا۔ گھر آتے ہی خانم دوا کھا کر غنودگی میں چلی گئیں۔

کھانے کا وقت ہو رہا تھا اور زوروں کی بھوک ستا رہی تھی۔ باورچی خانے میں کھانے کے لیے کچھ نہ تھا۔ انہوں نے فریج کھول کر پھل کی ٹوکری باہر نکالی تو اس میں دو کیلے رکھے تھے۔ وہ کھا لیے تو کچھ آسرا ہوا مگر بھوک پوری طرح نہ مٹی۔ خانم کچھ بنا نہ سکتی تھیں بلکہ انہیں خود نرم غذا کی ضرورت

تھی۔ نہ تو وہ خود بازار کے کھانے کھاتے تھے اور نہ ہی خانم کے لیے کھچڑی دلیہ جیسی غذا بازار سے مل سکتی تھی۔

کچھ سوچ کر ان کے فکر مند چہرے پہ چمک آئی اور وہ جھٹ پٹ کمرے کی طرف مڑے۔ کمرے میں خانم کے خراٹے گونج رہے تھے۔ انہوں نے دبے قدموں ان کی کتابوں کے ڈھیر کی طرف توجہ کی اور بغیر کوئی آواز نکالے چند ڈائریاں اور رسائل اٹھائے باہر آ گئے۔

لاؤنج میں بیٹھ کے کھانے پکانے کے رسالے نکالے۔ یہ رسالے حمید کی بیوی یہاں بھول گئی تھی۔ ایک سے ایک عمدہ ترکیب مع تصویر کے درج تھی جسے پڑھ پڑھ کر منہ میں پانی بھر آ رہا تھا۔ اتنی ترکیبیں...... انہیں لگا کھانوں کے طباق قطار در قطار میز پہ لگے ہیں اور ان میں سے لذیذ خوشبوئیں اٹھ کر معدے میں طغیان مچا رہی ہیں۔

دل للچا رہا تھا، سمجھ ہی نہیں آتا تھا کہ کونسی ترکیب منتخب کریں اور کس کو چھوڑیں۔ اسی چکر میں وہ اپنے معدے کا احوال بھول گئے جو ذرا سی بھی گرانی برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ خانم ان کی لن ترانیاں سننے کے باوجود وہی پکاتی تھیں جو ان کے نحیف و نزار معدے سے بآسانی گزر جانے کی طاقت رکھتا تھا۔

بڑی تگ و دو کے بعد ان کی نظریں بریانی کی ترکیب پہ آ کے ٹک گئیں۔ ساتھ ہی بریانی کی تصویر بھی چسپاں تھی جس میں سے سالم ران جھانک رہی تھی اور گرم گرم بھاپ اڑا رہی تھی۔ اب تو بریانی کھائے بھی زمانے ہونے کو آ رہے تھے۔ پچھلے سال اجمل کی شادی پہ خوب دبا کہ کھائی تھی۔ اس کے بعد جو بستر پہ پڑے تو ہفتے بعد ہی اٹھے تھے۔ اس دن کے بعد وہ جس بھی شادی میں گئے، خانم انہیں ناک تک پھیکا بدمزہ کھانا کھلا اور دوا کا تڑکا لگا کے بھیجتیں۔ اس معاملے میں بڑی چوکس تھیں وہ۔

مگر آج میدان صاف تھا۔ ظالم سماج عالم غنودگی میں بستر علالت پر محو استراحت تھا۔ انہوں نے ایک صفحے پہ اجزائے ترکیب اتارے۔ رسالہ مخصوص جگہ پر اسی ترتیب سے رکھا اور کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر آ گئے۔

اجزائے ترکیبی کے مطابق سامان کی تلاش میں سب سے پہلے فریزر کی تلاشی لی تو وہاں یخنی کے لیے ہڈیاں، بچے ہوئے کھانوں کی پڑیاں اور گلا کر منجمد کیے ہوئے ٹماٹروں کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

پھر باورچی خانے میں الماریوں کی باری آئی۔ فرداً فرداً ہر الماری کھول کر ڈبے، بوتلیں، شیشیاں، پڑیاں نکال کر مطلوبہ اجزاء تلاش کیے اور نہ ملنے والی اشیاء پر ٹِک کا نشان لگا کر ان کی خریداری کے لیے بازار کا رخ کرنے دروازے کی طرف مڑے تو فرش پر پھیلے سامان کی وجہ سے کئی بار الجھ کر گرتے گرتے بچے۔

بازار جا کر سب سے پہلے گوشت خریدا۔ پیاز آلو ہمہ وقت گھر میں موجود رہتا تھا۔ ٹماٹر دھنیا پودینہ لینے کے بعد پرچون کی دکان کا رخ کیا۔ دکاندار اکمل عرف اکو پہچان والا آدمی تھا۔ نصیر احمد سے روز کی گرمجوشی سے ملا۔ انہوں نے سامان کا پرچہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس نے بغور پرچہ دیکھا پھر ان کو دیکھا......"ارے خالو میاں! کیا صاجزادے آ رہے ہیں آج اسلام آباد سے؟"

نصیر احمد ہنسے......"نہیں بھئی آج ہم بریانی بنائیں گے، تمہاری خالہ بیمار ہیں۔ گھر میں کھانے کو کچھ نہیں۔ بڑے دن ہوئے بریانی کھائے ہوئے تو سوچا آج کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔"

"ارے خالو میاں! اتنا تردد کیوں کرتے ہیں۔ پکی پکائی بریانی خرید لیتے، جگہ جگہ مل جاتی ہے۔"

"نہیں میاں پکی پکائی تو زندگی بھر کھاتے رہے۔ آج تو ہم خود ہی پکائیں گے۔"

"تو جناب اتنی چیزیں خرید کے خود کو مشکل میں کیوں ڈالتے ہیں۔ لیجیے یہ پیکٹ کا مسالا لے جائیے۔ سب مسالا

موجود ہے اس میں۔ سہولت رہے گی آپ کو۔" اکّو نے مسالے کا ڈبہ انہیں پکڑایا تو وہ چونکے اور اس قدر عمدہ مشورے پر اسے خوب داد دی۔ ورنہ وہ گھر سے جب سے چلے تھے، اتنی چیزوں کے نام اور تناسب سے ہی پریشان تھے۔ آج وہ زیادہ دیر بازار میں رکے بھی نہیں بلکہ جلد ہی چاول اور مسالا لے کر گھر لوٹ آئے۔

گھر پہنچ کر سب سے پہلے انہوں نے باورچی خانے کا رخ کیا اور راستے میں پڑی چیزیں ہٹا ایک طرف کر کے گزرنے کی جگہ بنائی۔ اب سب سے پہلا مرحلہ پیاز کاٹنے کا تھا جو ان کے لیے وبال جان بن گیا۔ آنسو بہ بہ کے آنکھیں سرخ ہوتی جا رہی تھیں اور ڈاڑھی تر۔ کوئی جھانک لیتا تو سمجھتا کہ بزرگوار کسی قریبی عزیز کو دفنا کے ابھی ابھی لوٹے ہیں۔

بڑی تگ و دو کے بعد یہ مرحلہ طے ہوا اور اس دوران کئی جگہ سے ہاتھ بھی کٹ گیا۔ ادرک لہسن خانم پیس کر رکھتی تھیں۔ ٹماٹر بھی کسی نہ کسی طرح کاٹ لیے۔ مسالے کے ڈبے پر لکھی ترکیب کے مطابق جب گوشت مسالا برد کرنے کا مرحلہ آیا تو انہیں یاد آیا کہ گوشت تو دھویا ہی نہیں!

یہ کام ان کے لیے بے حد مشکل اور تکلیف دہ ثابت ہوا۔ پہلے گوشت سے لگے چھیچھڑے صاف کیے اور اسے دھونے کے دوران خود بھی نہا گئے۔ بہرحال گوشت دھل بھی گیا اور اسے مسالے میں چھوڑ بھی دیا گیا۔ ساتھ ہی آلو بھی ڈال دیے گئے۔

کلو گوشت کے لیے کلو ہی چاول نکالتے وقت وہ یہ بھول گئے کہ گھر میں موجود دو روحوں میں سے وہ واحد ہیں جنہوں نے یہ بریانی نوش فرمانی ہے۔ ان پر بس دھن سوار تھی۔ ایک دیگچی میں قورمہ پک رہا تھا اور دوسری طرف چاول کے لیے پانی ابل رہا تھا۔ چاول دھو کر انہوں نے پانی میں ڈال دیے۔ مگر پھر ایک جگہ وہ اٹک گئے۔ اب یہ کنّی وٹّی پتا نہیں کیا لکھا تھا۔ کافی غور و خوض کے باوجود سمجھ نہ آ سکا۔

دھنیا پودینہ کاٹ کر علیحدہ رکھ دیا تھا۔ ساتھ ساتھ چاول کے دانے بھی نکال نکال کر دیکھتے جاتے کہ چاول گلے ہیں یا نہیں۔ مگ بھر کے رنگ علیحدہ گھول رکھا تھا اور اب ہر طرف رنگ ہی رنگ تھا۔ سفید شلوار سوٹ تک نارنجی رنگ کا ہو گیا۔ ہاتھ منہ، باورچی خانے کا فرش سب پہ یہی رنگ چڑھا تھا۔

تب ہی دروازے کی گھنٹی بجی اور بجتی ہی چلی گئی۔ وہ جب تک ہاتھ دھو کر دروازے تک پہنچے، خانم کی نیند ٹوٹ چکی تھی۔ وہ نحیف آواز میں انہیں پکار رہی تھیں۔

"اچھا اچھا کھول رہا ہوں......آ رہا ہوں......" کہتے وہ دروازے تک پہنچے اور دروازہ کھول دیا۔

باہر بہو بیٹا بچوں سمیت کھڑے تھے۔ ساتھ ہی بڑے بڑے سفری بیگ رکھے تھے۔ نصیر احمد بیٹے کو یوں اچانک سامنے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھے۔ بیٹے کو گلے لگایا۔ بہو کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ ابھی بچوں کے ماتھے چوم ہی رہے تھے کہ دروازے پر ایک ٹیکسی آ کر رکی۔ بیٹی داماد نواسے نواسیوں سمیت اترنے لگے۔ یوں لگتا تھا جیسے یکا یک آنگن میں خوشیوں کی برسات ہو گئی ہو۔ کئی دنوں بعد آج ان کا سارا خاندان ایک چھت تلے جمع ہوا تھا۔

"ہائے میرے ابا کو کیا ہو گیا......؟؟" حلیمہ کی نظر جونہی ان کے حلیے پہ پڑی وہ تیزی سے آگے آئی۔ نصیر احمد جو کبھی سوٹ پہ شکن نہ آنے دیتے تھے۔ اب نچڑے ہوئے لباس میں کھڑے تھے۔ کرتا پانی سے تر تھا اور سر تا پا نارنجی ہو رہے تھے۔ ہاتھ میں جہاں جہاں کٹ لگا تھا، وہاں عجلت میں خاکی لفافے کا ٹھونکا لپیٹ کر ربربینڈ سے باندھ دیا گیا تھا۔

اس سے پہلے کہ ابا میاں کچھ کہتے سب ہی نے ان کے حلیے کی طرف توجہ کی۔ حامد کو تو ابا کے حلیے پہ ٹوٹ کہ شرم آئی۔ اب وہ انہیں بازو سے تھامے اندر لے جاتا ہوا دل ہی دل میں خود کو کوس رہا تھا کہ نوکری کی مجبوری نہ ہوتی تو کبھی ماں باپ کو اس حال میں چھوڑ کر نہیں جاتا۔ اس بار تو واقعی انہیں منا کر

اپنے ساتھ لے کر ہی جاؤں گا' وہ خود سے وعدہ کرنے لگا۔

''ارے بچو! کچھ نہیں ہوا ہمیں' ہم تو بھلے چنگے ہیں۔ ہاں البتہ تمہاری ماں کی طبیعت کچھ اچھی نہیں۔''

خانم کی طبیعت کا سن کر سب ہی ان کے کمرے میں پہنچے۔ وہ جاگ رہی تھیں۔ اب جو ساری آل اولاد کو سامنے پایا تو خوشی سے نہال ہونے لگیں۔

حال احوال کے تبادلے کے بعد جب فضا پرسکون ہوئی تو حلیمہ کے میاں افضل اپنے سسر سے ان کی خیریت دریافت کرنے لگے۔ توجہ ان کے ہاتھ پہ لگی چوٹوں پر تھی۔ اب کے خانم کی نظر میاں پر پڑی تو وہ سر پیٹ کر رہ گئیں۔ نصیر احمد کا حلیہ اس فلم کا 'ٹریلر' تھا جو یقیناً باورچی خانے میں جاری ہوئی تھی۔ وہ کچن کی صورتحال کا تصور غائبانہ کرکے تاؤ کھا کر رہ گئیں۔ سامنے بچے بیٹھے تھے جن کی ساری توجہ اپنے ابا میاں کی طرف تھی۔

''نوج! بہو اور داماد سمجھتے ہوں گے' بڑھی اس عمر میں میاں سے چولہا ہانڈی کرواتی ہے۔'' دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے وہ باقاعدہ لتاڑ تو نہ سکیں ہاں اتنا ضرور کہا: ''کر لی نا اپنی مرضی! اب ذرا بتا بھی دو کہ باورچی خانے میں کیا دنگل مچا کے آئے ہو؟''

''وہ...... دراصل بات یہ ہے بچو کہ ہم بریانی بنا رہے تھے......'' نصیر احمد نے خانم سے نظریں چراتے ہوئے بچوں کو مخاطب کیا۔

''بریانی......!!!'' خانم بال نوچنے پہ آگئیں۔

بیٹا داماد حیران' بیٹی پریشان اور بہو...... اس نے غصیلی نگاہوں سے میاں کو یوں گھورا جیسے کہہ رہی ہو' کچھ اپنے ابا سے ہی سیکھ لیتے۔ آج تک ایک انڈہ تو فرائی کرکے کھلایا نہیں اور یہاں کا حال دیکھو!

نصیر احمد یہ کہہ کے خود باورچی خانے چلے گئے اور پیچھے سبھی کو حیران چھوڑ گئے۔ حیرت کے سمندر سے سب سے پہلے حلیمہ نکلی پھر حمید کی بیوی فہمیدہ۔ پھر دونوں آگے پیچھے بریانی دیکھنے نصیر احمد کے پیچھے چلی آئیں۔

اندر جمعہ بازار کے کسی اسٹال کا منظر تھا۔ فرش پر یہاں سے وہاں تک مسالے اور برتن پھیلے ہوئے تھے۔ باورچی خانے کا پتھریلا تختہ کچرے خانے کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اس سب کے درمیان وہ کھڑے چاولوں میں چمچہ چلا رہے تھے۔

''لایئے ابا جان ہم دیکھ لیتے ہیں۔'' حلیمہ آگے بڑھی۔ اور نیچے پڑی تھیلیوں سے الجھ کر گرتے گرتے بچی۔ فہمیدہ تیزی سے چیزیں سمیٹ کر ٹھکانے لگانے لگی۔

''نہیں بیٹا' ہم کر لیں گے۔ آپ لوگ جا کر بیٹھو' باتیں کرو۔'' انہوں نے ٹالنا چاہا۔

اب وہ حلیمہ سے کنّی کا مطلب پوچھ رہے تھے اور فہمیدہ قورمہ کی دیگچی کا ڈھکن اٹھا کر شوربے میں تیرتے آلو گوشت دیکھ کے گنگ تھی۔

''ابا جی آپ نہا کر کپڑے تو بدل لیں۔ افضل کیا سوچیں گے۔ فکر نہ کریں ہم آپ کا کوئی کام خراب نہیں کریں گے۔''

''اچھا...... چلو ہم آتے ہیں ذرا دیر میں۔ ہم کر لیں گے۔ تم لوگ کچھ نہ کرنا' بس کھڑی دیکھتی رہو۔'' چند لمحے سوچ کر وہ بالآخر رضامند ہو گئے اور پھر باورچی خانے سے نکل آئے۔

حلیمہ اور فہمیدہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ہنسی دباتی ہوئی پتیلیوں کی طرف متوجہ ہوئیں۔ فہمیدہ قورمہ خشک کرنے میں لگ گئی اور حلیمہ چاول سنبھالنے میں۔ کچھ دیر میں ابا جی غسل کر کے تازہ دم ہوئے اندر آئے تو بریانی دم پہ تھی۔

''جب میں نے منع کیا تھا کہ تم لوگ کچھ نہیں کرو گی تو کیوں ہاتھ لگایا تم لوگوں نے؟ میں منع کر کے گیا تھا پھر بھی کوئی بات سمجھ نہیں آتی تم لوگوں کو!'' ان کے اندر کا جلاّد جاگ اٹھا مگر آواز نیچی رکھی۔

''ابا جی اگر میں چاول نہ چھانتی تو وہ گیلے ہو جاتے پھر

بریانی نہیں بنتی اور پھر شام ہو گئی ہے۔ آپ لوگ صبح سے کے ہیں۔ ہم آپ کا انتظار کرتے تو مزید دیر ہو جاتی۔''

نے بات بنا کے ان کا غصہ ٹھنڈا کیا۔

کچھ ہی دیر میں کھانا لگا دیا گیا۔ فہمیدہ اور حلیمہ اپنے ساتھ لائے کھانے گرم کر لائیں۔ بریانی کی ڈش ان میں سجا دی گئی۔ حامد مٹھائی کی دکان سے بادام کی کھیر آیا تھا۔ خانم کی نشست کے آگے ساگودانے کا پیالہ تھا۔ وفور جذبات سے سرخ دکھائی دے رہے تھے۔

کھانا شروع ہوا تو سب ہی نے پہلے بریانی پلیٹوں میں الی۔ شکل عمدہ تھی تو ذائقہ لاجواب! تعریفوں کے پل باندھنا ع ہوئے تو خانم کو بے چینی لاحق ہوئی۔ عمدہ خوشبوئیں اٹھ ہوں تو ساگودانہ کیوں کر حلق سے نیچے اترتا۔ ان کی یں بار بار بریانی کی طرف اٹھ رہی تھیں مگر...... کہیں تو بھلا ے...... ابھی وہ اسی شش و پنج میں تھیں کہ حامد نے چمچ بھر ان کے منہ میں دے دیا...... نصیر احمد بولے:

''چکھ کے دیکھو تمہاری بیماری کی برکت سے بنی ہے یہ انی۔'' خانم نے گھورا تو پوچھا ''کہو کیسی بنی ہے بریانی؟'' وہ سی کر گئیں۔

نصیر احمد کی آج تو باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ آج انہیں وں کی آمد پر چیزوں کی ترتیب الٹنے کی بھی فکر لاحق نہ ہوئی ی۔ خانم پر بھی میاں کی اس خوبی کا جوہر آج پہلی مرتبہ کھلا ا۔ بے شک مسالے بازاری تھے پھر بھی مونگ مسور کی اوں کے فرق نہ سمجھنے والے میاں صاحب نے اچھی بریانی ڈالی تھی۔ ویسے کچھ کچھ اندازہ تھا انہیں کہ فہمیدہ اور حلیمہ وں ہی صاحب بہادر کے پیچھے نہیں بھاگی تھیں۔ بہرحال وہ اپنے سارے ہتھیار پھینک کر خوش ہو گئیں۔ نصیر احمد نے ان کی سوچ پڑھ لی اور پلیٹ بھر کے ان کے سامنے رکھ دی۔ ساگودانہ یوں ہی پڑا رہ گیا۔

پھر بریانی نے خانم کے پیٹ میں پہنچ کر کیا اودھم مچایا یہ ایک الگ موضوع ہے جس کی تفصیل ہم آپ کو پھر کبھی بتائیں گے۔ فی الحال اتنا جان لیجیے کہ نصیر احمد کو بچوں کی حمایت ضرور حاصل ہو گئی اور وہ باورچی خانے میں داخل ہونے کے لیے خانم کی اجازت کے محتاج نہ رہے۔ بلکہ اب تو خانم بھی انہیں نت نئی چیزیں سکھانے پہ کمربستہ ہو گئی تھیں۔

اس سے ان کے چھوٹے سے باورچی خانے میں کیا کیا طوفان برپا ہوتے ہیں' اس سے قطع نظر دونوں میاں بیوی اب بے حد خوش رہنے لگے ہیں...... ہمیں اور کیا چاہیے؟

غزل

غم اس قدر اٹھائے کہ عادت سی پڑ گئی
زخمِ جگر کو اب نہیں مرہم کی آرزو

میں اس لیے پھولوں کا پرستار رہا ہوں
گل ہی سے ہوا کرتی ہے گلشن کی آبرو

ہم وہ ہیں کہ تنہائی کے سمندر میں صبح و شام
تنہائی سے تنہائی میں کرتے ہیں گفتگو

پوچھو تو ہے صدقۂ سرکارِ دو عالم
اب آنے لگی ہے میرے اشعار میں خوشبو

تنہائی بھی کیا شے ہے کہ خدا نے شبِ معراج
آقائے دو جہاں کو بلایا تھا روبرو

بخشش کے لیے عشقِ محمدؐ ہے ضروری
مطلب یہ ہے کہ دل میں احمدؐ کی آرزو

قاضی احمد حسین، میرین انجینئر

شمسی پینلوں کی بہار

لوڈشیڈنگ کے توڑ سورج کی روشنی سے مستفید ہونا اب خاصا سہل ہوچکا

سلیم احمد

چائے کی ٹرے جتنا ایک چھوٹا ۲۰ واٹ کا پینل، یوسف محمد کے دو کمروں والے گھر کے احاطے میں رکھا ہوا تھا۔ آج بھی گرڈ اسٹیشن سے بجلی ضلع ٹھٹھہ میں واقع ماہی گیروں کے اس گاؤں تک نہیں پہنچی، مگر یہاں کے باسیوں نے اس کا حل نکال لیا ہے اور وہ ہے شمسی توانائی!

یوسف محمد سمندر میں مچھلیاں پکڑ کر گزارا کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے ''بیس واٹ کا یہ سولر پینل مجھے تین ہزار میں پڑا۔ اب میں اس پینل کے ذریعے دنیا سے جڑا رہتا ہوں۔'' ڈی سی کنورٹر یا کار فون چارجر سے منسلک یہ پینل روزانہ دن میں ایک بار موبائل فون کی بیٹریاں چارج کرتا ہے۔ یوسف خوشی سے کہتا ہے' میں سولر پینل کو اپنے فشنگ ٹرالر میں بھی لے جاتا ہوں، یہ بالکل مفت ملنے والی بجلی ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ شمسی توانائی کی مقبولیت پاکستان بھر میں بتدریج بڑھ رہی ہے۔ گرڈ کی بجلی جس کا بیشتر حصہ خام تیل اور پانی کی ٹربائنوں سے بنتا ہے، مہنگی ہو رہی ہے یہاں تک کہ عام استعمال بھی کافی مہنگا پڑتا ہے۔ اس سے ہٹ کر ناقابل انحصار سپلائی اور مسلسل لوڈشیڈنگ نے ملک میں بجلی کا بحران بڑھا دیا ہے۔ ایک فری لانس ڈیٹا انٹری آپریٹر' ذوالفقار شاہ کے تو تمام آلات بجلی بار بار آنے جانے سے تباہ ہوگئے۔ وہ یہ آلات پیشہ ورانہ امور کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ان کا کہنا ہے: ''بار بار بجلی جانے سے اپنے آلات کو نقصان پہنچنے کے باعث میں شمسی توانائی کو اپنا چکا''۔

وہ بتاتے ہیں ''میں نے چار سستے اور پرانے سولر پینل خریدے جو گڈانی کی شپ بریکنگ یارڈ سے نکالے گئے تھے۔ میں نے ان میں دو ۱۲۰ ایمپیئر کی ری سائیکل ٹرک بیٹریوں کا اضافہ کیا جو گارڈن' کراچی کے علاقے سے خریدی گئیں۔ اسی طرح ریگل چوک کے قریب الیکٹرونک مارکیٹ سے میں نے ایک سستا یو پی ایس خرید لیا۔ لگ بھگ ۸۰ ہزار روپے خرچ کرنے کے بعد اب مجھے کمپیوٹر کے لیے بلاتعطل بجلی ملتی ہے۔ شمسی توانائی کی مہربانی سے مجھے اب بار بار بجلی جانے کا خوف نہیں رہا جبکہ میری آمدنی بھی مستحکم ہوئی ہے''۔

پاکستانی شہروں میں کئی لوگوں نے ایسے سولر سسٹم گھروں میں لگوا لیے ہیں جو پوری بجلی سورج سے پیدا کرتے ہیں۔ ان

کا کہنا ہے کہ اس سے ان کی زندگیاں آسان ہوگئی ہیں اور گلے بیس سے پچیس سال تک کے لیے وہ بجلی کے بحران سے آزاد ہو چکے۔

بیگم اے سلیم ملتان کے ایک ایسے علاقے میں مقیم ہیں یہاں اکثر لوڈ شیڈنگ ہوتی ہے۔ بجلی کے بار بار تعطل سے اب گھر کی مصنوعات کو نقصان پہنچا' تو وہ توانائی کے متبادل ذریعے تلاش کرنے پر مجبور ہوگئیں۔ انھوں نے بتایا ''جب ایک کے بعد ایک ہماری برقی مصنوعات غیر اعلانیہ لوڈ شیڈنگ اور وولٹیج میں کمی بیشی سے خراب ہونے لگیں تو ہم نے حل تلاش کرنے کا فیصلہ کیا''۔

اس خاندان نے ۵ کلو واٹ کا سولر سسٹم خریدا جس کی لاگت ۸ لاکھ روپے کے لگ بھگ تھی، مگر یہ سرمایہ کاری فائدہ مند ثابت ہوئی: ''ہماری بجلی کا بل ڈرامائی حد تک کم ہوگیا کیونکہ اب ہم میپکو (ملتان الیکٹرک پاور کمپنی) کی بجلی کبھی کبھار ہی استعمال کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب باہر بادل چھائے ہوئے ہوں اور سورج زیادہ چمک نہ رہا ہو۔ اس سے پہلے ہم ہر ماہ تیس ہزار روپے کا بل ادا کرتے تھے مگر اب بمشکل دو ہزار سے زیادہ ہوتا ہے''۔

انہوں نے بتایا ''آج ہمارے گھر کے پنکھے، ٹیلی ویژن، فریج، فریزر، ایئر کنڈیشنر، واشنگ مشین اور واٹر پمپ شمسی توانائی پر چل رہے ہیں۔ رات کے وقت ہم بیٹریوں میں جمع ہونے والی بجلی استعمال کرتے ہیں جو دن بھر چارج ہوتی رہتی ہیں۔ میرے بچوں کو آخر سکون میسر آ گیا اور وہ تعطل بجلی کے اندھیرات کو پڑھ سکتے ہیں''۔

اگر متعدد صارفین کے دعووں پر یقین کیا جائے، تو ایسی مصنوعات جنھیں بہت زیادہ بجلی درکار ہوتی ہے' وہ بھی شمسی توانائی سے بغیر کسی مشکل کے کام کرتی ہیں۔ اس کے لیے بس بیٹریاں درکار ہیں۔ بیک اپ بیٹریوں کا انتخاب استعمال کے مطابق کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بیگم اے سلیم کے گھر میں ۲۰۰/ ایمپیئر فی کس والی بارہ ٹرک بیٹریوں کی ضرورت پڑی جو ان کی توانائی ضروریات پوری کرتی ہیں۔

سولر پینلز کو زیادہ جگہ درکار نہیں ہوتی' اسے چھت پر نصب کیا جاسکتا ہے۔ آج کل متعدد گھروں میں یہ پینل لگ چکے اور ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ کراچی میں ریگل چوک کے قریب واقع الیکٹرونکس مارکیٹ کی ہر دوسری دکان میں سولر پینلز فروخت ہوتے ہیں۔ دنیا بھر میں تین طرح کے سولر پینلز مستعمل ہیں، سنگل کرسٹل سلیکون پینلز یا (monocrystalline)، پولی سلیکون پینلز یا پولی کرسٹلائن اور ٹی ایف ٹی پینلز۔ دکانداروں کا کہنا ہے کہ صارفین عموماً سنگل کرسٹل سلیکون یا پولی سلیکون پینلز کا انتخاب کرتے ہیں۔ طلب کی وجہ سے مارکیٹ میں انہی کی بھرمار ہے۔

فروخت کا موازنہ کیا جائے تو سنگل کرسٹل سلیکون پینلز زیادہ فروخت ہوتے ہیں کیونکہ وہ ابر آلود موسم میں بھی کام کرتے ہیں۔ پولی سلیکون پینلز کو سورج کی زیادہ روشنی درکار ہوتی ہے۔ یہ اگرچہ سستے ہیں مگر آج کل بیشتر افراد ابر آلود موسم میں کام کرنے والے پینلز کا انتخاب کر رہے ہیں۔

الیکٹرونکس مارکیٹ کی ایک دکان' کورین الیکٹرونکس سے وابستہ محمد افسر علی کہتا ہے ''دونوں قسم کے پینلز کے درمیان کچھ ایسا ہی فرق ہے جیسے ایک فور اسٹروک انجن اور ایک ٹو اسٹروک انجن کے درمیان۔ فور اسٹروک انجن کی پک اپ اچھی ہوتی ہے مگر گرم ہونے کے بعد کارکردگی ختم ہو جاتی ہے۔ دوسری جانب ٹو اسٹروک انجن گرم ہونے کے بعد زیادہ اچھا چلتا ہے۔ سنگل کرسٹل سلیکون پینلز کو فور اسٹروک انجن کہا جاسکتا ہے جبکہ پولی سلیکون پینل ٹو اسٹروک انجن جیسے ہیں''۔

کون سا سسٹم زیادہ بہتر رہے گا، اس امر کا تعین کرنے کے لیے صارفین کے پاس ایک اور طریقہ کار بھی ہے۔ ان میں سب سے مقبول قسم ہائبرڈ سسٹم ہے جو گرڈ سے منسلک ہو

جاتا اور رات کو بھی بیٹریاں چارج رکھتا ہے۔

جہاں تک ہوا سے چلنے والی چکیوں کا تعلق ہے تو افسر علی وضاحت کرتے ہیں کہ اس طرح کا پاور سسٹم پاکستان میں زیادہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ وجہ یہ کہ اس کے لیے کم از کم ۱۲ ناٹیکل میل کی رفتار سے چلنے والی ہوا درکار ہوتی ہے۔ ''ہوا میں نمی اور مٹی پن چکی کو زنگ آلود اور ناکارہ بنا دیتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں سولر پینل زیادہ موثر ہیں''۔

مارکیٹ کے بیشتر دکانداروں نے ایک گھر میں ایک سولر سسٹم کی لاگت کے فارمولے کی وضاحت کی۔ ان کے تخمینے کا آغاز چالیس روپے کی ایک بیٹری سے ہوتا ہے، جس کو واٹس اور گھنٹوں سے ضرب دی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ کو چوبیس گھنٹوں کے لیے ایک ہزار واٹ بجلی کی ضرورت ہے تو اس فارمولے کے مطابق دس لاکھ روپے کی لاگت سے لگنے والے شمسی پینل مطلوبہ بجلی فراہم کر دیں گے۔ اس لاگت میں نصب کرنے کے اخراجات بھی شامل ہیں۔

افسر علی کے مطابق ''اس لاگت میں کمی لائی جا سکتی ہے اگر آپ مقامی بیٹریاں استعمال کریں۔ یہ بیٹریاں غیر ملکی بیٹریوں کے مقابلے میں خاصی سستی ہیں۔ تب شمسی پینلوں کی تنصیب کا خرچ چھ لاکھ روپے رہ جاتا ہے''۔

انہوں نے مزید بتایا، ''اسی طرح اگر آپ چوبیس گھنٹے سولر پاور استعمال نہیں کرنا چاہتے بلکہ صرف لوڈ شیڈنگ کے دوران استعمال کرتے ہیں تو آپ کو گھنٹے کم کرنا ہوں گے۔ جیسے چھ گھنٹے، تب شمسی پینلوں کی تنصیب میں صرف دو لاکھ روپے خرچ ہوں گے۔ آج کل بیشتر افراد اس امر کو ترجیح دیتے ہیں''۔

پاکستان میں سورج کی تپش بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ماہرین زور دے کر کہتے ہیں کہ پاکستان میں سورج کی شعاع ریزی اور درجہ حرارت کا موازنہ جرمنی سے کیا جائے تو پاکستان میں شمسی پینلوں سے ۳۳ فیصد زیادہ بجلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ جرمنی نے رواں سال مئی میں اس ذریعے سے ۴۵ء۵ گیگا واٹس بجلی پیدا کی تھی، جب کہ ملک کی مجموعی طلب ۴۵ء۸ گیگا واٹ ہے۔

شمسی توانائی اپنانے کے حوالے سے ماہرین مشورہ دیتے ہیں کہ اپنے بجلی کے لوڈ کو ایل ای ڈی لائٹس اپنا کر کم کیا جائے جو بہت کم کرنٹ استعمال کرتے ہیں۔ ان کی زندگی بھی طویل ہوتی ہے، یہ مہنگے تو ہیں مگر طویل المعیاد عرصے کے حوالے سے کفایتی بھی ہوتے ہیں۔ اسی طرح انورٹر والے ریفریجریٹر، فریزر اور ائیر کنڈیشنر بھی مقبولیت حاصل کر رہے ہیں، گو ان کی قیمت عام مصنوعات کے مقابلے میں تیس ہزار روپے تک زیادہ ہو سکتی ہے۔ مارکیٹ میں توقع ہے کہ شمسی توانائی رفتہ رفتہ گھریلو صارفین کا انتخاب بن جائے گی۔ موجودہ حالات میں یہ شہریوں کے لیے لوڈ شیڈنگ سے نجات کا واحد ذریعہ ہے۔ ●●●

طبی مسکراہٹیں

ڈاکٹر نے ایک مریض کو نسخہ لکھ کر دیا اور کہا، ''اگر اس نسخے سے فائدہ ہو تو مجھے ضرور اطلاع کر دینا۔''

مریض: ''وہ کیوں؟''

ڈاکٹر: ''کیوں کہ مجھے بھی یہی تکلیف ہے۔''

☆☆☆

ڈاکٹر: تمہیں کوئی خاص شکایت نہیں، صرف آرام کی ضرورت ہے۔''

مریضہ: ''لیکن ڈاکٹر صاحب! ذرا میری زبان تو دیکھیے۔''

ڈاکٹر: ''ہاں، اس کو بھی آرام کی ضرورت ہے۔''

عباس کا شکریہ کہ اُس نے مزیریب (Muzayrib) قصبے کی جھیل دکھائی۔ یہ قصبے سے کوئی دس بارہ میل دور بڑا خوبصورت تفریحی مقام تھا۔ وہاں بڑی رونق تھی۔ سینکڑوں خاندان سیر و تفریح کرنے آئے ہوئے تھے۔

شُہب (Shihab) مزیریب سے چار کلومیٹر دور ہو گا۔ زرخیز، ہموار اور خوبصورت نظاروں سے مالا مال۔ گئے وقتوں کے ٹوٹے پھوٹے محل کی دیواریں، ستون دکھائی دیے۔ کہیں کمرے اور کوٹھریاں موجود تھیں۔ پتا چلا کہ مقامی حکومت نے آغا خان فاؤنڈیشن کے تعاون سے اِن اثاثوں کو محفوظ کرنے کا بندوبست کیا ہے۔ چلو شامی حکومت نے کچھ تو کیا، ہماری حکومت کو تو توفیق ہی نہیں کہ کبھی اپنی یادگاروں پر بھی نظر ڈال لیں۔ کبھی آل اولادوں کو دکھانے اور خود دیکھنے آئیں تو پتا چلے کہ ہمسایوں نے تاریخی در و دیوار کو گندگی کے ہار پہنا رکھے ہیں۔

عباس کی ایک بات نے مجھے بیتاب کر دیا۔ قریب ہی وہ جگہ ہے جہاں جنگ یرموک لڑی گئی تھی۔ اُن عظیم اور فیصلہ کن جنگوں میں سے ایک جنہوں نے مسلمانوں کو اِن خطوں کے نئے حکمران بنانے کے لیے مہریں ثبت کیں۔

اب کہیں ممکن تھا کہ جوش و اضطراب میں اضافہ نہ ہو اور اس مقام کو دیکھنے کی خواہش بپھر کر سر پر سوار نہ ہو جہاں عظیم سپہ سالار خالدؓ بن ولید نے تاریخ رقم کی تھی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سے عرب کا صحرا شروع ہوتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے تصویریں تھیں اُن شہسواروں، اُن جیالوں کی جو آندھی اور طوفان کی طرح اِن صحراؤں سے اُٹھے

بُصریٰ کی آغوش میں

سلمیٰ اعوان

شام کے ایک ہنستے بستے شہر کی سیر جسے تباہ کن خانہ جنگی نے کھنڈر میں بدل دیا

اور اِن جہانوں پر چھا گئے۔ سچی بات ہے دل رفیق بنا جذبات کی پھوار میں بھیگ رہا تھا۔ یوں بازنطینی بھی کچھ کم سورمانہ تھے مگر فطرت کے عروج وزوال کی حکمتیں ہمیشہ نئے انداز، نئے رنگ وآہنگ، نئے سُر وساز کے ساتھ دنیا کو ایک نئی صورت دینے کے لیے میدان میں اُتر رہی تھیں۔

بُصریٰ (Bosra) کے لیے اضطراب ہی نہ تھا، انتہائے شوق تھا کہ یہ بُصریٰ ہی تو تھا سرسبز ہرا بھرا، پانی کے چشموں اور کنوؤں والا کہ جہاں عرب کے تپتے صحراؤں کی بادِ سموم سے جلتی لوگوں کی آنکھیں، ان کے ہونٹ اور اندر یہاں آکر سیراب ہوتے تھے۔ تاہم عباس نے بُصریٰ کے متعلق وہ کہانی سنادی تھی کہ جس نے بچپن سامنے لاکھڑا کیا تھا۔ اب کانوں کا سائیں سائیں اور دل کا دھڑ دھڑ دھڑ کنا تو بنتا تھا نا اور وہ تھا کہ گائیڈوں کی طرح اِدھر اُدھر کی باتوں سے پاؤ بھر لسی کو رِڑک رِڑک کر اُس کا کجا بنانا چاہتا تھا۔

کیا کروں؟ سن لیا نا بھئی کہ بُصریٰ تاریخی لحاظ سے شام کے مشہور ترین شہروں میں سے ایک ہے۔ اب اِسے چھوڑیں۔ یہاں رومیوں اور یونانیوں کی یادگاریں ہیں اسے بھی ایک طرف رکھیں۔ اس کا رومن ایمفی تھیٹر دنیا کے بہترین شاہکار تھیٹروں میں سے ایک ہے۔ ٹھیک ہے بھئی ہوگا۔ دیکھیں گے اُسے بھی۔

اِن سب تاریخی حقائق سے قطعی انکار نہیں مگر میں کیا کروں؟ مجھے تو سب سے پہلے مبارک مسجد جانا ہے جہاں میرے اُس جان جگر شہزادے محمد ﷺ کی اُونٹنی شام کے سفر کے دوران بیٹھی تھی۔ تب حضور اکرم ﷺ صرف بارہ تیرہ سال کی عمر میں اپنے چچا کے ساتھ آئے تھے۔ اُس خانقاہ کو بھی دیکھنے کے لیے میں مری جارہی تھی۔

''تو بھئی لے چلو وہاں جہاں نبی کریم ﷺ کی مہرِ نبوت کی تصدیق نسطوری عیسائی پادری بحیریٰ نے کی تھی۔''

علی ظہر کی نماز پہلے ادا کرنے کا خواہش مند تھا۔ وہ قریب کی فاطمہ مسجد میں چلا گیا۔ مسجد کوئی بارہویں صدی کی تعمیر ہے۔ باہر سے مینار کی خوبصورتی نظروں کو لبھاتی ہے۔ کیتھیڈرل اور مسجد قریب قریب ہی ہیں۔ مسجد اور کیتھیڈرل دونوں بعد میں، پہلے وہاں جہاں میرا دل۔ بحیریٰ کی خانقاہ تک جانے کے لیے جتنے بھی قدم اُٹھائے اُن میں گنگناہٹ تھی۔ میری آنکھیں ہیں وہاں میرا دل ہے جہاں۔ دائیں ہاتھ بلند وبالا پتھروں کی بنی کہیں کہیں سے شکستہ سی مشرقی تعمیری نمونے کی حامل عمارت۔ بظاہر کچھ خاص خصوصیت، کچھ انفرادیت نظر نہیں آئی تھی مگر یہ بصریٰ کیا، شام کیا، دنیا بھر کے مسلمانوں اور عیسائیوں کے لیے بے حد تقدس والی جگہ تھی۔

بادی النظر میں عام سی مگر بے حد خاص سی۔ میرے تصور کی اڑانیں دور کہیں راستے کی لو برساتی دوپہر میں بادل کے ایک ٹکڑے کو اس بچے کے سر پر تنا دیکھتی تھیں۔ کہیں اُس درخت کی شاخوں میں پھنسی تھیں جس کی چھاؤں میں وہ سرخ وسفید بارہ سالہ لڑکا آکر بیٹھا تھا۔ جس کے لیے شاخیں جھک گئیں اور بادل کا ٹکڑا اس پر ٹھہر گیا تھا یوں چھاؤں گھنی ہوگئی تھی۔ سارے منظر ایک کے بعد ایک نگاہوں کے سامنے جیسے رقص کرتے تھے۔

یہ خانقاہ نسل در نسل راہبوں کے لیے مخصوص تھی۔ یہاں بے حد قدیم تحریری مخطوطات، پرانی دستاویزات، تورات اور زبور کے انتہائی قدیم نسخے موجود تھے۔ یہ انتہائی قیمتی مذہبی اثاثہ خود بخود ایک راہب کے مرنے کے بعد اس کے جانشین کی نگرانی میں چلا جاتا تھا۔ انہی قلمی نسخوں میں سے ایک میں عربوں میں ایک نبی کے مبعوث ہونے کا ذکر تھا۔ بحیریٰ اِس مخطوطے کا مطالعہ کر چکا تھا اور ورقہ بن نوفل کی طرح اُسے بھی یقین تھا کہ اُس نبی کی پیدائش اس کی زندگی میں ہی ہوگی۔

اُس دن جب عرب کا وہ ماہ کامل سفر میں تھا اور خانقاہ کا موجودہ راہب بحیریٰ اپنی خانقاہ سے باہر کھڑا دور سے آنے

والے قافلے کو دیکھتا تھا جو بس کسی لمحے میں خانقاہ کے پاس ہی پڑاؤ کرنے والا تھا۔ اُس نے تعجب سے بادل کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کو مسلسل ایک بچے اور ساتھ ایک معمر مرد پر سایہ فگن دیکھا۔ درخت کے نیچے بیٹھنے پر بادل کے ٹکڑے کا درخت پر ٹھہر جانا سب بحیریٰ کے لیے اُس کہانی کا عنوان بن رہا تھا جو اُس نے پڑھ رکھی تھی۔

''تو کیا اُس کا ظہور ہو چکا اور وہ قافلے میں موجود ہے؟'' بحیریٰ نے خود سے سوال کیا تھا۔

یہ بھی محض اتفاق ہی تھا کہ چند دن پہلے خانقاہ میں کھانے پینے کا بہت سا سامان آیا تھا۔ اُس نے قافلے کو پیغام بھیجا۔

''قریش کے لوگو، میں نے تمہارے لیے کھانے کا اہتمام کیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم میں سے ہر ایک اس دعوت میں شامل ہو۔''

قافلے والے دعوت میں آئے مگر اس بچے کو اونٹوں اور سامان کی نگرانی کے لیے پیچھے چھوڑ دیا۔ بحیریٰ نے آنے والے ہر شخص کو بہ نظرِ غائر دیکھا مگر کسی چہرے پر، کسی وجود میں اُسے وہ خاص خصوصیت نظر نہ آئی جو کسی معجزے کی اہل ٹھہرتی۔ اُس نے بلند آواز میں استفسار کیا۔ ''اے اہل قریش میں نے تم سب لوگوں کو مدعو کیا تھا۔ کیا سب لوگ آئے ہیں یا کوئی رہ گیا ہے؟''

''ہاں ایک بچہ جسے نگرانی کے لیے چھوڑ آئے ہیں۔'' مجمع میں سے کسی نے کہا۔

بحیریٰ فوراً بولا ''یہ تو قطعی مناسب نہیں۔ اُسے بھی لے کر آؤ۔ ہمارے ساتھ کھانے میں وہ بھی شامل ہو۔''

ایک آدمی گیا اور بچے کو لے کر آیا۔ بحیریٰ کی صرف ایک ہی نظر اُسے یہ یقین دلانے کو کافی تھی کہ جس معجزے کا اس نے مشاہدہ کیا تھا، وہ سو فی صد درست تھا۔ بچے کے چہرے پر نور کی لَو دمکتی تھی۔ کھانے کے دوران اس کی آنکھیں بچے کا توجہ سے جائزہ لیتی رہیں۔

اُس نے محسوس کیا تھا کہ بچے کے خدوخال اور اس کا جسم

بصریٰ کے رومن تھیٹر کا اندرونی حصہ

کتاب میں دیے گئے حلیے کے عین مطابق ہے۔ جب کھانے کا مرحلہ ختم ہوا تو راہب اٹھ کر اپنے سب سے کم عمر مہمان کے پاس جا بیٹھا اور چند سوال کیے۔ بچے کا جواب دینے کا انداز دل نشین تھا۔ شائستگی کے حُسن کا رچاؤ تھا اس میں۔ بولتے ہوئے لہجے میں متانت کا بھرپور تاثر نمایاں ہوتا تھا۔

دفعتاً راہب نے بچے کی عبا کاندھے سے اُتار کر پیٹھ دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ بچے نے کسی جھجک کا اظہار نہیں کیا کہ راہب ایک معزز اور برگزیدہ انسان تھا۔ گو راہب کو یقین ہو گیا تھا مگر وہ اپنے یقین کو محکم کرنا چاہتا تھا۔

شانے ننگے ہو گئے اور دونوں کاندھوں کے عین بیچ وہ نشان موجود تھا جسے وہ دیکھنے کا متمنی تھا۔ مہرِ نبوت چمک رہی تھی۔ کتاب کے مطابق اور عین اس مقام پر جس کا ذکر درج تھا۔ راہب ابوطالب کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ بچہ آپ کا کیا لگتا ہے؟

''میرا بیٹا ہے'' ابوطالب کا جواب تھا۔

''یہ تمہارا بیٹا نہیں ہے۔'' راہب نے بات کاٹ دی۔ ''اس بچے کا باپ زندہ ہو ہی نہیں سکتا۔''

''یہ میرے بھائی کا بیٹا ہے۔'' ابوطالب بولے۔

''اور باپ کب فوت ہوا؟'' راہب نے سوال کیا۔

''بچہ تو ابھی رحمِ مادر میں تھا۔''

بحیرٰی نے کہا۔ ''یہ بالکل سچ ہے۔ دیکھو میری تم سے درخواست ہے کہ اِس بچے کو اپنے ملک واپس لے جاؤ۔ اسے یہودیوں سے بچا کر رکھنا۔ خدائے عظیم و برتر کی قسم اگر وہ اسے دیکھ لیں اور یہ جان لیں جو میں نے جانا ہے تو اِسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اِس کے لیے قدرت نے اپنے خزانے میں بڑی عظمتیں سنبھال کر رکھی ہیں۔''

آسمان کو میری نظروں نے کس قدر محبوبیت سے دیکھا تھا۔ اندر سے شکر گزاری کا چھلکاؤ ہر ہر مو سے باہر آ رہا تھا۔ میں اس قابل کہ یہاں آتی؟ اسی کیفیت میں وقت گزرا۔

اب مبارک مسجد کی زیارت ہو جائے۔ اس کے ساتھ بھی خوبصورت دلکش کہانیاں اور روایتیں جڑی ہوئی ہیں۔ پہلی تو یہی ہے کہ اُونٹنی یہیں تو بیٹھی تھی۔ دوسری قرآن پاک کی پہلی تحریری کاپی سب سے پہلے یہاں بُصریٰ لائی گئی۔

میرے لیے دونوں اہم جگہیں تھیں۔ بڑے بڑے پتھروں والی خوبصورت مسجد تھی۔ اُس کے طاق پر جو تحریر ہے اِسی بنا پر اِسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کہا جاتا ہے۔ نماز پڑھی۔ نفل پڑھے۔ مشکور ہوئی۔ دعا مانگی۔

تو پھر طے ہوا کہ کھانا رومن تھیٹر دیکھنے کے بعد کھایا جائے۔ سچی بات ہے بھئی یہ رومن تھیٹر بھی دیکھنے کی چیز تھی۔ تھیٹر کے عین سامنے جامع مسجد ابوبکر ہے۔ عباس نے بتایا تھا کہ اِس علاقے کے لوگ جمعہ پڑھنے کے لیے مسجد ابوبکر آتے ہیں۔ خواہ وہ مسلکی اعتبار سے کسی بھی فرقے سے تعلق رکھتے ہوں۔

''ارے کتنی اچھی بات ہے۔ کاش ہماری مسجدوں میں بھی یہ چلن رواج پائے۔''

داخلہ بذریعہ ٹکٹ پندرہ لیرا فی کس تھا۔ گائیڈ بھی دائیں بائیں اپنی خدمات پیش کر رہے تھے مگر ہمارے ساتھ عباس تھا۔ تیسری صدی کا یہ تھیٹر دنیا کی واحد ایسی عمارت ہے جو مکمل طور پر محفوظ ہے اور اپنی شان بان سے قائم بھی۔ بڑی بات ہے بھئی۔ سچ تو یہ تھا کہ اندر داخل ہوتے ہی اس کی ہیبت اور عظمت کا احساس رگ و پے میں دوڑنے لگتا ہے۔ پندرہ ہزار لوگوں کی دل پشوری اور تفریح کا مرکز جس کی نشستیں تین چوتھائی سرکل میں کتنی کہانیاں سناتی، کتنی تصویریں دکھاتی ہیں۔ انسان کھیل تماشوں کا ازلی شوقین۔ اپنے شوق کی تکمیل کے لیے کیا کیا عجوبے بناڈالتا ہے؟

ڈھلانی عمودی رخ پر پھیلی یہ نشستیں جن پر بیٹھے لوگ اس سٹیج پر کیا کیا منظر دیکھتے ہوں گے۔ ہائے ہنسانے، رلانے والے۔ نمایاں تعمیری خوبی کہ صرف دس منٹ میں پندرہ ہزار

لوگوں سے بھرا پُرا تھیٹر خالی ہو جائے کہ بے شمار داخلی اور خارجی دروازے مختلف لیول پر یوں بنائے گئے ہیں کہ نہ رش نہ کہیں بھگدڑ مچنے کا خوف۔ یوں ہوا کی طرح داخل ہوں اور بگولے کی مانند نکل جائیں۔

اس کے مختلف حصّے ایک ترتیب اور موزونیت سے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ اداکاروں کی اداکاری، مکالموں کی ادائیگی، آوازوں کا اُتار چڑھاؤ

مشہور مسجد عمر رضی اللہ عنہ

گلوکاروں، موسیقاروں اور سازندوں کی آوازیں، اور دھنیں ان سمتوں سے ہر جگہ اوپر، نیچے، قریب، دور بیٹھے ہوئے لوگوں کا دیکھنا سننا اور اُس سے محظوظ ہونا سب اِس طرزِ تعمیر کی فنکارانہ کاریگری کا مرہون منت تھا۔ اس کے ذہین اور قابل معماروں نے تھیٹر کو ان زاویوں کے پیشِ نظر وہ شکل اور آرکسٹرا کی جگہ کو وہ خاص گہرائی دی کہ آج کے جدید دور کے ماہرین فن حیرت زدہ یقیناً سوچتے اور خود سے کہتے ہوں گے کہ انسان وقت کے ہر دور میں بہترین ذہانت اور فطانت کے جوہروں سے ہمیشہ لبریز رہا ہے۔

بغیر دروازوں کے خالی کمرے آواز کو گونج دار بنانے کے لیے تعمیر ہوئے تاکہ ہر جگہ پر بیٹھے لوگوں کو آواز سنائی دے۔ عباس نے سکے گرا کر اور تالی بجا کر یہ تماشا ہمیں دکھایا۔

سٹیج کے اطراف میں بالکونیاں معززین اور شاہی خاندان کے لیے درجہ بدرجہ تھیں۔ انسان کی ذات ہمیشہ حد بندیوں کی گھمن گھیریوں میں الجھتی رہی۔ موت اور مقبروں میں بھی تخصیص کرتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مٹی کبھی فرق نہیں کرتی۔

صحن کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے اس کے صحن سے نہر کو گزارا گیا۔ یہ گویا اُس وقت کا بہترین ایئر کنڈیشنگ سسٹم تھا۔ روایت اور چلن کے مطابق زمانے کے مدوجزر نے اسے بھی متاثر کیا۔ صلاح الدین ایوبی نے جب شہر فتح کیا تو اس میں تبدیلیاں ہوئیں۔ اونچی اونچی مدافعتی دیواروں اور خوبصورت میناروں نے اِسے عیسائی قلعے کی سی صورت دے دی۔ یوں یہ مشترکہ ثقافتی ورثہ بن گیا۔ میوزیم بھی یہاں تھا۔ تاہم بھوک ستا رہی تھی۔

مسجد عمر رضی اللہ عنہ کو بھی دیکھا۔ بُصریٰ کی پہلی مسجد کہ بُصریٰ کے لوگ اِسے نئی دلہن کی مسجد کہتے ہیں۔ جو بھی وہ کہیں بجا کہ بُصریٰ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں ہی تو فتح ہوا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ تھکے ہونے کے باوجود بصریٰ کی گلیوں میں پھرنا پُرلطف کام تھا۔ قدامتوں کو سینے سے لگائے وہ بتاتی تھیں کہ اُن پرانے بوڑھے دنوں میں یہاں زندگی گزرانا کیسا خوبصورت تجربہ تھا۔ میرے لیے بھی اِن دنوں کے تصور میں چند لمحے گزارنا مزے کا کام تھا گو تھیٹر کے اونچے نیچے راستوں نے ہڈی جوڑ ہلا کر رکھ دیے تھے۔

شہر بھی اُن سب حکمرانوں کی فتوحات اور شہر پر اُن کے کہیں خستہ حال اور کہیں بہتر نشانوں کے ساتھ ترجمانی کرتا تھا۔ نباطین (Nabatean) کا بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا

تھا۔ آسمان کو چھوتی گول میناروں پر مکی بُصریٰ کے اولڈ کوارٹر میں گھومتے پھرتے ہوئے احساس ہوا تھا کہ زندگی کے ہنگامے اور مسرتوں کا حصول اُن زمانوں میں جیسے شہری دروازوں پر تھا۔ گلیاں، بازار اور شہر جس منظم انداز کی تصویر پیش کرتے تھے وہ بتاتے تھے کہ ضروریات زندگی کی فراہمی غالباً حکمرانوں کی پہلی اہم ترجیح تھی۔ صدیوں قبل کے حکمران اور اِس جدید دور کے ہمارے حکمران۔ ذہن موازنے کرتا تھا۔ دل جلاتا اور بندہ اپنی کم مائیگی پر کڑھتا تھا اور وہ کڑھ رہی تھی۔

مزید کچھ دیکھنے پر اب طبیعت مائل نہ تھی۔ دراصل عباس نے چھوٹی چھوٹی جگہوں کو دیکھنے میں تھکا ڈالا تھا۔ اب سویدا (Suweida) دیکھنے پر اصرار تھا۔ ''ہمت کریں۔ انگوروں کا گھر ہے۔ بیلوں کا حُسن ہر سو پھیلا ہوا ملے گا'' اور ہماری واپسی اِسی راستے سے ہونی ہے۔ یہ نسبتاً چھوٹا راستہ ہے۔ بُصریٰ اور سویدا کے درمیان کوئی تیس کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔ بس آدھ گھنٹے میں وہاں پہنچ جائیں گے۔

اب جب اتنا محبت بھرا اصرار ہو تو بات ماننی پڑتی ہے۔ سر جھکانا پڑتا ہے خواہ آپ کی ہڈیوں کے پائے ہی کیوں نہ پکے ہوئے ہوں۔ اب سچ تو یہی تھا کہ ایک بات بہت کھلی تھی۔ لوگوں کے ذاتی گھر حد درجہ شاندار نظر آئے۔ اندر کا حال رب جانتا ہے مگر ظاہراً اُن کے چہروں مہروں کا حُسن و جمال صدیوں پُرانے شکستہ دم محل باڑیوں کے کالموں اور منقش پتھروں سے سجے لشکارے مارتے جاتے تھے۔ کہیں ان کی بالکونیوں میں کھڑی کوئی دلکش سی عورت۔ کوئی جوان، کوئی بوڑھی، کوئی مرد نظر آتا تو منظر جیسے قلب و روح کو تازہ دم کر دیتا تھا۔ یہ کہیں مال غنیمت سے تو نہیں آراستہ پیراستہ ہیں اور پھر جہاں قہوہ پینے کے لیے رُکے۔ اس کی تصدیق اِس کافی شاپ کے مالک نے بھی کر دی۔

علی اور فاطمہ کو میوزیم دیکھنے کی آخر آئی ہوئی تھی۔ میری طرح نسرین بھی انکاری تھی۔ چلو ہم یہاں کیفے میں بیٹھتے

شہر کے مرکز میں سلطان پاشا ال عطرش کا مجسمہ

ہیں۔ تم لوگ جاؤ مگر عباس انہیں وہاں اُتار کر ہمارے پاس آ گیا تھا اور اب ہم گاڑی میں بیٹھے بیٹھے شہر کے ہوائی بوسے لے رہے تھے۔ بازار دیکھا۔ آرٹ کی دکانوں میں گئے۔ کیا شاہکار دیواروں پر آویزاں تھے۔ پورا شہر تو یہیں نظر آتا تھا۔ شہر کا کلچر بھی سجا ہوا تھا۔ رقص و موسیقی کے منظر پینٹ تھے۔ دولہا دلہن بھی نظر آ گئے تھے۔ شادی کے چند مناظر نے بھی شاد کیا۔

چھٹی صدی کے لیسر (Lesser) چرچ کے پاس ہی وہ شہرہ آفاق محراب تھی کہ جس کے بغیر شہر ادھورا ہے۔ دردناک سی کہانی بھی سُننے کو ملی کہ پندرھویں صدی کے شہنشاہ تمیرین نے شہر کے معززین کو اس محراب کو پھانسی گھاٹ بنا کر پر چڑھایا تھا۔ سو تب سے یہ پھانسی گھاٹ کے نام سے مشہور ہے۔

شہر کے مرکز میں سلطان پاشا ال عطرش کا مجسمہ دیکھا۔ فرانسیسی غلبے کے خلاف جدوجہد کا ہیرو پاشا ال عطرش۔ جی ٹھنڈا ہوا۔ سیلوٹ مارا۔ کوئی دو گھنٹے بعد ہم لوگوں نے جوڑے کو میوزیم سے پک کیا۔ علی سے میوزیم کا احوال سنتے ہوئے میں نے عباس سے کہا:

''میاں سیدھے سیدھے چلو۔ جی چاہتا ہے یہیں کہیں لم لیٹ ہو جائیں۔ تمہاری محبتوں نے چور چور کر دیا ہے۔''

سیاہ، سبز اور سُرخ انگوروں کے چھابے بھرے ہوئے دکانوں میں سجے دعوت دیتے تھے۔ ایک کلو خریدے۔ یہ تو باتیں امن والے دنوں کی تھیں۔ ہاں جب میں نے عبداللہ ال جازر سے ای میل رابطہ کیا۔ انہوں نے جو شہر کی تصویر کشی کی اس کی ایک جھلک بھی دیکھ لیجئے۔

بصریٰ پر فری سیرئین آرمی کا بڑا سخت کنٹرول تھا۔ پر امن سا شہر اُسے تو ایسے ہی حکومت نے رگیدنے کی کوشش کی۔ بات کچھ بھی نہ تھی۔ درعا ہمسائے میں تھا۔ اس کی گڑبڑ کا لامحالہ اثر تو ہونا تھا۔ ایک فطری امر ہے کہ یہاں وہاں کھڑے لوگوں نے ہمسایہ شہر میں ہونے والے حادثے پر دکھ اور افسوس کا اظہار تو کرنا ہی تھا۔ تشویش اور دکھ بھرے جذبات کا ردِعمل بھی فطری تھا۔ چور کی ڈاڑھی میں تنکا جیسی بات ہوئی۔ سیکورٹی فورسز نے گولی چلا دی اور چار لوگ مر گئے۔ صورت کشیدہ ہو گئی۔ چھوٹی موٹی جھڑپوں نے بتدریج حالات کو بگاڑنے میں کردار ادا کیا۔

مارچ ۲۰۱۵ء جیسے طوفان کی سی صورت میں اِس تاریخی شہر پر نازل ہوا۔ پرانے شہر میں باغیوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی مگر حکومتی فوج نے ائیر فورس کے ذریعے ہوائی حملے کیے اور بیرل بموں کی یلغار برسائی گئی۔ مار با اسپتال پر راکٹ فائر ہوئے۔ یہاں زخمی باغیوں کا علاج ہو رہا تھا۔ اسپتال تو ملبے کا ڈھیر بن گیا اور زخمی بیمار، بچے، بوڑھے سب قیمہ بن گئے تھے۔

۲۹ مارچ کو مقامی سطح پر بڑی جھڑپیں دو بڑے گروپوں میں ہوئیں، یہ اسلامی muthunna اور ال سُنّی Al Sunnah Lions Brigade کے درمیان تھیں جو ان ہتھیاروں اور ایمونیشن کی تقسیم سے متعلق تھیں جو بصریٰ سے انہیں ملا تھا۔ ایک کارکن قتل ہو گیا۔ دوسری طرف کے بھی لوگ مارے گئے۔ شہر ایسے لڑائی جھگڑوں کا عادی نہیں تھا۔ بہت افسردگی طاری ہے اس پر۔ بہرحال اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم کرے۔ ◆◆◆

عمل

لفظ کسی بھی تعلق یا رشتے میں بہت اہم ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی بڑے بڑے لفظ بھی بے جان ہو کر کھوکھلے ہو کے رہ جاتے ہیں اور ایک چھوٹا سا عمل بہت جاندار اور مؤثر ثابت ہوتا ہے۔

زہریلا ڈنک

ایک بدلحاظ روح کا قصۂ عبرت

وہ ملنے جلنے والوں کے لیے وبالِ جاں بن گئی تھی

مہ جبین تاج درانی

''یہ تو گیا۔'' کانٹے دار ہاتھوں کو مسلتے ہوئے میں خوب پچھتایا۔ ''میں یہاں سے گیا ہی کیوں تھا؟؟؟'' کھڑکی پہ کھڑا میں خود کو کوس رہا تھا۔

اگر میں یہیں پہرہ دیتا، جیسے کہ پچھلے تین دن سے دے رہا تھا تو یہ بے قصور بے موت نہ مارا جاتا۔ طبعی موت مرنے والوں کا ''اتنا'' غم نہیں ہوتا، اپنی غلطی سے مرنے والے میرے نزدیک خودکشی کرتے ہیں مگر حادثاتی موت کا شکار ہونے والوں کا غم ہوتا ہے اور بے حد۔ یہ الگ بات ہے کہ اس حادثاتی موت سے بھی اپنی نسل کے کئی زندوں کو نہیں بچا پایا۔ ان میں سے کچھ نے میری بات کو مذاق میں اڑا دیا۔ کچھ یہ سمجھے کہ میں اپنے ذاتی فائدے کے لیے ان کو روک رہا ہوں، گمراہ کر رہا ہوں۔ وہ مجھے اپنا پیدائشی دشمن تصور کرنے لگے۔ سمجھتے تھے کہ میں انہیں بھوکوں مارنا چاہتا ہوں۔

اور میں...... اپنے دن رات کا آرام تج دینے اور پہرہ دے دے کر ہلکان ہونے کے باوجود اپنی نسل کے کئی زندوں کو تڑپ تڑپ کر جان دیتے دیکھ چکا ہوں۔ مزید گنوانے کی ہمت نہیں۔ اسی لیے پچھلے ڈیڑھ ماہ سے اپنی فطرت کے برخلاف اس جھگی کی کسی کھڑکی، روشن دان یا جھروکے پر سخت پہرہ دینے کی کوشش میں ہلکان ہوا جاتا ہوں۔

بھوک مٹانے کے کئی ذرائع ہونے سے مجھے بھوکا مرنے کا ڈر نہیں۔ ڈر ہے تو اپنی قوم کے ختم ہو جانے کا شاید اسی لیے قدرت نے مجھے لمبی حیاتی عطا کی ہے کہ عبرت پکڑوں اور دوسروں تک پیغام پہنچاؤں مگر ایک یہ ہیں...... احمق، نادان، کم عقل، جاہل کہ سمجھتے ہی نہیں۔ میں نے کسی انسان سے سنا تھا کہ مچھروں کی اوسط عمر ایک ہفتہ یا زیادہ سے زیادہ دو ہفتے ہوتی ہے۔ میری اتنی طویل کیوں ہے؟؟ شاید دوسروں کی جان بچانے کے لیے۔

جی ہاں! ٹھیک پہچانا' میں ایک مچھر ہوں۔ نہ نہ...... مجھ سے ڈریے نہیں، مجھ میں ڈینگی، ملیریا کے جراثیم نہیں۔ میں تو اور ڈیڑھ ماہ کی طویل زندگی پا کر بوڑھا ہونے لگا ہوں مگر حقیقت پا چکا کہ مجھے دوسروں کی زندگی بچانے کے لیے یہاں مامور کیا گیا ہے۔ جو کچھ میں نے دیکھا، سمجھا دوسروں کو بتانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ اگر کم حیاتی پاتا تو کبھی نہ سمجھ پاتا۔

''اری او...... اتنا سالن اپنی تھالی میں بھر لیا۔ کیا تیرا مردہ شوہر کما کر لاتا ہے۔'' نجمہ کی تیز آواز مجھے سخت بری لگتی ہے کیونکہ میرے خیالات کا تسلسل اسی کی وجہ سے ٹوٹتا ہے۔ اس کی کرخت آواز مسلسل آ رہی ہے۔

میں آنکھیں بند کر کے بھی بتا سکتا ہوں کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ نجمہ اپنی بیوہ نند کی کھانے کی پلیٹ پر کڑی نگاہ رکھے اول فول بکے جا رہی ہے۔ بیوہ نند خاموشی سے کھانا چھوڑ کسی کونے میں دبکی سسکیاں لے رہی ہو گی کہ اس سے مرحوم شوہر کی شان میں نجمہ کی زبانی قصیدے سنے نہیں جاتے۔ اس نامی مخلوق نے نہ صرف اپنے گھر والوں کی بلکہ میری زندگی بھی اجیرن کر رکھی ہے۔ اوہو! یہ...... عورت پھر چیخ رہی ہے۔ ''کب مرے گی تو بڑھیا؟؟ کب تک میرے شوہر کے پیسوں سے ڈاکٹر، حکیموں کی جیبیں بھرنے کے لیے بستر پر پڑی رہے گی؟''

ایسا پہلی بار نہیں ہوا۔ میری سوچ کے دھارے کا رُخ ڈیڑھ ماہ کی طویل زندگی میں بار بار اس عورت کی کرخت، پاٹ دار، گالیوں بھری زہریلی زبان نے موڑا ہے۔ جھگی کے سرکنڈوں کے بیچ سے میں دیکھ سکتا ہوں' نجمہ کی نند اپنی ماں کو کھانا دے رہی ہے۔ اس بدزبان کی زبان مسلسل زہر اگلے جا رہی ہے۔

ہاں! تو میں بتا رہا تھا کہ...... ایک منٹ ٹھہریئے گا۔ جھگی کے باہر گندے پانی پر بیٹھا مچھر اب جھگی کے اندر جانے کے لیے ''پرواز'' کر رہا ہے۔ مجھے اسے روکنا ہے۔ واپس آ کر باقی باتیں کرتا ہوں۔

''اے! اے! ٹھہرو۔''

''کیا ہے؟'' یہ مچھر ابھی بچہ تھا۔ ایک دو دن میں جوان ہو جاتا' انسانوں کا خون چوس چوس کر۔

''بیٹا! اس جھگی میں نہ جاؤ۔ یہاں خطرہ ہے۔ تم آس پاس کی کسی دوسری جھگی میں چلے جاؤ۔ بہت انسان ہیں یہاں۔ ایک ایک جھگی میں دس دس لوگ جی رہے ہیں۔''

''کیوں بڑے میاں؟ اس موٹی (نجمہ کی طرف اشارہ کر کے) تازہ تازہ، میٹھے، سرخ خون پر صرف تمہارا ہی حق ہے؟'' وہ جھگی کے سرکنڈوں کے بیچ سے نظر آتی نجمہ کو للچائی نظروں سے دیکھتا طنزاً بولا۔ ''بڑے میاں! ہم طفیلی ہیں' دوسروں کی زندگی پر انحصار کرنے والے۔ خطرہ تو ہر جگہ ہے۔ یہاں بھی وہاں بھی۔'' یہ کہہ کر گویا میرا مذاق اڑاتا نجمہ کی پنڈلی پر جا بیٹھا۔

''صرف تُو ہی طفیلی نہیں احمق! میں بھی ہوں۔ نجمہ کی نند اور ساس بھی ہیں۔ بس سمجھنے کی بات ہے۔ نجمہ جیسے لوگوں کو بار بار احساس دلانے کی بات ہے۔'' میں شدید صدمے کے زیرِ اثر پھر سوچ میں غرق ہو گیا کیونکہ اس روئے زمین پر

صرف میں ہی وہ واحد جاندار ہوں جو جانتا ہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔

جب تک نجمہ نے ''سی.....'' کر کے پنڈلی پر ہاتھ نہ پھیرا وہ مزے سے بیٹھا خون چوستا رہا۔ جانے کیوں مجھے لگا کہ واپسی پر وہ جان بوجھ کر میرے قریب آ کر بیٹھا۔ وہ میری طرف ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو ''بڈھے میں تیری باتوں میں آنے والا نہیں۔ آنکھوں کی زبان سے سنی جانے والی بات نظر انداز کیے میں انتظار میں بیٹھا رہا' قضا کے انتظار میں۔''

آخر میرا انتظار ختم ہوا کیونکہ اسے الٹیاں شروع ہو چکی تھیں۔ ''اوخ.....اوخ.....'' وہ الٹیاں کرتے دہرا ہوا جا رہا تھا۔ الٹیاں کرتے کرتے اس نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔ ''اسی لیے تمہیں اس جھگی میں جانے سے منع کر رہا تھا برخوردار!'' اتنا کہہ کر میں خاموش ہو گیا کیونکہ اب جان کر وہ کرتا بھی کیا؟ اس کا آخری وقت آ پہنچا تھا۔ ایک زوردار جھٹکا کھا کر اس کا مردہ وجود نیچے گندے پانی میں جا گرا۔

ڈیڑھ ماہ سے یہی مناظر دیکھتے دیکھتے تھک گیا ہوں۔ جو بھی مچھر نجمہ کا خون چوستا ہے' الٹیاں کرتے کتے کی موت مرجاتا ہے۔ حد تو یہ کہ اس اُلٹی پر بیٹھنے والی مکھیاں بھی موت کے منہ میں چلی جاتیں۔ جانے کیا تھا اس عورت کے خون میں؟؟

میں نے ٹھان لی ہے اگر اب کسی مچھر نے جھگی میں داخل ہونے کی کوشش کی تو یا وہ نہیں یا میں نہیں۔ دو دو ہاتھ کرنے کا پکا ارادہ ہے۔ نجمہ کی نند چولہے کے پاس بیٹھی کچھ پکا رہی ہے۔ ساس چارپائی پر پڑی کروٹ بدلنے کی کوشش میں کئی مرتبہ بائیں طرف لڑھک چکی۔ وہ فسادن جھگی کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھی ریڈیو پر فلمی گانوں پر سر دھنتی، پان بنا بنا کر کھا رہی ہے۔ اس کا اور کام ہی کیا تھا' سوائے آرام کرنے، پان کھانے، ریڈیو سننے، دوسروں کے معمولات پر نگاہ رکھنے کے ساتھ ساتھ بدزبانی کرنے کے۔ جھگی کے دروازے سے ایک لڑکی نے جھانکا۔ اس کو بھی میں پہچانتا ہوں۔ سامنے والی جھگی میں اپنے ماں باپ اور آٹھ عدد بہن بھائیوں کے ساتھ کسمپرسی کی زندگی گزار رہی تھی۔

''نجمہ خالہ تھوڑا سا نمک ملے گا۔ ختم ہو گیا ہے۔'' معمولی سا جملہ، معمولی سی چیز مگر وہ تو یوں پھٹی جیسے اس سے قارون کا خزانہ پورے کا پورا مانگ لیا گیا ہو۔

''یہاں نمک کی کانیں نہیں نکلی پڑیں جو ہر کوئی منہ اٹھائے مانگنے چلا آتا ہے۔''

''غلطی ہوئی جو یہاں چلی آئی۔ بلّو خالہ کے گھر چلی جاتی تو کم از کم بے عزتی تو نہ ہوتی''۔ جواباً وہ بھی چمکی۔

''کیسے برداشت کرتی ہو اس نک چڑھی بہو کو نانی؟ جاتے جاتے وہ فاقہ زدہ لڑکی نجمہ کو آگ لگا گئی۔

''ارے یہ کیا برداشت کریں گی مجھے۔ الٹا میں برداشت کر رہی ہوں ان جونکوں کو۔ میرے اور شوہر کے جان مال کے ساتھ چمٹی جونکیں۔'' وہ شروع ہو چکی تھی اور میرا پہرہ سخت ہو گیا۔

اس کے شوہر کی واپسی کے بعد کیا ہوگا' یہ بھی مجھے اچھی طرح علم ہے۔ رات کو تھکا ہارا شوہر آیا تو دو جھگیوں کے بیچ بنے راستے سے اپنی جھگی میں چلی جائے گی۔ شوہر سے اپنی بے ضرر ساس اور نند کے خلاف وہ وہ شکایتیں لگائے گی، بہتان باندھے گی کہ الامان! پھر صبح اس کا شوہر ماں بہن سے منہ پھلائے رکھے گا اور یہ سینہ' کسی فاتح سومو پہلوان کی طرح۔

میری کوفت اور فکر میں ہر گزرتے دن اضافہ ہو رہا ہے۔ جلد از جلد یہ زندگی ختم ہو اور اس پہرے داری سے میری جان چھوٹے۔ رات میں میری ڈیوٹی زیادہ سخت اور مشکل ہو جاتی ہے۔ میری قوم رات کو جونکلنا پسند کرتی ہے۔ ان جھگیوں میں مچھروں کی آمد و رفت ویسے بھی آسان تھی۔ جھگی میں لگے سرکنڈوں کے بیچ درزسی بن جاتی ہے جو مچھروں کی راہ میں

رکاوٹ نہیں بنتی۔ جھگی کا ایک بار پھر جائزہ لینے کے بعد میں ریڈیو سے نکلنے والے گانوں اور میاں بیوی کی کھسر پھسر باآسانی سن سکتا تھا۔ رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ سونے سے پہلے نجمہ نے ہاتھ مار کر ریڈیو کا بٹن بند کیا اور کروٹ بدل لی۔ اس کے ہلکے ہلکے خراٹے جھگی میں گونجنے لگے۔

''یہ کیا ہے؟'' میری بوڑھی، نیند سے بوجھل ہوتی آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔ تیزی سے حرکت کرتی رسی نما چیز نجمہ کی چارپائی پر چڑھ رہی تھی۔ ''اف میرے اللہ! یہ تو سانپ ہے۔ یقیناً کسی درز سے گھسا ہے''۔ ایسے حشرات کا اس گندی کچی بستی میں نکلنا انوکھی بات نہیں مگر سوتے ہوئے کسی کو کوئی موذی ڈس لے تو پھر اس کا بچنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ جب تک نیند پوری کر کے صبح اٹھنے کا وقت آتا ہے' زہر پورے بدن میں سرایت کر جانے سے انسان سویا ہی رہ جاتا ہے' کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔

''کیا کروں؟ کیا کروں؟'' میرے پاس سوچنے کا وقت بھی نہیں۔ میں نے نجمہ کے شوہر کی ہتھیلی پر بیٹھ کر پوری قوت سے اپنے ڈنک گاڑ دیے۔ وہ ڈھیٹ ہاتھ ہلا کر کروٹ بدل گیا۔ نجمہ کو کاٹنے کی غلطی میں نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسے نجمہ کے پیروں کے پاس دیکھا۔ اس نے کروٹ لی تو لہرا کر لمحہ بھر میں اس کی موٹی پنڈلی پر ڈس لیا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ صبح مجھے دیکھنا تھا کہ ساس نند کا اس کی موت پر کیا ردِعمل ہوتا ہے۔ آج میں بے فکری کی نیند سو سکتا تھا' کئی ہفتوں بعد۔ میٹھی پیاری نیند کو ترسی آنکھیں جلد ہی بند ہو گئیں۔

صبح میری آنکھ نجمہ کے ریڈیو کی آواز سے کھلی۔ اسے چارپائی پر بیٹھا دیکھ کر حیرت کے شدید جھٹکے کے باعث سرکنڈے سے گرتے گرتے بچا۔

''دیکھو تو! مچھروں نے کیسا کاٹا ہے۔ ان منحوس ڈینگی مچھروں نے جینا حرام کر رکھا ہے۔'' وہ بولی۔

''ہم ہم.....ہم؟؟؟ منحوس؟؟؟'' میں صدمے سے مرنے کو تھا۔ ڈرتے ڈرتے اڑ کر اس کے شوہر کے کندھے پر جا بیٹھا۔ بڑی مشکل سے منہ سے برآمد ہونے والی چیخ نما بھنبھناہٹ کو روکا۔ اس کے پیر پر کسی مچھر نہیں سانپ کے کاٹے کے نشان تھے۔ چارپائی کے نیچے اردگرد میرے بہت سے بھائی بند مرے پڑے تھے۔ وہ یقیناً میرے سونے کے بعد اندر آئے تھے۔ میں نے خود کو کبھی اتنا مایوس نہیں پایا تھا۔ دوسرا جھٹکا بھی میرا منتظر تھا۔ کب تک اس کے شوہر کے کندھے پر بیٹھا رہتا۔ اڑ کر واپس اپنے اڈے پر آ گیا جہاں مچھروں کو اندر آنے سے روکنے کے لیے پہرہ دیتا تھا۔

''یہ کیا؟'' میں نے آنکھیں مسلیں۔ اڑ کر قریب گیا۔ ابھی میری آنکھیں اتنی بھی کمزور نہیں ہوئی تھیں کہ رات نجمہ کو ڈسنے والے سانپ کے مردہ جسم کو نہ پہچان پاتا۔ ''اف.....'' اڑ کر واپس اندر آیا تو نجمہ اپنا پسندیدہ کام کر رہی تھی' ریڈیو چینل سیٹ کرنے کا کام۔ ایک چینل پر وہ کچھ دیر رکی۔ کوئی عالمِ دین حدیث مبارکہ سنا رہا تھا:

رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن مومن کے میزان میں حسنِ خلق سے زیادہ بھاری چیز کوئی نہ ہوگی اور بے شک اللہ تعالیٰ فحش گو اور بیہودہ بکنے والے سے دشمنی (نفرت) کرتا ہے۔'' (ترمذی)

طویل زندگی گزارنے کے بعد اس حدیث کا مفہوم آج سمجھ پایا ہوں' (روز نجمہ کے ریڈیو سے سننے کے باوجود) ہم اپنے منہ یا ڈنک سے خون چوستے ہیں۔ ڈینگی، ملیریا وغیرہ کا زہر انسانی جسم میں منتقل کرتے ہیں۔ سانپ بھی منہ سے ہی ڈستا ہے اور..... اور انسان بھی! آج میں نجمہ اور اس جیسے انسانوں کے زہر سے اللہ کی پناہ مانگ رہا ہوں۔ جو اپنی زبان سے اپنے ہی جسم کے خون کو نیلا تھوتھا کر چکے۔ اللہ جانے خوش خلقی جیسی قیمتی چیز کی اہمیت انسان کب سمجھیں گے؟

اردو ہے جس کا نام

قومی زبان سے ناآشنائی نسل کا المیہ اُجاگر کرتا نشتر پارہ

رفیق سجاد

وہ ایم اے کرنے کے بعد دفتر میں انٹرن شپ کرنے آیا تھا۔ نوجوان کی تعلیمی اسناد دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک عمدہ طالب علم رہا ہے۔ اس کی ڈیوٹی میرے ساتھ لگائی گئی۔ میں نے تعارف کی غرض سے پوچھا ''اسم گرامی کیا ہے حضور کا؟''

اس نے سن تو لیا لیکن توجہ نہ دی۔ میں نے کام جاری رکھا اور تھوڑی دیر بعد پھر پوچھ لیا ''جناب والا! اسم گرامی تو ارشاد فرمایئے۔''

اس نے پھر کوئی جواب نہ دیا بلکہ تیور دیکھ کے اندازہ ہوتا تھا کہ شاید اس نے بات سنی ہی نہیں۔ مجھے غصہ آیا لیکن ضبط کر گیا۔

تھوڑی دیر بعد کام روک کے میں پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوا' باقاعدہ ہاتھ ملایا اور پھر کہا ''اجی حضور! اپنا اسم گرامی تو ارشاد فرمایئے' کیا ہے؟''

یہ سن کر اس کے چہرے پہ حیرت کے ایسے آثار نظر آئے کہ گویا میں نے کسی دور افتادہ افریقی قبیلے کے سردار کا شجرہ نسب پوچھ لیا ہو۔

آخر اس کے منہ سے نکلا ''سر! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ مجھے سمجھ نہیں آ رہی۔ آسان لفظوں میں کہہ دیں، کیا کہنا ہے؟''

یہ سن کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ایک ایسا نوجوان جو اعلیٰ تعلیمی مدارج طے کر چکا ہے' جس نے بی اے میں اردو ئے معلیٰ (اردو ایڈوانس) پڑھ رکھی ہے اور پنجم سے لے کر ایم اے تک اس کے تعلیمی نتائج میں کہیں بھی ۷۰ فیصد سے کم نمبر نہیں۔ وہ اسم گرامی کے معنی نہیں جانتا۔

جب اس کو بتایا کہ بھائی میں آپ کا نام پوچھ رہا ہوں تو بجائے شرمندہ ہونے کے اس نے کہا ''تو اس طرح کہو نا، آپ تو پتا نہیں کیا کیا کہہ رہے ہو۔''

میں حیرانی سے اُسے تکتا رہ گیا۔ یہ کوئی پہلا انوکھا واقعہ نہیں، اس قسم کے سینکڑوں واقعات صاحبان علم کے ذہنوں میں محفوظ ہوں گے۔ اپنی زبان سے بے رغبتی، بولنے میں احساس کمتری کا شکار ہونا اور اس کے قواعد سے بے بہرہ ہونا آج طلبہ کے لیے قابل توجہ معاملہ ہی نہیں۔

ایم اے معاشیات کی ڈگری کا حامل ایک جوان دفتر میں عرصہ دراز سے ڈرافٹ (خطوط اور رپورٹیں) بنانے کے کام پر مامور ہے۔ ایک دن اس نے راقم سے اردو محاورے ''درخور اعتنا'' کا تلفظ اور مطلب پوچھا۔ راقم نے الٹا اس سے سوال کر دیا کہ کیا اس نے اب تک یہ محاورہ نہیں سنا؟ وہ گویا ہوا ''قسم اللہ پاک کی۔ یہ لفظ پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔''

جب محاورے کا مطلب بتایا تو کہنے لگا ''اوہ..... اتنا آسان مطلب.....!''

راقم نے کہا ''جی ہاں..... مگر اسے جاننے کے لیے لغت (ڈکشنری) دیکھنا پڑتی ہے، بہت سا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔''

اس کی بڑبڑاہٹ سنائی دی ''پڑھنے کے لیے وقت کہاں ہے''؟

واقعی ہمارے نوجوانوں کے پاس خاص کر پڑھنے (مطالعہ) کے لیے وقت ہے ہی کہاں؟ موبائل فون، فیس بک، انٹرنیٹ، واٹس ایپ سے فرصت ملے تو انہیں علم ہو کہ ہم کس قدر خوبصورت زبان اور ثقافت کے مالک ہیں۔ کتنی چاشنی ہے ہماری زبان میں اور یہ کہ لکھنے پڑھنے میں کتنا مزہ ہے۔ یہ بھی کہ فیس بک پر کئی گھنٹے برباد کرنے کے مقابلے میں کسی اخبار، کتاب، میگزین کا چند گھڑی مطالعہ ہمیں کیا کچھ دے دیتا ہے۔

قربان جائیں اِس ملک کے نظام تعلیم پر جہاں اساتذہ اور طلبہ لائبریری جا کر کتب بینی کا شوق دلانے کے بجائے خود ان سے موبائل فون کے نت نئے آپشن پوچھنے، سیلفیاں لینے اور گانوں، فلموں اور تصاویر ڈاؤن لوڈنگ اور اپ لوڈنگ کے بارے میں جاننے میں مصروف رہتے ہیں۔ صدقے جائیں ان اساتذہ کے جن کے زیر سایہ پڑھنے لکھنے اور لمبی چوڑی ڈگریاں حاصل کر لینے والے طلبہ (what is your good name)'' تو فوراً سمجھ جاتے ہیں لیکن ''اسم گرامی'' کے الفاظ سن کے وہ مخاطب کا حیرت سے منہ تکتے ہوں۔''

اقتصادیات میں اعلیٰ ترین تعلیمی ڈگری کے حامل ایک نوجوان کے سامنے اخبار پڑھتے ہوئے آجر کا لفظ آ گیا۔ وہ شدید الجھن میں پڑ گیا۔ قریب بیٹھے ایک بڑے میاں سے پوچھ بیٹھا!

''انکل یہ آجر کیا ہوتا ہے؟''

انکل نے پہلے نظر بھر کے اسے دیکھا اور پھر پوچھا ''کتنا پڑھے ہوئے ہو؟''

نوجوان نے کہا ''انکل ماسٹرز کیا ہے۔''

''کس مضمون میں؟'' انکل کی طرف سے سوال ہوا۔

نوجوان گڑبڑا گیا۔ انکل کی شکل وصورت سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اتنا کچھ جانتے ہوں گے۔ خیر نوجوان کو جواب دینا ہی پڑا۔ ''جی..... اقتصادیات میں.....''

انکل نے کہا ''جس یونیورسٹی نے تمہیں ڈگری دی ہے، کل وہاں جا کے اسی مضمون کے پروفیسر سے پوچھ لینا کہ یہ آجر کیا ہوتا ہے۔ اگر نہ بتائیں تو پھر کل اسی جگہ ملنا' میں تمہیں بتا دوں گا۔''

کم ہمت نوجوان نے یونیورسٹی جانا تھا نہ دوبارہ انکل سے ملنا تھا چنانچہ آج بھی اس کو آجر کے معنی نہیں معلوم۔ آخر ہماری تعلیم کیا ہے اور ہمیں ملنے والی ڈگری کیا ہے..... محض کاغذ کا ایک پرزہ اور کاغذوں کے ڈھیر میں ایک اور کا اضافہ۔

ایک نجی اسکول کے پرنسپل کو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ طلبہ وطالبات کے الفاظ کی جگہ اگر کسی فقرے میں ''طلبہ'' کا لفظ استعمال کر لیا جائے تو پھر بھی وہ فقرہ ٹھیک ہوگا۔ آخر میں اساتذہ کرام سے صرف اتنی گزارش ہے کہ نئی پود کو خدارا صرف تعلیم ہی نہ دیں بلکہ ان کی تربیت بھی کریں۔ انھیں کتب بینی کی طرف راغب کریں، قومی زبان سے محبت کرنا سکھائیں، خاص کر یہ بتائیں کہ صحیح اردو لکھیں، صحیح اردو پڑھیں اور صحیح اردو بولیں۔ یہ بھی ایک ملی فریضہ ہے۔ آخر میں داغ دہلوی کا وہ مشہور زمانہ شعر پیش ہے جس پر اللہ کرے ہماری نسل غور کر لے.....!

اردو ہے جس کا نام ہمی جانتے ہیں داغ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

غلطی

مسعود مفتی

ایک پُراسرار خط کے ہاتھوں گھن چکر بنے بھولے شوہر کی قہقہہ بار کہانی

اب آپ ہی بتائیے اس میں ہمارا کیا قصور؟ غلطی ضرور ہوئی، اکثر لوگوں سے ہو جاتی ہے۔ خود ہمارے جدِ امجد باوا آدم سے ہوئی لیکن ستم تو یہ ہے کہ آدم جیسے بندے کی خطا پر ان کے خُدا نے اتنا شور نہ کیا ہوگا جتنا ہم جیسے مجازی خدا کی بھول پر ہماری ہی بندی کر رہی ہیں۔

شوہرانہ انداز میں سمجھوتے کی کئی دفعہ کوشش کی، غلطی بر بنائے غلط فہمی کا یقین دلایا، مصنوعی غصّے میں ڈانٹا، اداکاروں کے سے انداز میں بیگم کو مارنے دوڑے لیکن وہ ہیں کہ زبان کے ہتھیاروں سے ہلاکو اور چنگیز کی یاد تازہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ یہ نہیں سوچتیں کہ جو شخص ان سے شادی جیسی فاش غلطی کر سکتا ہے اس سے چھوٹی موٹی دوسری غلطیاں سرزد ہو جانا تو نہ صرف قرینِ قیاس ہے بلکہ ہر وقت قابلِ معافی بھی۔

ہماری بریت میں سب سے وزن دار دلیل تو یہ تھی کہ اوّل تو یہ جرم ہم سے نادانستہ سرزد ہوا اور دوسرے اس وقت ہوا جب ہم ایک اچھا شوہر ہونے کا ثبوت بہم پہنچانے بیگم ہی کی خدمت پر مامور تھے۔ بات صرف اتنی تھی کہ ہماری درجن بھر سالیوں میں سے کسی ایک کے ہونے والے شوہر کا انٹرویو تھا جس کے بورڈ میں ہمیں بھی بیٹھنا تھا۔ اللہ جانے کاتبِ تقدیر کا منشا کیا تھا کہ آیا ہم اسے چن لیں یا وہ ہمیں دیکھ کر عبرت پکڑے اور اس گھر کا نام نہ لے۔

بہرحال اسی مقصد کے لیے ہم سفر کر رہے تھے۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے گاڑی میں ہماری ہم سفر ایک محترمہ تھیں۔ یعنی ایک تو ہم سفر اور پھر صنفِ نازک، یقین جانیے سفر کٹنے کا پتا بھی نہ چلا۔ ویسے تو عورتوں کی موجودگی کا احساس ان کے جانے کے بعد ہی ہوتا ہے لیکن اس دن یہ احساس شدید تر کرنے والی چیز کتابوں کا ایک بنڈل تھا، جو وہ غلطی سے چھوڑ گئیں۔ اب مشکل یہ پڑی کہ ہمارے خمیر میں خُدا تعالیٰ نے دیانتداری کے مادّے کا تناسب ضرورت سے کچھ زیادہ ہی رکھا ہے۔

چنانچہ اسی کے زیرِ اثر وَرق گردانی کی تو ایک کتاب پر ان محترمہ کا نام اور مکمل پتا بھی مِل گیا۔ اخلاقاً ہم نے دوسرے روز وہ بنڈل بذریعہ ڈاک ان کو بھجوا ڈالا اور ساتھ ہی ان کی بھول کا ذِکر کرتے ہوئے رسمی سا خط لِکھ ڈالا۔ رسمی خط سے زیادہ کچھ لکھنے کی گنجائش ہی نہ تھی کیونکہ ایسا وہم دل میں لاتے ہی نہ معلوم ہمارے تصوّر میں بیگم کا وہ منظر کیوں آ جاتا ہے، جب کسی ایسی ہی بات پر بگڑ کر وہ باورچی خانے کی پھکنی تک سمیٹ اپنے میکے پرواز کر چلی تھیں۔

اِس لیے ہم ہمیشہ اس امر کی احتیاط کرتے آئے تھے کہ تاریخ اپنے آپ کو دُہرانے نہ پائے۔ ورنہ ہمارے گھر اور پانی پت کے میدان میں کوئی زیادہ فرق نہ رہتا۔ قصّہ مختصر محترمہ کو ہمارا خط مع کتابوں کے مِلا تو انہوں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک جوابی خط ارسال فرما دیا۔

یادش بخیر! خط کیا تھا، ایک سادہ ورق پر ٹیڑھی بھینگی لکیروں پر مشتمل کچھ ایسی اشکال بنی تھیں جو محض منطقی دلائل کی مدد سے الفاظ کہلا سکتی تھیں۔ بوجہ خط ہونے کے یہ فرض کر لیا کہ سب سے پہلی دُم کٹی لائن میں ہمیں کسی معزز القاب سے یاد فرمایا ہوگا۔ خط کے اخیر میں اکڑوں بیٹھے چند الفاظ کے گچھے کے متعلق گزشتہ علم کی بنا پر اندازہ لگایا کہ یہ ان کا نام اور پتا ہوگا۔ ان قطبین کے درمیان گویا ایک میدانِ کارزار تھا جس پہ الفاظ باہم اُلجھ رہے تھے۔

ہم نے اسے پہلی نظر میں تعویذ سمجھا، دُوسری نظر میں بہرام ڈاکو کا کوئی خُفیہ پیغام اور پھر سوچتے رہے کہ اسے کیا سمجھیں؟ عینک اتار کر پڑھا، لیٹ کر پڑھا، کُرسی میز پر سر تھام کر پڑھنے کی کوشش کی، اکڑوں بیٹھ کر دماغ آزمائی کی، ٹہلتے ٹہلتے، آنکھیں موند کر، دیدے پھاڑ کر، ایک آنکھ بند کر کے اس راز کو حل کرنا چاہا؛ دیوار پر لٹکایا، دری پر بچھایا؛ محدّب شیشے میں جھانک جھانک کر گردن توڑ ڈالی! غور و خوض میں درجنوں سگریٹ پھونک ڈالے، ظلِ اندازی کے جُرم میں ہر بچّے کو بیسیوں مرتبہ دھنک ڈالا، کھانا کھاتے وقت کتنے ہی نوالے منہ کی بجائے ناک اور رخساروں پر دے مارے لیکن قسم لے لیجیے جو اس احساس کے علاوہ کہ یہ ایک ممنون محترمہ کا خط ہے، کچھ بھی پلّے پڑا ہو۔

انگریزی کے حروف (خصوصاً بی۔ ایل۔ ایچ اور ایم۔ این۔ یو) اگر جلدی میں لکھے جائیں تو ویسے ہی تو ام بھائی بن جاتے ہیں۔ یہاں تو مصیبت یہ تھی کہ ہر دائرے، نُقطے یا خط کو مختلف زاویوں سے دیکھتے تو اس پر نئے حرف کا گمان ہوتا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ بند کمرے میں ہماری محویت دیکھتے ہوئے بیگم نے نیم تیموری، نیم معشوقانہ انداز میں تقاضا شروع کر دیا ''جو روپے ان نگوڑے معمّوں پر صرف کرتے ہو، ان سے میری گھڑی میں فیتہ کیوں نہیں ڈلواتے؟''

اِس تقاضے کا حشر تو خیر وہی ہوا جو ایسے تقاضوں کا ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے لیکن مسلسل ایک ہفتے کی دماغ سوزی کے بعد ہم نے بھی تنگ آ کر فیصلہ کیا کہ اسے اپنے کلرک ہمسائے کو دکھانا چاہیے۔ کلرکوں کی تحریر پڑھنے میں بھی ہمیں بارہا انہی کٹھن مراحل میں سے گزرنا پڑا تھا۔ اتنی عقل مندی البتہ ضرور کی کہ کاغذ کا القاب اور نام والا حصّہ پھاڑ کر خط کا اصل مضمون انہیں دیا کیونکہ ہم بھی تو عزّت دار آدمی ہیں، نہ معلوم خط میں کیا لکھا نکل آئے۔ عورت کے مزاج کی طرح اس کا خط بھی قابلِ اعتبار چیز نہیں۔

ایک دن کا وقفہ دے کر ہم صبح ان کے ہاں جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ گھنٹی بجی اور باہر نکلنے پر انہی صاحب کو سوالیہ نشان بنے کھڑے پایا۔ چھوٹتے ہی بولے: ''یہ کاغذ آپ نے کہاں سے لیا؟''

کہاں تو ہم راز حل ہو جانے کے خُوش آئند تصوّرات میں پرواز کر رہے تھے اور کہاں یہ ناگہانی تفتیش ٹپک پڑی۔

''صاحب، میرے ایک دوست نے مجھے پڑھنے کو دیا تھا اور میں نے آپ سے مدد مانگی''۔ ہم نے گھبراہٹ میں جلدی سے بات بنا ڈالی۔

''تو، بھائی صاحب'' وہ رازدارانہ انداز میں بولے، ''میری مانیے تو کاغذ فوراً انہیں واپس دے دیں اور آپ ہرگز

اس معاملے میں نہ آئیں۔''

''کیوں؟ خیریت تو ہے؟'' ہم ہکا بکا رہ گئے۔

''سچ پوچھیے سارا تو مجھ سے بھی نہیں پڑھا گیا لیکن بیچ بیچ میں سے پڑھ کر نفسِ مضمون کا پتا چل گیا ہے..... یہ دراصل دفتر کا کوئی کیس ہے جو ان صاحب نے کسی کی پرسنل فائل سے پھاڑا ہے۔ مکمل کاغذ ہوتا تو شاید پتا لگ جاتا لیکن اب تو آپ دیکھتے ہیں کہ اُوپر اور نیچے سے بھی پھاڑ ڈالا گیا ہے، اسی لیے اب معاملہ بہت سنگین ہو گیا ہے۔ میرا مخلصانہ مشورہ تو یہی ہے کہ آپ یہ کاغذ ان کے حوالے کیجیے اور اپنی جان بچائیے۔''

اب ہم دل ہی دل میں ہنس رہے ہیں تو انہوں نے اسے ہماری فکر پر محمول کیا۔ سرگوشی میں بولے: ''میں نے کہا..... کوئی اپنے آدمی ہیں کیا؟''

''ہیں تو!'' ہم نے ڈراما جاری رکھا۔

''آپ کل شام انہیں میرے ہاں لے آئیے۔ ایک تیر بہدف نسخہ بتاؤں گا۔ پندرہ سال کی کلرکی میں سیکھا ہی کیا ہے۔ ایک آدھ فائل گم کر دینا کون سا مشکل کام ہے؟'' ان کا سینہ پھُول گیا۔

''اچھا، میں ان سے مشورہ کر کے عرض کروں گا۔'' کہتے ہوئے ہم نے دروازہ بند کر لیا اور جان بچائی۔

کلرک صاحب کو مطعون کرنا سراسر زیادتی ہوگی۔ یہ کیا کم تھا کہ جن گتھیوں کو ہم سمجھ نہ سکتے تھے ان سے انہوں نے کچھ تو اخذ کر لیا لہٰذا اس قصّے کو وہیں ختم کرتے ہوئے اپنے ایک ڈاکٹر دوست سے رجوع کیا۔ جو ڈاکٹر صاحبان ایسا نُسخہ لکھ اور پڑھ سکتے ہیں، جو تجریدی آرٹ (Abstract Art) کا کوئی نا قابلِ فہم شاہکار معلوم ہوتا ہو، ان سے اس راز کا حل ہو جانا بعید از قیاس نہ تھا۔

ایک دو دن تو ڈاکٹر صاحب کو فرصت ہی نہ ملی لیکن تیسرے دن جب ہم ان کی ڈسپنسری کے سامنے سے گزر رہے تھے تو وہ اندر سے ہی چلائے:۔

''ارے بھائی وہ تمہارے کاغذ نے بہت تنگ کیا۔''

پیشتر اس کے کہ وہ کچھ اور فرماتے، ہم اچک کر اندر پہنچ گئے اور بے صبری سے مزید تفصیلات کا تقاضا کرنے لگے۔ ڈاکٹر صاحب ایک بچّی کی نبض پکڑے لال پانی کی شیشی کے سوراخ دار ڈھکنے میں تھرما میٹر ڈالتے ہوئے بولے: ''آج مسلسل تین گھنٹے کی محنت کے بعد پتا چلا۔ بس ابھی بنا کے آیا ہوں۔''

عرض کیا: ''کیا بنا کے آئے ہیں؟''

بولے: ''صرف چپاتی شوربا کھائیے۔ کھٹی اور بادی اشیاء سے پرہیز اور ہاں بھائی ایک دوائی تو ملتی ہی نہ تھی۔''

ہم نے گھبرا کر عرض کیا: ''قبلہ آپ فارغ ہو لیں تو اطمینان سے بات کریں گے۔''

کہنے لگے: ''نہیں میں تو فارغ ہوں۔ بڑے میاں پیٹ سے کپڑا اُٹھائیے، (مجھے اشارہ کر کے) بیٹھو گے بھی یا کھڑے ہی رہو گے؟ اور ہاں قبض تو نہیں ہے؟ ارے بھئی اندر سے لانا ان کی شیشی۔''

دراصل ڈاکٹر صاحب ان لوگوں میں سے تھے جو قدرت کی ودیعت کردہ آنکھوں پر مطمئن نہیں ہوتے اور ایجادِ بندہ اگرچہ گندہ کے قائل ہوتے ہوئے پتلیوں کا نیا زاویۂ نگاہ ایجاد کر کے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس بھینگے پن کا عملی نقصان یہ تھا کہ ہمیں آج تک یہ معلوم نہ ہو سکا، وہ دراصل کس سے مخاطب ہیں۔ اکثر یہ ہوتا کہ وہ مرض ایک مریض سے پوچھتے ہیں اور حالت کوئی دوسرا بتانا شروع کر دیتا۔ اِدھر بیٹھے ہم ڈرتے رہتے کہ وہ ایک مریض کی موت کہیں دوسرے پر منتقل نہ کر دیں۔

آج بھی یہ سمجھتے ہوئے کہ ان کا روئے سخن کسی اور مریض کی طرف ہوگا، ہم چپکے بیٹھ گئے۔ چند ہی ثانیے بعد کمپاؤنڈر نے ایک نہایت بدرنگ دوائی کی بڑی سی شیشی

ہمارے ہاتھ میں تھما دی جس کا کارک مضبوطی سے بند ہونے کے باوجود بدبو کے بھبکے لپک لپک کر دماغ کو چڑھ رہے تھے۔ ساتھ ہی محترمہ کا خط دیتے ہوئے بولا: ''اور یہ رہا صاحب آپ کا نُسخہ۔''

اب حضرت موسیٰ تو خوش ہوں جن کو آگ کی بجائے پیغمبری مِل گئی لیکن جس بدقسمت کو متوقع دوستی کی بجائے غلیظ سی دوائی مِل جائے وہ کیا خاک خوش ہوگا۔ ہم نے بے بسی سے کمپاؤنڈر کے چہرے کو دیکھا، اِرد گرد بیٹھے ہوئے مریضوں کی طرف تاکا اور پھر ایک ہی ٹک ''نسخے'' اور دوائی کو جو دیکھنے لگے تو یقین جانیے دوا پیئے بغیر ہی پیٹ میں جلاب کی سی کیفیت محسوس ہونے لگی۔

عین اسی وقت ڈاکٹر صاحب کی چیخ کان پڑی: ''نہ نہ نہ، انار ہرگز نہ کھائیے گا۔ نقصان دے گا اور بھائی یہ نسخہ کہاں سے لیا تھا؟ ایک دوائی تو بالکل ہی نایاب ہے۔ صرف تمہاری وجہ سے دوسرے ڈاکٹر کی منتیں کر کے دو گرام منگوائی ہے۔ بہرحال تمہارا کام تو ہو گیا لیکن اس ڈاکٹر سے کہنا کہ کم از کم کسی باضابطہ طریقے سے ڈھنگ کے کاغذ پر نُسخہ لکھا کرے، یہ کیا حماقت.....''

لیکن ان کی بات ختم ہونے سے پیشتر ہم ایک ہی جست میں دکان عبور کر، نزدیک ترین بدرو کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ وہاں پہنچ کر شیشی پوری قوت سے کالے سیال پانی میں پھینکی اور جب دوائی کی بُو بدرو کی بُو میں مِل گئی تو ہم سر جھکا کر گھر کو پلٹے۔

اگلی ساری رات خط سامنے رکھ کر ہم نے ایک دفعہ پھر گزشتہ دماغی ورزشوں کا وِرد کیا لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ صبح صبح بجائے نماز ادا کرنے کے ہم اپنے دوسرے دوست کی طرف بھاگے۔ وہ کافی مدّت سے وکالت کر رہے تھے اور چونکہ وکیلوں کا مختلف قسم کی مثلوں سے واسطہ پڑتا ہے، اِس لیے ہمارا خیال تھا کہ وہ ضرور کچھ مدد دے سکیں گے۔ جب انہوں نے پوری توجہ سے پڑھنے کا کئی بار یقین دلایا تو ہم واپس پلٹے۔ سارا دن بے چینی سے گزرا۔ ذہن میں وکیل صاحب کی مصروفیات تولتے رہے۔ تصوّر ہی تصوّر میں ان کی گزشتہ ساری عمر کی علمی قابلیت پرکھ کر ان کی کامیابی کے امکانات پر غور کرتے رہے اور بالآخر شام کو دھڑکتا دِل لیے ان کے بنگلے پر پہنچے۔ وہ لان میں بیٹھے اپنے مؤکلوں کو پھانسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے حاضرین سے معذرت چاہی اور سارے مکان کو عبور کر کے ایک نسبتاً تاریک اور علیٰحدہ کمرے میں لے گئے۔

''ارے رامو'' ملازم کو للکارتے ہوئے بولے، ''اس طرف کوئی نہ آئے''۔ انداز اور لہجہ ایسا تھا کہ ہمارا ماتھا ٹھنکا اور دِل میں ہزاروں اندیشے جاگ اُٹھے۔ مجھے کرسی میں دھکیلتے ہوئے بولے: ''میاں مجھ سے کیا پردہ تھا، جو شروع اور اخیر سے نام ہی پھاڑ ڈالے؟ یہ تو میں پھر بھی جان گیا ہوں کہ یہ ایک نسوانی خط ہے۔''

ہم غالباً عمر میں پہلی بار مکمل دنگ رہ گئے لیکن راز حل ہوتا دیکھ کر ہمارے ذہن سے ایک بوجھ سا اُتر گیا۔ وکیل صاحب بولے: ''پہلے یہ بتاؤ کہ خط تمہارے ہی نام ہے؟''

اب کچھ چھپانا فضول تھا چنانچہ ہم نے مجرمانہ طریقے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وکیل صاحب نے ناک میں سے لمبا سا ''ہوں'' کیا، کرسی کی پُشت پر سر ٹکا کر چھت کو گھورنے لگے، پھر آنکھیں موند کر پاؤں ہلانے لگے، کُرسی کے بازو کو انگلیوں سے بجایا اور تھوڑا سا مخاطب ہو کر بولے: ''بھئی معاف کرنا لیکن تمہاری بیوی بہت سخت قسم کی عورت معلوم ہوتی ہے۔''

ہم سچ مچ اچھل پڑے۔ ان کی عالمانہ قابلیت کے دِل ہی دل میں قائل ہوتے ہوئے ہم نے سوچا کہ یہ کم بخت تو سب کچھ جان گیا، وہ باتیں بھی جن کا خط سے کوئی تعلق نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ شیطان اور وکیلوں کے جس

روایتی رشتے کا عموماً ذکر کیا جاتا ہے ہمیں اس پر بھی یقین آنے لگا لیکن اس یقین کی پختگی سے زیادہ نفسِ مضمون کے متعلق ہماری تشویش چٹکیاں لے رہی تھی۔ پھر بھی ہم نے شرماتے شرماتے ان کے مشاہدے کی تائید کردی۔ وہ تسلی دیتے ہوئے بولے:

''خیر! خیر! کوئی بات نہیں۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ بیوی عموماً پہلے سال تعاون سہتی ہے، دوسرے سال تعاون کرتی ہے اور پھر ساری عمر تعاون کرواتی ہے۔ کوئی نئی بات نہیں۔ عموماً بیویاں سخت ہی ہوتی ہیں کیونکہ وہ سمجھتی ہیں کہ عمر میں ایک ہی تو شکار سخت کرنے کو ملا ہے..... لیکن میرا مطلب ہے کہ تمہارا معاملہ..... یعنی بات یہ ہے کہ معاملہ تمہارے ہاتھ سے اب باہر ہو چکا؟''

''کیا مطلب؟'' ہم نے اس معمہ بازی سے تنگ آکر پوچھا۔

''مطلب یہ کہ خط بہت غُصّے کی حالت میں لکھا گیا ہے۔ تمہاری بیوی نے صاف لکھ دیا ہے کہ وہ تم سے قطع تعلق کرنا چاہتی ہے اور یہ کہ چار دن کے اندر اندر حق مہر بھجوا دو نہیں تو عدالتی کارروائی کی جائے گی۔''

اگر یہ بات درست ہوتی تو شاید شادی کے بعد ہمیں دوسری بڑی خوشخبری ملتی لیکن اس وقت تو مایوسی سے ہم بے جان سے ہو گئے۔ وکیل صاحب کے ہاتھ سے خط چھین کر ہم باہر کو لپکے اور وہ ''سنو تو، ارے بھئی سنو تو'' ہی پکارتے رہے۔

بزرگوں کا قول ہے کہ ہر طرف سے مایوس ہو کر جب کوئی آدمی آخری کوشش کرے تو وہ عموماً کامیاب ہوتا ہے، چنانچہ ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ پندرہ دن کی سر توڑ کوشش کے بعد وہ لاطینی کچھ کچھ ہماری سمجھ میں آنے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مزید پندرہ دن بعد ہم اس کا ہر حرف سمجھ گئے۔ پورا مضمون تو خیر پردے کی بات ہے لیکن صرف آپ کو اتنا بتائے دیتے ہیں کہ اس خط میں جو فرمائش کی گئی تھی، اس کی تکمیل میں ہم نے چار کتابیں بازار سے خرید کر بھیج دیں۔ ساتھ ایک خط بھی لکھا۔ آپ جانتے ہیں رسمی خط تو ایک ہی کافی ہوتا ہے اور ہم تو دوسرا لکھ رہے تھے۔

تیسرے دن نہایت صاف ٹائپ کیا ہوا ایک خط ملا جس کا ہر حرف کئی گز دور سے پڑھا جاتا تھا۔ خط کا مضمون یہ تھا:

''..... (القاب کا راز میں رہنا ہی بہتر ہے) میں نہیں جانتی آپ کون ہیں۔ میری ایک سہیلی مجھ سے وہ کتابیں مانگ کر لے گئی تھی جو آپ نے پہلی دفعہ بھجوائی تھیں۔ میرا خیال تھا اُس نے آپ سے واقفیت کی بنا پر یہ کتابیں مجھے بھیجنے کو کہا ہوگا، چنانچہ میں نے محض شرافت سے مجبور ہو کر وہ چاروں کتابیں ملنے کی اطلاع دی تھی لیکن آپ کی طرف سے کتابوں کا دوسرا بنڈل اور خط ملنے پر میں حیران ہوں کہ پہلی کتابیں آپ کے ہتھے کیسے چڑھ گئیں۔ میں آپ جیسے.....''

مزید کیا لکھیں؟ خواہ مخواہ آپ کی طبیعت خراب ہوگی اور قانون دان حضرات ہتکِ عزت سے متعلق قانون کی کتابوں میں جھانکنا شروع کردیں گے۔

لیکن جھگڑا سارا اس بات کا تھا کہ وہ خط ہماری غیر حاضری میں بیگم نے وصول کرلیا۔ پھر اپنے بیگماتی حقوق کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے اسے کھول ڈالا۔ نتیجہ یہ تھا کہ گزشتہ چار گھنٹے سے ہم کوئی تہ خانہ ڈھونڈ رہے تھے اور اب بیگم بال کھولے، ایک ہاتھ میں خط پکڑے، ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی اپنے چہرے پر کریم اور ہمارے چہرے پر کالک مل رہی تھیں۔ اِدھر ہم یہ سوچ رہے تھے کہ غلطی ہماری ہے جنہوں نے غلط فہمی میں وہ کتابیں بھیج دیں یا ان محترمہ کی جنہوں نے پہلا ہی خط ٹائپ شدہ کیوں نہ بھیجا؟

دفتر سے اٹھنے ہی والا تھا کہ موبائل فون پر جلترنگ سی آواز کے ساتھ ایک پیغام آیا۔ لکھا تھا ''میرا نام ... ہے۔ میں اس وقت شدید قسم کی پریشانی سے دوچار ... مجھے کسی کی مدد درکار ہے۔ پلیز آپ میرے اس نمبر پر ... روپے کا بیلنس تو کروا دیں''۔ یہ ایس ایم ایس پڑھ کر اس ... لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی کیوں کہ اسی سے ملتا جلتا پیغام ... مہینا پہلے بھی آیا تھا۔ تب اس نے ایک نئی سم خرید کر اپنے ... کروائی تھی۔ آج تیسری سم موبائل فون میں لگاتے ہی دیگر ... شمار پیغامات کے ساتھ یہ پیغام بھی آگیا تھا۔ اسے حیرانی ... بات پر تھی کہ ایسے فراڈ لوگوں کے پاس دوسروں کے ... موبائل فون نمبر کیسے آجاتے ہیں؟۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ سنیے۔ ٹیوشن پڑھنے آنے والے طلبہ میں سے ایک کا والد رات کے دس بجے سخت سردیوں کے دنوں میں میرے پاس آیا۔ وہ بہت پریشان لگتا تھا۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ شام ۴ بجے ان کے گھریلو موبائل فون پر ایک پیغام آیا کہ آپ کا نمبروں کی قرعہ اندازی میں 3 لاکھ روپے کا انعام نکل آیا ہے۔ آپ یہ رقم آکر وصول کرلیں۔ یہ رقم آپ کے اکاؤنٹ میں منتقل کی جائے گی اور اس کے لیے کچھ قانونی تقاضے پورے کرنے ہیں۔ اس لیے کمپنی کو کچھ رقم درکار ہے۔ آپ ۱۱۰۰ روپے کے

موبائل کریڈٹ کارڈ خرید کر اس دیے گئے نمبر پر بیلنس بھجوائیں۔ یہ کام آپ نے ۵ گھنٹے کے اندر اندر انجام دینا ہے تاکہ ہم جلد از جلد رقم آپ کے اکاؤنٹ میں منتقل کروا سکیں۔

بات پوری ہونے سے قبل ہی میں نے پوچھ لیا ''ارے صاحب.....! کہیں آپ نے انہیں ۱۱۰۰ روپے کا بیلنس بھجوا تو نہیں دیا؟''

اس نے بند مٹھی میرے سامنے کھول دی جس میں سے ۱۰۰، ۱۰۰ روپے والے کئی موبائل کریڈٹ کارڈ نکل کر زمین پر گر پڑے۔ میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ پتا چلا کہ اس کے گھر میں تو آج رقم بھی نہیں تھی۔ اس نے سالی سے ۱۱۰۰ روپے ادھار لے کر کارڈز لیے اور ایک شخص کو ۵۰ روپے اجرت دے کر بیلنس بھیجنے بھجوایا۔ چھ گھنٹے بیت گئے لیکن کوئی اطلاع نہیں آئی۔ اب میں اسے کیسے بتاتا کہ اس نمبر سے اسے رقم اکاؤنٹ میں منتقل ہونے کی اطلاع قیامت تک نہیں آئے گی۔

موبائل فون انٹرنیٹ جہاں دور جدید میں آسانی اور معلومات کا مفید ذریعہ بنا ہے وہاں اس سے لوگوں کی پریشانیوں اور مشکلات میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ کچھ جرائم پیشہ افراد اس سہولت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جعلسازی کے نت نئے طریقے اپنا کر اسے اپنے مذموم مقاصد میں استعمال کر رہے ہیں جنھیں ''سائبر کرائم'' کا نام دیا جا چکا۔

ترقی یافتہ ممالک جیسے امریکا، برطانیہ، فرانس، چین، جاپان وغیرہ میں تو سائبر کرائم کی روک تھام کے لیے قوانین موجود ہیں۔ وہاں انٹرنیٹ فراڈ اور ہیکنگ قابل سزا جرم ہے۔ تاہم پاکستان میں سائبر کرائم کے حوالے سے ابھی اتنی پیش رفت نہیں ہوئی جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پڑھے لکھے جرائم پیشہ افراد سادہ لوح لوگوں کو اپنے جال میں پھنسا رہے ہیں۔

لوگوں کو اکثر بذریعہ ای میل یہ خوشخبری دی جاتی ہے کہ وہ ایک بڑی انعامی رقم جیت گئے ہیں۔ جب ''انعام یافتہ'' شخص ای میل کرنے والے سے رابطہ کرے، تو اس سے ہینڈلنگ چارجز کے طور پر مخصوص رقم طلب کی جاتی ہے۔ کہا جاتا کہ یہ رقم موصول ہونے کے بعد انعامی رقم آپ کو روانہ کر دی جائے گی جو کبھی موصول نہیں ہوتی۔

حال ہی میں ایک نئی جعلسازی منظر عام پر آئی ہے جس کے اب تک کئی سادہ لوح لوگ شکار ہو چکے ہیں۔ ان میں اکثریت خواتین کی ہے۔ جعلساز کی جانب سے آپ کے موبائل فون پر ایک کال موصول ہوتی ہے۔ کال کرنے والا اپنے آپ کو موبائل فون کمپنی کا نمائندہ ظاہر کرتا اور خوشخبری سناتا ہے کہ کمپنی کی کروائی گئی قرعہ اندازی میں آپ کے موبائل ٹیلیفون نمبر پر ایک لاکھ روپے کا انعام نکلا ہے۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کے سلسلے میں آپ کا ۲۵۰۰۰ روپے والا انعام نکلا ہے۔ آپ فوری طور پر دیے گئے نمبر پر کنفرم کریں تاکہ مذکورہ انعامی رقم آپ کو بھیجی جا سکے یا پہلے ہمیں اتنے ہزار روپے بھیج دیں تاکہ یہ انعامی رقم آپ کو بھجوانے کا عمل شروع ہو سکے۔ جونہی آپ ہدایت کے مطابق دیے گئے نمبروں پر جوابی میسج بھیجتے ہیں تو آپ کا بیشتر بیلنس مذکورہ نمبر پر منتقل ہو جاتا ہے۔ آپ کی ادا کردہ رقم ملنے کے بعد وہ پھر رابطہ نہیں کرتے نہ آپ کی کال اٹھاتے ہیں نہ ایس ایم ایس کا جواب ملتا ہے۔

لوگوں کو چاہیے کہ اگر انہیں اس طرح کی ای میلز وصول ہوں جس میں ان سے رقم طلب کی جائے تو وہ اس پر کان نہ دھریں بلکہ قناعت کی زندگی اختیار کریں۔ محنت اور صبر کے ساتھ جائز کمائی کریں اور اس میں کوتاہی نہ برتیں۔

معاشرتی کہانی

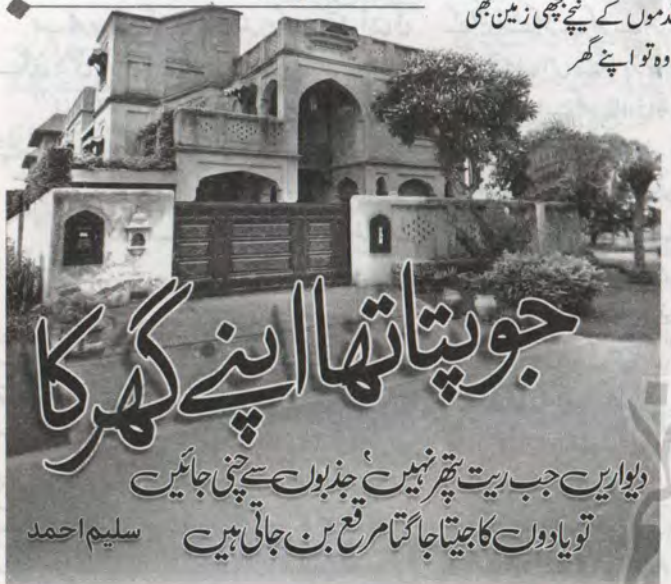

جو پتا تھا اپنے گھر کا

دیواریں جب ریت پتھر نہیں، جذبوں سے چنی جائیں
تو یادوں کا جیتا جاگتا مرقع بن جاتی ہیں

سلیم احمد

اُسے یہ گلیاں، راستے، اردگرد موجود چہرے حتیٰ کہ سر پہ پھیلا آسمان اور قدموں کے نیچے بچھی زمین بھی جیسے اجنبی سی لگ رہی تھی۔ وہ تو اپنے گھر میں تھا..... جہاں سکھ شانتی سے جیون بیت رہا تھا پھر اچانک اِس اجنبی دیس میں کیسے آن پہنچا۔ اس کی گھبراہٹ اور پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اُس نے بھاگ کر ایک اجنبی کو روکا ''جناب! میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں براہ مہربانی مجھے میرے گھر تک پہنچا دیں۔''

''کیا ہو گیا ہے میاں! تُم کوئی بچے ہو کہ تمہیں تمہارے گھر پہنچائیں'' اجنبی نے مضحکہ اڑایا۔

وہ ایک دوسرے اجنبی کی طرف بھاگا ''آ..... آپ..... مجھے گھر تک پہنچا دیں گے؟''

اجنبی نے اُسے سر سے پیر تلک دیکھا اور پوچھا ''گھر کا پتا معلوم ہے؟''

''ہاں.....'' ہاں، وہ جلدی سے گویا ہوا۔ ''میرا گھر سُرخ اینٹوں والی چوڑی گلی میں ہے۔ گھر کے سامنے بڑا سا پیپل کا درخت ہے..... دروازہ بھورے رنگ کا ہے..... دیواریں زیادہ اونچی نہیں..... گھر کے اندر لگا آم کا درخت باہر سے بھی نظر آتا ہے اور اُس پر بیا کا گھونسلہ بھی۔ وہاں موجود کھمبے کی تاروں میں میری پتنگ اب تک اٹکی ہوئی ہے۔ ابا نے اُتارنے ہی نہیں دی۔''

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے..... گلی نمبر..... مکان نمبر..... یاد ہے؟'' اجنبی چڑ کر بولا۔

''نہیں..... وہ تو مجھے یاد نہیں.....'' اُس نے کافی دیر ذہن پر زور ڈالنے کے بعد جواب دیا۔

''تو جاؤ اپنا کام کرو.....'' اجنبی اُسے پرے دھکیل کر آگے نکل گیا۔ وہ ہونق سا سڑک کے کنارے کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد اُس نے ایک تانگے والے کو روکا اور اس میں سوار ہو گیا۔

''کہاں جانا ہے؟'' تانگے والے نے پوچھا

''میں تمہیں راستہ سمجھاتا ہوں..... ابھی اس سڑک پر سیدھے چلتے جاؤ پھر بائیں طرف مُڑ جانا اور.....''

تانگے والے نے مشکوک نظروں سے اُسے دیکھا اور گھوڑے کو چابک رسید کرتا تانگہ آگے بڑھا دیا۔

اس چھوٹے سے شہر کے کئی چکر لگانے کے بعد بھی اُسے

اپنا گھر نہ ملا تو تانگے والے نے اُسے ڈپٹ کر نیچے اُتار دیا۔

اب پھر وہ اپنے گھر کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اُس کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی کہ اچانک اُس کی آنکھ کھل گئی۔

''کیا ہوا صفدر؟'' آصف نے اُسے یوں پریشان حال بیٹھے دیکھا تو وجہ پوچھی۔

''بس..... پھر وہی خواب آیا ہے۔'' وہ بے بسی سے بولا

''پریشان نہ ہو سب ٹھیک ہو جائے گا.....'' آصف نے اُسے تسلی دی۔

یہ سچ ہے۔ جب چند ماہ پہلے وہ اپنے گھر سے بے بسی کے عالم میں نکلا تھا تب سے یہ خواب اُس کے تعاقب میں تھا۔ وہ گھر جو زمیں پر اُس کے لیے جنت کی طرح تھا۔ جہاں اس نے ماں باپ کی انگلی پکڑ کر پاؤں پاؤں چلنا سیکھا تھا..... جہاں قدم قدم پر اُس کے بچپن کی یادیں بکھری تھیں۔ جس کے آنگن میں لگے آم کے درخت پر ''بیا'' کا گھونسلہ تھا اور کچے آموں کے اچار کا ذائقہ آج بھی اس کی زبان پر تھا۔

جہاں کبھی اُسے ماں کی نرم گرم گود اور اُس کے آنچل کی ٹھنڈی چھاؤں میسر تھی۔ اچانک ماں بیمار ہو کر چل بسی، تب اُس کی عمر محض دس برس تھی۔ باپ سال کے اندر اندر نئی بیوی لے آیا اور رفتہ رفتہ اس کے حُسن کا ایسا اسیر ہوا کہ اکلوتے بیٹے کو فراموش کر دیا۔ وہ اپنے ہی گھر میں اجنبی سا ہو کر رہ گیا۔

اُسے اپنا وجود گھر میں پڑی فالتو اور بے کار چیزوں سے بھی زیادہ حقیر لگتا مگر وہاں موجود ہر شے سے اُسے ماں کے وجود کی مہک آتی تھی۔ یہ تعلق بڑا گہرا تھا، وہ گم سُم سا پڑھائی میں مگن رہتا اور کوشش کرتا کہ سوتیلی ماں اور باپ سے سامنا کم ہی ہو۔ وہ جوں جوں بڑا ہو رہا تھا، سوتیلی ماں کی اُس سے نفرت بھی بے وجہ بڑھ رہی تھی۔ وہ جھوٹے سچے الزام اُس پر لگائے رکھتی اور باپ کے ہاتھوں اس کی تذلیل کروا کر خوش ہوتی۔

ایف۔اے کے امتحان سر پر تھے کہ ماں نے اچانک اس پر زیورات چوری کرنے کا الزام لگا دیا۔ باپ نے تفتیش کیے بغیر اُسے کھڑے کھڑے گھر سے نکال ڈالا۔ اس کا جگری دوست آصف اس کے تمام تر حالات سے آگاہ تھا۔ اس نے اُسے نا صرف اپنے گھر پناہ دی بلکہ اس کی دلجوئی بھی کی تبھی وہ ایف۔اے کا امتحان دے پایا۔

ایف۔اے کے بعد وہ ٹیوشن پڑھانے اور ایک چھوٹا سا کمرا کرایے پر لے کر رہنے لگا۔ زندگی جیسے مسلسل جدوجہد سے عبارت ہو گئی۔ بی۔اے کے بعد اُسے معقول نوکری مل گئی۔ آصف کے گھر والوں نے ہی اُس کی شادی بھی کروا دی۔ آمنہ اُس کی زندگی میں خوش نصیبی کا استعارہ بن کر آئی۔ وہ پڑھی لکھی تھی، ایک اسکول میں پڑھاتی تھی۔ دونوں مل کر خوش اسلوبی سے زندگی کی گاڑی کھینچنے لگے۔

لیکن پرانے خواب نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ آمنہ اس کے دُکھ سے واقف تھی۔ وہ اس کی ڈھارس بندھاتی ''ایک دن ضرور ایسا آئے گا جب آپ کو یہ خواب نظر آنا بند ہو جائے گا..... ہم اپنا گھر بنائیں گے جس کے آنگن میں ہمارے بچے کھیلا کریں گے۔ آنگن میں بھی ہم آم کا پیڑ لگائیں گے جس کے کچے آموں کا اچار ڈالا کروں گی۔ ماں کی طرح.....''

''مگر اس کے در و دیوار سے ماں کی مہک تو نہیں آئے گی اور نہ ہی میرے بچپن کی یادیں اُن سے لپٹی ہوں گی.....'' وہ اداسی سے کہتا۔

''ہم اپنے بچوں میں اپنا بچپن ڈھونڈ لیں گے۔'' آمنہ مسکرا کر کہتی تو وہ بھی مسکرا دیتا۔

وہ دونوں پھر ایک گھر بنانے کی تگ و دو میں اپنا آپ بھلا بیٹھے، جیون کے کتنے سنہرے سال اس تگ و دو کی نذر ہو گئے مگر بالآخر انہوں نے منزل پالی۔ اب وہ اپنے تین بچوں کے ساتھ اپنے چھوٹے سے گھر میں آسودہ حال اور مطمئن تھے۔ اُن کا آنگن میاں بیوی کی باہمی محبت اور بچوں کی خوش کُن آوازوں سے بھرا رہتا۔ مدت ہوئی اس کا اس پُرانے

خواب سے بھی پیچھا چھوٹ گیا تھا۔

وقت جیسے پَر لگا کر اُڑتا چلا گیا۔ بچے جوان ہو گئے۔ بیٹی بیاہ کر اپنے گھر چلی گئی۔ بیٹے بھی پڑھ لکھ کر روزگار سے لگ گئے۔ بیٹوں کی شادی کے بعد آمنہ ایسی پُرسکون ہوئی کہ ایک دن اچانک ہمیشہ کی نیند سو گئی، وہ خالی دِل لیے تنہا رہ گیا۔ بچوں کی اپنی زندگیاں تھیں۔ اس بھاگتی دوڑتی زندگی میں اُن کے پاس بوڑھے باپ کے لیے وقت ہی کہاں تھا۔ وہ بھی شکوہ کیے بغیر بچوں کی اولاد میں مگن رہتا۔ اُن کی معصومیت اور میٹھی باتیں اُس کی توجہ بٹائے رکھتیں مگر ایک دن اُس کے پوتے نے اُس کا دل ہی دہلا دیا۔ کہنے لگا ''دادا! کیا جب چیزیں پُرانی ہو جاتی ہیں تو انہیں بیچ دیتے ہیں؟''

''کیا مطلب؟ تم کیا پوچھنا چاہ رہے ہو بیٹا؟''

''پاپا کل چاچو سے کہہ رہے تھے، یہ گھر اب بہت پُرانا ہو گیا ہے۔ اب اِسے بیچ دینا چاہیے۔'' پوتے نے جواب دیا۔

''کیا وہ نہیں جانتے کہ گھر جتنا پُرانا ہوتا ہے اس کی جڑیں دِل کی زمین میں اُتنی ہی گہرائی تک اُتری ہوتی ہیں.....'' وہ بڑبڑایا تو پوتا سمجھی سے بولا: ''کیا کہہ رہے ہیں دادا ابو؟''

''کچھ نہیں..... تُم جا کر کھیلو'' وہ بے دلی سے بولا۔ اس کا دل اندر ہی اندر ڈوب رہا تھا۔ طویل سفر کے بعد وہ اس گھر تک پہنچا تھا..... تو کیا پھر کوئی نیا سفر درپیش تھا۔ ہاں! اس کے پوتے نے سچ کہا تھا، اب اس کے دونوں بیٹے روز ہی اصرار کرتے کہ گھر بیچ دیا جائے، دونوں اپنا اپنا حصّہ لے کر نئے گھر بنانا چاہتے تھے۔

وہ انہیں کیسے سمجھاتا کہ یہ گھر بیچنے نہیں اُس کے اور آمنہ کے خواب بیچنے کی بات تھی۔ یہ اُن کے بچپن کی شرارتوں کو فروخت کر دینے کا معاملہ تھا۔ جواب بھی اس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی تھیں۔ یہ بے شمار کھٹی میٹھی یادیں بیچنے کی بات تھی.....

مگر ہونی ہو کر رہی، وہ بیٹوں کی ضد کے آگے ہار گیا۔ بیٹے کاغذات پر دستخط کروا کر خوشی خوشی کمرے سے نکلے تو جیسے پرانے زخموں سے پھر خون رِسنے لگا۔ وہ رات اُس پر بڑی بھاری تھی۔ وہ دیر تک جاگتا رہا۔ بمشکل آنکھ لگی تو برسوں پُرانا خواب پھر نظر آیا..... وہ اپنے گھر کا پتا ڈھونڈتے ڈھونڈتے نڈھال ہو گیا۔

اگلی صبح ملازم حسبِ معمول ناشتا لے کر آیا تو وہ مر چکا تھا۔ بیٹوں نے اس خبر کو معمول کی خبر کے طور پر سُنا۔ اِدھر اُدھر اطلاع دینے کے بعد وہ اُس کی تدفین کی تیاریوں میں لگ گئے۔ چند گھنٹوں بعد وہ دوسروں کے کاندھوں پر سوار اپنے ابدی گھر کی سمت روانہ ہو گیا۔

شوخیاں

روبی اپنی سہیلی سے کہہ رہی تھی، ''میری یہ عادت ہے کہ میں جب بھی بیمار ہوتی ہوں تو ڈاکٹر کے پاس جاتی ہوں کیوں کہ اُسے بھی زندہ رہنے کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے۔ اُس کے بعد اُس کے نسخے کے مطابق کیمسٹ سے دوا خریدتی ہوں کہ اُسے بھی زندہ رہنا ہے اور پھر گھر پہنچ کر اُس دوا کو نالی میں انڈیل دیتی ہوں۔''

''وہ کس لیے؟'' سہیلی نے دریافت کیا۔

''اِس لیے کہ مجھے بھی زندہ رہنا ہے۔'' روبی نے جواب دیا۔

اُستادِ ممدرباں!

سیما صدیقی

ٹیچنگ کالج میں گزری تلخ و شیریں یادوں کا شگفتہ تذکرہ، ایک اُستانی کے قلم سے

آپ نے دیکھا ہوگا کہ اکثر تعلیمی اداروں میں بچوں کے والدین انہیں داخلہ دلانے لاتے ہیں لیکن ہمارے کالج میں صورتِ حال خاصی منفرد تھی، وہاں اکثر و بیش تر ایسے بچے آتے جو اپنے ''والدین'' کو داخل کروا کر چلے جاتے۔ یہ وہ والدین ہوتے جو بطور اُستاد برسوں دوسروں کے بچوں کا مستقبل تاریک کرنے کے بعد اپنے بچوں کے تاب ناک مستقبل کی خاطر (یعنی گریڈ کی بہتری کے لیے) یہاں (ٹیچنگ ٹریننگ کالج) میں وارد ہوتے۔

بی اے کے بعد جب بی ایڈ کرنے کا ارادہ کیا تو ہم بھی اسی ادارے میں پہنچ گئے جہاں جا کر اس مقولے پہ یقین آ گیا کہ علم حاصل کرنے کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں! ہمارے ادارے کا تربیتی کورس بھی نہایت غیر معمولی نوعیت کا تھا۔ ابتدائی مرحلے میں ہمیں بتایا گیا کہ بچوں کو بغیر آمادگی کے پڑھانا سخت جہالت ہے، پہلے تمہید باندھیں، پھر آمادگی، اِس

بعد اصل موضوع پر آئیں لیکن اس سے پہلے ''سابقہ معلومات'' کا جائزہ ضرور لیں۔ موضوع کی مناسبت سے کوئی چارٹ یا نقشہ دیوار پر آویزاں کریں اور پھر باقاعدہ تدریس کا آغاز کر دیں۔

جب ہم نے عملی زندگی میں اس طریقۂ کار کو اپنانے کی کوشش کی تو ہمیں نہایت سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑا۔ ہم تمہید کے بعد بچوں کو پڑھنے پر آمادہ کرتے مگر جونہی وہ آمادہ ہوتے پیریڈ کے خاتمے کی گھنٹی بج جاتی۔ اِس کے بعد اضافی پریڈ پڑھانے پر ہماری پرنسپل آمادہ نہ ہوتیں۔ اگر مذکورہ طریقۂ کار میں کے ضابطوں کو یقینی بنانا مقصود ہے تو پہلے تربیتی کورس کی پرنسپل کو آمادہ کرنے کا بھی کوئی اضافی گُر بتایا جائے۔ ہمارے خیال میں بچوں کے مقابلے میں پرنسپل کی آمادگی ہر مرحلے میں زیادہ ضروری ہے۔

ہمارے سرکاری تعلیمی اداروں میں اساتذہ کی بھرتی میں خاصی ''رواداری'' کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ ہم نے ایک بار اخبار میں پڑھا کہ فلاں اسکول میں ایک ایسے ہیڈ ماسٹر کی تعیناتی کا انکشاف ہوا ہے، جنہیں اپنے دستخط کروانے کے بھی سینئر اساتذہ کی خدمات حاصل کرنی پڑتی ہیں۔ اس پر ہم اِسے اخبار والوں کی مبالغہ آمیزی سمجھے مگر کالج میں ہمیں ''اُردو'' کے پروفیسر ایسے ملے جو سارا سال ''رام بابا سیتا'' کو ''رام باب سکینہ'' پڑھتے اور سمجھتے رہے، مگر کسی کی توجہ نہ ہوئی کہ اِس فاش غلطی کی جانب ان کی توجہ مبذول کرائے۔ ویسے بھی وہ اپنی ہر غلطی کو کاتب، مصنف، پبلشر یا پریس کے کھاتے میں ڈال دیتے۔

تربیتی کالج میں ہمارے ''اسلامیات'' کے پروفیسر قابل تھے لیکن شاید ہم جیسے کم فہم اور معمولی طلبہ کو کچھ پڑھانا اپنی شان کے خلاف سمجھتے۔ ویسے بھی وہ ہماری نصابی کتاب کے مصنف بھی تھے اگر سب کچھ زبانی بتا دیتے تو اِن کی کتاب کون خریدتا؟ لہٰذا سرسری طور پر موضوع کا تعارف کروانے کے بعد جماعت کے سب سے ''پڑھا کو طالب علم، حفیظ بھائی کو کھڑا کر دیتے، ''ہاں بھئی! آپ اس بارے میں کیا جانتے ہیں؟'' صرف اشارے کی دیر ہوتی، حفیظ بھائی معلومات کے ایسے دریا بہاتے کہ پیریڈ ختم ہو جاتا، مگر اِن کا لیکچر ختم نہ ہوتا۔

جب یہ معمول بن گیا تو ایک دِن جماعت کے لڑکوں نے اِنہیں گھیر لیا اور کہا ''اگر ہمیں تم ہی سے پڑھنا تھا تو تمہارے گھر آ جاتے، یہاں کیوں فیس بھرتے؟ خبردار جو تم اب کسی موضوع پر بولے''۔

حفیظ بھائی اِس دھمکی سے ڈر گئے۔ اگلے دِن جب سَر نے کہا، ہاں بھئی! عقیدۂ آخرت کے متعلق آپ کیا جانتے ہیں؟'' تو حفیظ بھائی کندھے اُچکا کر بولے ''سَر مجھے کیا معلوم؟ آخر میں بھی تو اَدنیٰ سا طالب علم ہوں!'' اِس جواب کے بعد حفیظ بھائی کی آخرت کے علاوہ دُنیا بھی خاصی تاریک ہو گئی، کم از کم امتحانی نتائج کے اعتبار سے۔

''مطالعۂ پاکستان'' کی لیکچرار ایک خاتون تھیں۔ وہ پڑھانے سے زیادہ مُسکرانے پر یقین رکھتی تھیں۔ ان کی مسکراہٹ اتنی دلکش تھی کہ ان سے کوئی شکوہ شکایت کرنے کا بھی جی نہ چاہتا۔ وہ تدریس کا فریضہ بڑی سہولت سے انجام دیتیں، مثلاً کہتیں، آج ہم ''سرسیّد'' کے بارے میں پڑھیں گے۔ اس کے بعد فرماتیں، سرسیّد تو سرسیّد ہیں، سرسیّد کو کون نہیں جانتا؟ شاید ہی کوئی طالبِ علم ایسا ہو جو سرسیّد کی عظمت سے ناواقف ہو، سرسیّد اتنے بڑے آدمی تھے کہ ان کے بارے میں جو بھی کہا جائے وہ کم ہے۔ ویسے بھی آپ لوگ تو بچپن سے ہی سرسیّد کے متعلق پڑھتے رہے ہیں کہ انہوں نے مسلمانوں کے لیے تعلیمی شعبے میں کیا کچھ کیا.....! اس طرح پیریڈ ختم ہو جاتا۔

دوسرے دِن کہتیں، ''کل ہم نے سرسیّد کے بارے میں پڑھا تھا تو آج ہم اپنا اگلا ''ٹاپک'' شروع کریں گے۔ کب پڑھا تھا؟ یہ کوئی نہ پوچھ پاتا۔ اتفاق سے ہمارے نصاب میں

جتنی شخصیات شامل تھیں، وہ مشہور ہونے کے ساتھ مرحوم و مغفور بھی تھیں اور اِن کے بارے میں تقریباً سبھی نے کچھ نہ کچھ پڑھ ہی رکھا تھا لہٰذا میڈم نے ہماری معلومات میں کوئی اضافہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔

ہمارے ایک اُستاد بے تکلفانہ اور غیر رسمی ماحول میں دَرس وتدریس کے قائل تھے لہٰذا چند ہی روز میں ہمیں معلوم ہوگیا کہ ان کے بڑے بیٹے کو انڈے کی سَفیدی اور چھوٹی بیٹی کو زَردی پسند ہے۔ (گویا ایک ہی انڈے سے کام چل جاتا ہے!) وہ اپنے طرزِ تدریس کو دلچسپ بنانے کے لیے لطائف کا سہارا بھی لیتے، ہر ''پیچ'' کو وہ ایک ہی طرح کے لطیفے یہ سوچ کر سناتے کہ لطیفے پُرانے ہیں تو کیا ہوا، ''پیچ'' تو نیا ہے! مذکورہ لطائف کے بارے میں سینئرز ہمیں پہلے ہی خبردار کر چکے تھے اور یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ کن لطیفوں پر کتنی دیر ہنسنا ہے!

ویسے جماعت میں لطائف سنانے کی ایک منطقی وجہ یہ بھی تھی کہ نصاب پڑھانے کے لیے وہ اپنے گھر کے ماحول کو زیادہ سازگار پاتے۔ ساٹھ یا ستّر طلبہ کو ایک ہی جماعت میں پڑھانے یا سمجھانے کی کوشش نری حماقت ہی سمجھی جاتی لہٰذا وہ ''چلے بھی آؤ کہ ''ٹیوشن'' کا کاروبار چلے'' کے مصداق طلبہ کو اپنے گھر آنے کی کھلی دعوت دیتے تاکہ طلبہ پہ انفرادی توجہ دے سکیں۔ بقول ایک طالب علم جب کوئی اُستاد یہ کہے کہ وہ جدید ترین غیر رسمی طریقے سے پڑھائے گا تو فوراً ٹیوشن یا کوچنگ کا بندوبست کرلو اور جان لو کہ وہ کچھ نہیں پڑھائے گا۔

ہمارے ایک اور استاد بھی بے تکلفی والے اُصول کے سخت حامی تھے۔ تعارفی کلاس میں ہی موصوف نے یہ وضاحت پیش کی کہ انہوں نے ''تین شادیاں'' کیوں کیں؟ یہ بتانا اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ اگر طالبِ علم اِدھر اُدھر سے اِن کی گھریلو زندگی کے بارے میں کچھ سُنیں تو بدگمان نہ ہوں۔ اُنہوں نے بتایا کہ اساتذہ کی شخصیت کا طلبہ پر گہرا اثر پڑتا ہے! (یہ سنتے ہی طلبہ میں خوشی کی اور طالبات میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔) اِن کی کلاس کا زیادہ تر وقت تین شادیوں کے پس منظر اور اس سے پیدا شدہ پیچیدگیوں کے بیان میں گزر جاتا۔ نتیجے میں ظاہر ہے کہ کافی بے تکلفی پیدا ہوگئی اور طلبہ انہیں منہ پر بُرا بھلا کہنے لگے۔

ہمارے پرنسپل محترم نہایت منکسر المزاج اور نرم خو آدمی تھے۔ جس طرح پانچوں اُنگلیاں برابر نہیں ہوتیں، اسی طرح ہمارے کالج کے سب اَساتذہ ایک جیسے نہ تھے۔ کچھ واقعی ''اُستاد'' کہلانے کے مستحق تھے اور نہایت عرق ریزی سے پڑھاتے۔ اِن میں دو اساتذہ ڈسپلن کے معاملے میں نہایت سخت گیر تھے۔ کالج میں جو تھوڑا بہت نظم وضبط تھا، وہ ان ہی کی بدولت تھا۔ گو اس سلسلے میں اکثر طلبہ کی کارروائیوں کا نشانہ بنتے۔

ہمارے اساتذہ کی پسند ناپسند، معیار اور نظریات میں حیرت انگیز تضاد پایا جاتا تھا، جس کے باعث طلبہ چکرا کر رہ جاتے۔ بعض اساتذہ کہتے کہ میرا لیکچر اتنا بھرپور اور جامع ہوتا ہے کہ امتحان میں صرف یہی لکھنا کافی ہے۔ اِدھر اُدھر کھپانے کی کیا ضرورت ہے؟ ایک پروفیسر صاحب کا کہنا تھا ''کل آپ کی امتحانی کاپی میں اپنا لیکچر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ نے میرا پورا لیکچر بالکل ٹھیک اُتار لیا تھا مگر آپ خود ہی سوچیے کہ میں اپنے ہی لیکچر پر کتنے نمبر دوں؟ اور لیکچر میرا ہے تو نمبر آپ کو کیوں دوں؟

ایک اُستاد فرماتے ''جب میں لیکچر دیتا ہوں تو سب سر جھکا کر لکھنے میں مصروف ہوجاتے ہیں، لگتا ہے میں دیواروں سے باتیں کر رہا ہوں۔ ٹائپسٹ بن کر بیٹھنے کی ضرورت نہیں، خبردار جو ایک لفظ بھی نوٹ کیا۔''

جب کہ دوسرے اُستاد کہتے ''واہ بھئی! بڑے اَفلاطون اور اَرسطو ہیں آپ کہ بغیر کچھ نوٹ کیے سب ذہن نشین کرلیں گے اگر اتنے ہی ذہین ہیں تو یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

کچھ اساتذہ کاپیاں تول کر نمبر دینے پر یقین رکھتے اور

کچھ کم سے کم الفاظ پر، یعنی کاپی جتنی خالی ہوگی نمبر اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔ زیادہ لکھنے کا سب سے بڑا نقصان ممتحن کو پہنچتا ہے، اِسے زیادہ پڑھنا پڑتا ہے اور اگر اِسے زیادہ پڑھنے پڑھانے کا شوق ہوتا تو وہ ممتحن کیوں بنتا؟ طالب علم ہی کیوں نہ رہتا؟

ہمارے کالج میں ہمہ وقت ایمرجنسی لگے رہنے کا گمان ہوتا۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے کہیں بم پھٹنے والا ہو یا کالج کی چھت کسی بھی وقت گرنے والی ہو اور ہماری لامحدود صلاحیتوں کی جانچ کے لیے وقت بہت کم رہ گیا ہو۔ چناں چہ ہمیں حکم دیا جاتا کہ تیس دِن کے اندر اندر دس مختلف مضامین کے اسائنمنٹس جمع کروادیں یا فوراً جا کر کسی دُور افتادہ اسکول میں چالیس ''سبق'' دے آئیں۔ ساتھ ہی فارغ اوقات میں جہاں تک ہوسکے چارٹس، نقشے اور ماڈلز بناتے رہیں!

کام تھوک کے حساب سے اس لیے دیا جاتا کہ معلوم ہو سکے کہ طلبہ میں بیک وقت کتنی چیزوں کا ''بیڑا غَرق'' کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ طلبہ کے دیے گئے اسائنمنٹس انہیں واپس بھی نہ کیے جاتے مبادا وہ خیر سگالی کے جَذبے کے تحت جونیئر طلبہ کو دے ڈالیں۔ یہ اور بات کہ بعد میں یہ ''خدمت'' بعض فیض اساتذہ اپنے مبارک ہاتھوں سے انجام دے ڈالتے۔ اِن کے کمروں میں ریکوں پر چھت سے جا لگنے والی ''فائلیں'' بہ زبانِ خود کہتی دکھائی دیتیں کہ،

جو بڑھ کر تھام لے ساغر اُسی کا ہے!

اسائنمنٹس ملتے ہی طلبہ کی اکثریت لائبریریوں کی خاک چھاننے میں مصروف ہوجاتی۔ کالج انتظامیہ کی پوری کوشش ہوتی کہ طلبہ کو کالج کی لائبریری سے کوئی کتاب فراہم نہ ہونے پائے، کیوں کہ انہیں خدشہ تھا کہ اس طرح طلبہ سہل پسندی کا شکار نہ ہوجائیں۔ ہمارے کالج میں ایک معقول تعداد ایسے طلبہ کی بھی تھی جو ریفرنس بُک کی تلاش تو دُور کی بات، نصابی کتب کی خریداری تک اپنی شان کے خلاف سمجھتے۔

یہ طلبہ سارا سال نہایت بے فکری اور بے نیازی کا مظاہرہ کرتے لیکن شاید ممتحن حضرات سب کو ایک آنکھ سے دیکھنے کے قائل تھے، یا پھر دونوں آنکھیں بند کر کے نتائج کی تیاری کرتے تھے، کیوں کہ جب نتیجے کا اعلان ہوا تو حیرت انگیز طور پر اوّل الذّکر اور آخر الذّکر طلبہ کے نتائج میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ پڑھائی میں دِن رات ایک کرنے والے طالب علموں نے اِس وقت خود کو خاصا احمق محسوس کیا..... جو وہ تھے!

نئے پرانے

گھروندے نئے ہیں، گھرانے نئے ہیں
مکینوں میں شامل پرانے نئے ہیں
نئے آسماں ہیں، نئی وسعتیں ہیں
پکھیرو نئے آشیانے نئے ہیں
پرانے جو احمق تھے ان کی جگہ پر
جدھر دیکھتے ہیں سیانے نئے ہیں
مفاسد کے سارے سرغنے وہی ہیں
نبرد آزما ان سے تھانے نئے ہیں
مٹے لوحِ عالم سے قصّے پرانے
نئے دور کے سب فسانے نئے ہیں
نہ پُورا ہوا ان کا کوئی بھی وعدہ
نرالے ہیں، حیلے بہانے نئے ہیں
نئی ایک دُنیا ہے خادم جہاں پر
نئی چاہتیں دوستانے نئے ہیں

(خادم بلاغوی، اسلام آباد)

دیارِ غیر سے

وہ پولیس ہیڈ کوارٹر کے بڑے دروازے کی سیڑھیوں کے قریب یوں سر جھکائے بیٹھا تھا جیسے ابھی ابھی قے کر دے گا۔ عمر پچاس پچپن برس کے لگ بھگ ہوگی۔ میں نے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے اسے سہارا دے کر اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔ ''کیا بات ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟'' میں نے پوچھا۔

ہوئے مَر کے ہم جو رُسوا!

لالچ کے گرداب میں پھنسے ایک لوبھی کا طرح دار فسانہ

اس نے عظیم پدرانہ جذبے کو بھی کاروبار بناڈالا

نصر ملک

''ہاں! بس ذرا چکر سا آ گیا تھا۔'' وہ مجھے دیکھتے ہوئے نحیف آواز میں بولا جسے میں بمشکل سن پایا۔ اب وہ مسلسل کھانس رہا تھا۔ میں اسے سہارا دیتے ہوئے سیڑھیوں سے ذرا پرے ایک طرف لے گیا ''کیا آپ نے پولیس ہیڈ کوارٹر جانا ہے یا وہاں سے فارغ ہوگئے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں! میں وہاں سے ہو آیا ہوں' اب گھر جاؤں گا، یہاں بس اسٹاپ تک پہنچ جاؤں تو پھر مشکل نہیں ہوگی۔'' وہ بولا۔ بظاہر اس کے چہرے پر کچھ پریشانی کے آثار ضرور تھے لیکن میں نے دیکھا کہ آنکھوں میں ایک طرح کی خوشی بھی جھلک رہی تھی۔ پولیس ہیڈ کوارٹر میں غیر ملکیوں کے امور سے متعلقہ محکمے والے ہمارے ساتھ جس طرح کا اب برتاؤ کرنے لگے تھے' اس کا تذکرہ ہم غیر ملکیوں کے ہاں روزمرہ کا موضوع گفتگو بن چکا تھا۔ میں بھی آج وہاں اپنے ایک دوست کے کچھ کاغذات جمع کروانے آیا تھا۔ وہ خود کام پر تھا اور میری ڈیوٹی شام کی تھی' اسی لیے یہ ذمہ داری اس نے مجھے سونپ دی۔ دوست کے کاغذات جمع کروانے کے بعد پولیس ہیڈ کوارٹرز سے باہر نکل کر کار کی طرف مڑنے ہی والا تھا کہ میری نظر اس پر پڑی۔ وہ پنجوں کے بل، کمر جھکائے، چار کا ہندسہ بنے، سر لٹکائے یوں بیٹھا تھا جیسے قے کرنے والا ہو اور ابھی منہ کے بل گر جائے گا۔

میں نے اسے سہارا دے کر اوپر اٹھایا تو وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے ساتھ ہولیا۔ ''آپ نے کہاں جانا ہے؟'' میں

نے اسے سر سے پاؤں تک ایک طرح دیکھتے ہوئے پوچھا۔ پولیس ہیڈ کوارٹر میں آنے اور وہاں گھنٹا آدھا گھنٹا انتظار کرنے اور پھر پندرہ بیس منٹ پولیس والوں کے ساتھ سوال و جواب کے بعد ہم میں سے اکثر نجانے کیوں خوف کا شکار ہو جاتے ہیں؟ میرے ذہن میں خیال آیا۔ ''مجھے تو کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا۔ میں اپنے آپ ہی بڑبڑایا۔

''کیا آپ نے کچھ کہا؟'' اس نے پوچھا۔ وہ ابھی تک آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا لیکن اب اپنی کھانسی پر قابو پا چکا تھا۔

''آپ نے کہاں جانا ہے۔ اگر کہیں قریب ہی رہتے ہیں تو میرے پاس کار ہے' میں چھوڑ آتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''یہ تو بہت مہربانی ہوگی۔ میں زیادہ دور نہیں رہتا۔ نیرو پورٹ ریلوے اسٹیشن سے سیدھا بائیں ہاتھ آگے نکلتے ہوئے نیرو برو میں قیام ہے۔ میرا نام غلام قادر ہے''۔ وہ پھر کھانسنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد بولا ''میں سیالکوٹ سے ہوں، دراصل فوج میں ہوا کرتا تھا۔ بیمار رہنے لگا تو ڈسچارج لے لیا اور روزگار کے لیے ادھر ادھر سے ہوتا ڈنمارک آ گیا۔ دمے کا دورہ تو اب بھی پڑتا ہے لیکن اچھا علاج بروقت یہاں مل جاتا ہے۔ آپ کہاں سے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ اب وہ قدرے سنبھل چکا تھا اور میں نے دیکھا کہ وہ اپنی نقاہت کے باوجود اب قدرے تیز چلنے لگا تھا۔ مجھے اس کے چلنے سے ''لفٹ رائٹ، لفٹ رائٹ'' کی آواز آنے کا گمان ہوا اور میں اس پر توجہ ہی نہ دے سکا کہ اس نے کیا پوچھا تھا۔

''یہ رہی میری کار، ٹھہریے میں دروازہ کھولتا ہوں۔'' میں نے کار کے پیچھے سے ہوتے ہوئے بائیں ہاتھ کا دروازہ کھولا اور پھر سٹیرنگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے دایاں دروازہ کھول دیا۔ ''آیئے تشریف رکھیے'' میں نے کہا۔ وہ میرے ساتھ والی سامنے کی سیٹ پر بیٹھ گیا

''ہم وطنوں کا یہ تو فائدہ ہے'' وہ بولا۔ ''آپ کہاں سے ہیں؟'' اس نے کار کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ یہ کتنے میں لی ہوئی ہے؟''

''میں گوجرانوالا سے ہوں'' میں نے جواب دیتے ہوئے دوسرے سوال کو جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا۔ کار سٹارٹ کر کے اس کے بتائے ہوئے راستے کے متعلق ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ وہ بولا ''اگر آپ ادھر الٹے ہاتھ سے لے کر پھر سامنے آنے والی بتیوں سے سیدھے ہاتھ لے لیں تو آسانی رہے گی۔'' وہ اشارے سے مجھے راہ دکھانے لگا۔

میں اب اس کے بتائے ہوئے راستے پر کار چلائے جا رہا تھا۔ ''آپ کا نام صدیق تو نہیں؟'' اس نے پہلی بار مجھے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے رشید کہتے ہیں'' میں بولا

''اچھا رشید صاحب! میں سمجھا آپ صدیق ہیں۔ دراصل میں مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنے جاتا ہوں۔ وہاں ایک لڑکا آپ ہی کی عمر کا آتا ہے' شکل وصورت بھی آپ ہی سے ملتی ہے۔ بڑا ہی نیک ہے' عزت کرنے والا۔ میں سمجھا آپ وہی صدیق ہیں۔ میری اس سے کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ اب تو عرصہ ہوا نظر نہیں آیا'' وہ بولا۔ میں خاموش رہا۔ ابھی کار کا رخ موڑنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ پھر بولا:

''آپ پولیس ہیڈ کوارٹر میں کام کرتے ہیں یا کوئی ویزے وغیرہ کا چکر تھا؟''

''ایک دوست کے کچھ کاغذات جمع کروانے تھے'' میں نے جواب دیا۔ ''آپ کو کیا کام تھا؟''

''میں سمجھا آپ وہاں ملازم ہیں۔ میں تو ایک کام کے سلسلے میں گیا تھا۔ گیا کیا بلایا گیا تھا۔ رشید صاحب! وہاں تین چار پاکستانی و بھارتی بھی ہیں۔ ترجمان کا کام کرتے ہیں، آپ نے بھی دیکھا ہوگا شکلوں سے تو پتا نہیں چلتا کون پاکستانی ہے کون ہندوستانی لیکن جب پولیس والا کوئی سوال کر

رہا ہو اور ترجمہ کرنے والا پولیس والا ہی لب ولہجہ اپنا لے تو سمجھ لو وہ سالا بھارتی ہے۔ یہ میرا تجربہ ہے۔'' اس نے کار کے ایش ٹرے میں سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی، کاش ہمیں بھی ڈینش یا کم از کم اتنی انگریزی آتی ہوتی کہ اپنی بات تو خود کر سکتے، میں کوئی دو تین مرتبہ گیا ہوں وہاں۔ اب بھی ان کی چٹھی آئی تھی۔ آج تاریخ تھی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے!'' اس نے کھانسی کی۔

''کیا کوئی ویزے کا مسئلہ تھا یا ورک پرمٹ کا؟'' میں نے سٹیرنگ سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

''میرا تو جی پکا ویزا لگا ہوا ہے'' اس نے زور دیتے ہوئے کہا اور سر گھما کر ایک طرح سے میرا جائزہ لیتے ہوا بولا۔ ''میرے بیٹے کا معاملہ تھا۔ دراصل کسی نے میرے خلاف خواہ مخواہ مخبری کر دی اور میں اس کا خمیازہ بھگت رہا ہوں۔'' پھر کھانستے ہوئے بولا۔ ''میرے سارے کاغذات درست ہیں لیکن یہ پولیس والے کہتے تھے کہ ''وسیم'' کو ''پکا ویزا'' دینے کا اپنا فیصلہ وہ تبھی کریں گے جب انہیں اسلام آباد سے ڈینش سفارت خانے کی رپورٹ مل جائے گی۔ آج اسی بارے میں انہوں نے مجھے بلایا تھا۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے رشید صاحب، یہ آفت سر سے ٹل گئی، میں نے تو داتا دربار اور بابے شاہ کے مزار پر صدقہ اتارنے کی نیت باندھ رکھی ہے۔ دیکھو اب کب پاکستان جانا ہوتا ہے!''

''ویزہ پکا کرنے کے لیے پولیس والے اسلام آباد میں ڈینش سفارت خانے سے رپورٹ لیں گے۔ وہ کیوں؟'' میں نے بڑے تجسس سے پوچھا۔

''اوہ رشید صاحب!'' وہ بولا ''بات دراصل یہ ہے کہ میں خود جب یہاں آیا تو کوئی تین سال بعد میں نے اپنی بیوی اور دو بچیوں کو یہاں بلوا لیا۔ یہ دونوں ابھی چھوٹی تھیں۔ وسیم میٹرک میں پڑھتا تھا۔ میں نے سوچا' میٹرک کر لے تو پھر بلا لوں گا۔ ہم سیالکوٹ ضلع کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے ہیں۔ وسیم سیالکوٹ میں اپنے چچا کے پاس شروع سے رہتا رہا ہے۔ پچھلے سال اس نے وہیں سے میٹرک بھی پاس کر لیا تو میں نے اسے اپنے پاس یہاں بلوا لیا۔ ویزے وغیرہ میں کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ اس نے آتے ہی میرے ساتھ فیکٹری میں کام بھی شروع کر دیا لیکن چھ مہینے بعد جب میں اس کا ویزا پکا کروانے پولیس والوں کے ہاں گیا تو انہوں نے اس کا پاسپورٹ اپنے پاس رکھ مجھے ایک رسید دے دی اور کہا کہ ویزے کے بارے میں وہ خود بعد میں خط لکھیں گے۔

مجھے تو وہیں دال میں کچھ کالا نظر آنے لگا لیکن گھر آ گیا۔ پھر پندرہ دن بعد پولیس والوں کا ایک خط ملا کہ میں ان کے دفتر میں حاضر ہو جاؤں''۔ اس نے ایک لمبا سانس لے کر گلا صاف کیا اور پھر اپنی بات جاری رکھی۔ ''وہ جو لمبا سا، ہلدی رنگا بھارتی وہاں کام کرتا ہے نا، وہ پولیس اور میرے درمیان ترجمانی کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا ''آیا وسیم میرا حقیقی بیٹا ہے؟'' معاملہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ ''ہاں، ہاں! میں ہی تو وسیم کا باپ ہوں!'' میں نے زور دیتے ہوئے پوچھا۔ ''بات کیا ہے؟''

''مسٹر غلام قادر بات یہ نہیں کہ تم وسیم کے باپ ہو یا نہیں! سوال یہ ہے کہ کیا وہ تمہارا حقیقی بیٹا ہے؟'' اس ترجمان نے مجھے گھورتے ہوئے پولیس افسر کے الفاظ دھرائے۔ ''ہماری اطلاعات کے مطابق وسیم تمہارا بیٹا ہی نہیں بلکہ یہ تمہارے دور کے ایک رشتے دار کا بیٹا ہے اور تم نے اس کے باپ سے نہ صرف بھاری رقم لے کر اسے اپنا بیٹا بنا کر یہاں بلوا لیا بلکہ ہمیں پتا چلا ہے کہ تم اس کی تنخواہ بھی ہضم کر جاتے ہو۔ کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' پولیس افسر اپنے سامنے کچھ کاغذ پھیلائے بیٹھا تھا۔ وہ بھارتی ترجمان کے ذریعے مجھ سے بات چیت کر رہا تھا۔

''رشید بھائی، یہ گورے، گورے ہی ہوتے ہیں۔ اب دیکھو ان ڈینش پولیس والوں نے بھی برطانیہ کی طرح

پاکستانیوں کے لیے پاکستانی اور ہندوستانیوں کے لیے پاکستانی، اردو پنجابی ترجمان رکھے ہوئے ہیں اور یہ ترجمان بھی تو کچھ کم نہیں ہیں۔ ترجمہ کرتے وقت خود کو پولیس افسر سے بھی اوپر والا سمجھتے ہیں۔ یہ اپنی اصلیت بھول چکے۔'' اپنی گفتگو کے دوران وہ وقفے وقفے سے کھانس بھی رہا تھا۔ ''میں نے اس بھارتی بنیے کو بہت سمجھایا کہ وہ پولیس افسر کو بتائے کہ وسیم میرا ہی بیٹا ہے اور یہ غلط ہے کہ میں نے اسے جعلی بیٹا بنا کر یہاں بلوایا اور پاکستان میں کسی سے کوئی رقم وصول کی ہے۔ رشید صاحب، پولیس افسر کو تو چھوڑیے وہ ترجمان بار بار زور دے رہا تھا کہ میں مان لوں' شاید یہ معاف کر دیں۔ ان کے پاس ثبوت ہیں کہ وسیم کسی اور کا بیٹا ہے۔ یہ دو ہفتے پہلے کی بات ہے۔'' وہ بولا۔ اب ہم یا کٹوائے کے قریب پہنچ چکے تھے ''سیدھا چلوں یا کیسے؟'' میں نے گاڑی کی رفتار کم کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں ابھی تو نیرو برو نہیں آیا۔ بس سیدھا چلیں۔ میں بتا دوں گا کہاں سے مڑنا ہے!'' وہ بولا اور اپنی گھڑی پر وقت دیکھنے لگا۔

''آپ کو کس وقت کام پر جانا ہے'' اس نے پوچھا۔

''جی شام کی ڈیوٹی ہے' ساڑھے تین بجے سے دس بجے رات تک۔'' میں نے کہا۔

''اوہ ابھی تو صرف سوا گیارہ ہوئے ہیں۔'' وہ پھر اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے بولا ''رشید صاحب! یہ اپنے کسی جاننے والے ہی کی کرتوت ہو سکتی ہے ورنہ پولیس والوں کو کیا پڑی تھی کہ خواہ مخواہ تفتیش کرتے پھرتے۔'' اس نے ٹھنڈی آہ بھری ''ہم لوگ کمینگی کی حد تک حسد کرتے ہیں' ومن حاد اذا حسد اس نے آیت پڑھ کر خود پر پھونک ماری۔ بہرحال! رشید بھائی' آج تو میں نے ان کو ثبوت دے کر خاموش کر دیا۔ ان کے مطالبے پر میں نے وسیم کی پیدائش اور اسکول چھوڑنے کے سرٹیفکیٹ ان کے حوالے کر دیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بڑا مہربان ہے۔'' وہ بولا۔ اور اپنی بات جاری رکھی۔ ''رشید بھائی پاکستان میں رشوت بہت ہو گئی ہے۔ وہ تو بھلا ہو اپنے کونسلر صاحب کا اپنی برادری سے ہیں، کمیٹی والے چھ ہزار روپے فیس مانگتے تھے۔ یار باہر رہنے والوں کی تو یہ افسر شاہی والے کھال ادھیڑ لیتے ہیں۔ پانچ ہزار میں بنے ہیں یہ دونوں سرٹیفکیٹ۔ تھوڑا آگے چل کر سامنے والی بتی سے دائیں طرف مڑتے ہوئے پھر سیدھا لے لینا۔ اب ہم کچھ زیادہ دور نہیں ہیں گھر سے۔'' اس نے کار کے دروازے کا شیشہ نیچے کر کے باہر سڑک پر تھوکتے ہوئے کہا۔

''آپ کام کہاں کرتے ہیں؟''

''جی پیٹریس میں جہاں لاؤڈ اسپیکر بنتے ہیں۔'' میں بولا۔ ''یہاں سے کافی دور ہے''

''کار ہونے کا یہی تو فائدہ ہے، وہاں ہمارے سیالکوٹ کے بھی تو دو تین آدمی کام کرتے ہیں، عظمت، ابراہیم اور وہ اپنا خواجہ! کیا آپ انہیں جانتے ہیں؟'' وہ بولا۔

''شاید چہروں سے دیکھے ہوں۔ دراصل میں شروع ہی سے وہاں شام کی ڈیوٹی کرتا ہوں۔ میرے ساتھ یوگوسلاویہ کے کچھ لوگ ہیں۔ اپنا تو صرف ایک ہی پاکستانی ہے، کراچی سے۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر اب پولیس والوں نے کیا کہا ہے؟ کام تو ہو گیا نا۔'' میں نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

''ہونا کیا تھا!'' وہ بولا۔ ''پولیس والوں نے وسیم کے پیدائش اور اسکول چھوڑنے کے سرٹیفکیٹ مانگے اور کہا کہ یہ پاکستانی وزارت خارجہ سے تصدیق شدہ ہوں تو پھر وہ دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔ جیسا میں نے ابھی آپ کو بتایا تھا کہ یہ دونوں سرٹیفکیٹ میں نے پاکستان میں اپنے رشتہ داروں کی مدد سے بنوا لیے۔ انہیں اسلام آباد میں وزارت خارجہ کے متعلقہ محکمہ سے بھی تصدیق کروا لیا اور یہاں کوپن ہیگن میں پاکستانی سفارت خانے والوں نے تو پھر نہ چیں کی نہ چوں اور

آج جب میں پولیس ہیڈ کوارٹر میں گیا اور اپنی باری آنے پر انہیں پولیس والوں کو پیش کیا تو رشید صاحب آپ یقین کریں' پولیس والے سے کہیں زیادہ وہ ہندو لمبا تڑنگا جوان مجھے گھور رہا تھا۔ پولیس والے نے تو صرف اتنا کہا "قادر تم بھی جانتے ہو اور ہمیں بھی علم ہے وسیم تمہارا بیٹا نہیں لیکن اب تم یہ سرٹیفکیٹ لے آئے ہو۔ ہم قانونی مجبوری کے تحت انہیں قبول کر رہے ہیں۔ رشید صاحب جب وہ بھارتی ترجمہ کر رہا تھا تو اس کا غصہ دیکھنے والا تھا۔ بھلا یہ بنیے ہم مسلمانوں کو کہیں آگے بڑھتا دیکھ سکتے ہیں؟ ہاں تو پھر کوئی دس پندرہ منٹ سوال و جواب کے بعد، پولیس والوں نے مجھے کرسی پر بیٹھ جانے کو کہا اور اپنے میز کی دراز سے ایک فائل نکال کر اس میں سے وسیم کا پاسپورٹ نکالا۔ مجھے دیکھتے ہوئے اس میں میرے سامنے کچھ لکھا پھر اس پر ویزے کی پکی مہر لگا دی اور میرے حوالے کر دیا۔ "یہ او کے ہے"۔ اس نے کہا۔ رشید صاحب اب تو یہ ڈینش بھی اتنی اردو بولنے لگے ہیں۔

اب ہم نیرو بروک کے قریب پہنچ چکے تھے۔ وہ بولا۔ "جی تو نہیں کرتا۔ آپ نے پہلے ہی زحمت کی ہے مگر یہ بڑا احسان ہو گا۔ یہاں اپنی ایک دیسی دکان ہے۔ برا نہ مانیں تو وہاں سے دو منٹ میں کچھ سودا اٹھا لوں۔ اب گھر دور نہیں۔ آپ کی مہربانی ہو گی۔ بس یہاں بازو میں کھڑی کر لیں۔ وہ دیکھیں سامنے وہ دکان ہے۔ میں بس دو منٹ میں آیا۔" میں کار کھڑی کر چکا تھا۔ وہ کار سے نکل کر چھلاوے کی طرح دکان میں جا گھسا۔ "اف میرے اللہ" وہ آٹے کی ایک چھوٹی بوری کمر پر لادے آ رہا تھا۔ "کیا مشکل میں پھنسا لیا ہے میں نے خود کو" ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں خیال آیا کہ کار اسٹارٹ کر کے چلا جاؤں مگر پھر نجانے کیوں میں نے خود ہی نیچے اتر کر ڈگی کا دروازہ کھول دیا۔

وہ آٹے کی بوری ڈگی میں رکھ کر اپنے کپڑے جھاڑ رہا تھا اور میں اپنی سیٹ پر آن بیٹھا۔ "کتنی دور ہے اب آپ کا گھر یہاں سے؟" جونہی وہ کار میں بیٹھا میں نے پوچھا۔ میرے لہجے میں اکتاہٹ تھی۔ "اب یہ سامنے والی بتی سے سیدھے ہاتھ لے لیں۔ کچھ زیادہ دور نہیں' بس پانچ دس منٹ لگیں گے۔ میں نے ٹریفک لائٹ سے جونہی گاڑی اس کے بتائے ہوئے راستے پر موڑی وہ پھر بولا:

"رشید صاحب! اللہ کی ذات پر یقین ہو تو سب کام ہو جاتے ہیں۔ میرے جاننے والے کہتے تھے' وسیم کا ویزا نہیں لگے گا۔ یہ ڈینش پولیس والے بڑے خبیث ہیں۔ ذرا شک ہو جائے تو کئی کئی ماہ بلکہ سال تفتیش کرتے رہتے ہیں۔ اب روپیا تو پانچ چھ ہزار پاکستان میں لگ گیا مگر وسیم کی زندگی تو بن گئی۔ داتا بڑا گنج بخش ہے' دعا کریں میں اپنی منت پوری کر سکوں۔ وہ اب پھر کھانسنے لگا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ پیٹ کی دونوں جانب اپنی پسلیوں پر رکھے ہوئے تھے۔ کھوں۔ کھوں۔ غوں۔ کھوں!"

ابھی ہم تھوڑا ہی آگے بڑھے تھے کہ اس نے ایک بلڈنگ کے سامنے مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ "یہ رہا میرا گھر"۔ وہ بولا۔ میں نے کار کھڑی کر کے ڈگی کھولی۔ ابھی وہ آٹے کی بوری اٹھانے ہی والا تھا کہ ادھر سے اٹھارہ انیس برس کا ایک پاکستانی دکھائی دیتا نوجوان لڑکا اچانک نمودار ہوا۔ "چاچا جی ویزے کا کیا بنا؟" اس نے بڑھتے ہوئے قادر خان سے پوچھا۔ "پہلے یہ بوری اٹھاؤ پھر بتاتا ہوں۔ بھائی صاحب کو جلدی جانا ہے۔" قادر خان نے لڑکے سے کہا۔

"کیا ویزا مل گیا؟" لڑکے نے قادر خان کی بات نظر انداز کرتے ہوئے قدرے زور سے پوچھا۔ اسے شاید میری موجودگی کا بھی احساس نہیں تھا۔

"ہاں بھئی۔ وسیم مبارک ہو۔ یہ لو پاسپورٹ۔ مبارک ہو بیٹا۔ یہ بوری اٹھاؤ اب۔" قادر خان ابھی اپنی بات پوری بھی نہیں کر پایا تھا کہ وسیم نے آگے بڑھ کر ایک طرح سے اس کے ہاتھ سے اپنا پاسپورٹ چھین لیا۔ "بوری اٹھاؤ۔" لڑکے

نے زور سے زمین پر تھوکا اور بندر کی طرح اچھلتا کودتا یہ جا وہ جا ہو گیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو قادر خان کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور وہ بے تحاشا کھانس رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ اس کی طبیعت بری طرح خراب دکھائی دینے لگی تھی۔ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے میں نے خود ہی آٹے کی بوری اٹھالی۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے مجھے گھر کا دروازہ دکھایا۔ خود میرے پیچھے پیچھے آنے لگا۔

"کون ہے؟" اندر سے آواز آئی۔

"میں ہوں رخسانہ بیٹی' دروازہ کھولو" وہ بولا اور پھر دروازہ کھلنے کے ساتھ ہی پہلے وہ اندر داخل ہوا۔ ابھی میں بوری اٹھا کر اندر لے جانے ہی والا تھا کہ وہ چکرا کر گر پڑا۔ میں نے بڑی پھرتی سے بوری کو اندر گھسیٹا اور اسے اٹھا کر صوفے پر ڈال دیا۔ وہ لڑکی جس نے دروازہ کھولا تھا' رونے پیٹنے لگی۔ ساتھ والے کمرے سے ایک خاتون بھی ڈرائنگ روم میں آ کر ہائے ہائے ہو ہو کرتی قادر خان پر جھک گئی۔ میں نے اندازہ لگا لیا یہ اس کی بیوی ہی تھی۔ "میرے خیال میں ان کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ ڈاکٹر کو یہیں بلا لیں تو بہتر رہے گا۔" میں نے کھڑے کھڑے مشورہ دیا۔

"نہیں بھائی صاحب۔ فیملی ڈاکٹر نہیں ایسے موقع پر ہم ہمیشہ ایمبولینس بلاتے ہیں۔ خود ڈاکٹروں نے کہہ رکھا ہے" وہ خاتون بولی۔ "رخسانہ بیٹی ذرا دیکھو تو وہ وسیما کم بخت کہاں ہے؟ ابھی یہیں تھا۔"

"دیکھیے آپ اطمینان رکھیے! لائیے مجھے فون دے دیجیے میں ایمبولینس والوں کو بلا دیتا ہوں۔ آپ کا پتا کیا ہے؟"۔ میں نے کہا۔

"وہ فون رکھا ہے اور، یہ ہے ہمارا پتا" رخسانہ نے مجھے اپنا شناختی کارڈ دیتے ہوئے فون کی طرف اشارہ کیا۔ قادر خان ابھی تک صوفے پر لیٹا ہوا کھانس رہا تھا۔ میں نے صفر، صفر، صفر گھما کر ایمرجنسی والوں کو ایمبولینس بھجوانے کا کہا۔ انہوں نے پتا اور فون نمبر پوچھا جو میں نے بتا دیے۔ "آپ اطمینان رکھیے، مریض کے پاس ہی رہیے ہم ابھی پہنچ رہے ہیں۔" ایمرجنسی کے ڈیوٹی پر موجود آدمی نے اتنا کہہ کر فون بند کر دیا۔

"بہن جی' مجھے افسوس ہے' میں رک نہیں سکتا۔ مجھے کام پر جانا ہے۔ لیکن فکر نہ کریں ایمبولینس آنے والی ہے۔" یہ کہہ کر میں نے قادر کی طرف دیکھا' وہ آنکھیں بند کیے جوں کا توں پڑا تھا۔

"اللہ تعالیٰ خیر کرے۔ آج پولیس اسٹیشن گئے تھے پتا نہیں وہاں کوئی صدمہ نہ لگا ہو" اس کی بیوی بولی۔ "بھائی صاحب آپ کے پاس ہمارا پتا اور فون تو اب ہے ہی کسی روز ضرور آئیے گا۔" اس نے کہا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ خدا حافظ کہتا ہوا میں وہاں سے نکلا اور کار میں آن بیٹھا۔ کار سٹارٹ کر کے جونہی میں نے اسے سڑک پر ڈالا' مجھے اپنے پیچھے سے ایمبولینس کے ہارن کی آواز سنائی دینے لگی۔

فیکٹری پہنچ کر میں نے اپنے کپڑے بدلے اور حسب معمول اپنے کام میں لگ گیا۔ رات کو جب گھر پہنچا تو مجھے قادر خان کا خیال آیا۔ دوسرے دن جب نیند سے صبح بیدار ہوا تو پھر مجھے قادر خان یاد آ گیا۔ "پتا نہیں بے چارے کا کیا حال ہے؟" میں نے سوچا اور اس کے گھر فون ملا دیا۔ "ہیلو، یہ خان کا گھر ہے" ادھر سے ٹیلی فون پر کوئی مرد بول رہا تھا آواز بھاری لیکن پژمردہ سنائی دی۔ میں سمجھا قادر خان ہیں۔ "کہو قادر صاحب' کیا حال ہے۔ میں رشید بول رہا ہوں۔ کل آپ کو گھر چھوڑ گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"جی رشید صاحب۔ قادر صاحب آج صبح اللہ کو پیارے ہو گئے۔ میں ان کا پڑوسی' شمس راجپوت بول رہا ہوں" میں ایک لمحے تک ویسے ہی خاموش رہ گیا پھر حیرت سے پوچھا "جی آپ کا مطلب ہے' قادر خان۔ و۔ فا۔ ت۔ پا گئے ہیں۔" "میری بات ادھوری ہی رہ گئی۔

"جی انہیں کل دمے کا دورہ پڑا تھا۔ دراصل وہ دمے نہیں دل کا دورہ تھا۔ ایمبولینس تو آئی لیکن وہ ہسپتال جاتے ہوئے دم توڑ گئے۔ پرسوں جمعہ کے روز مسجد میں صبح آٹھ بجے جنازہ ہوگا۔" ادھر سے فون پر آواز آئی۔

"خیر جو اللہ کو منظور تھا ہو گیا۔ بھابھی سے میرا افسوس کہہ دینا۔ میں رشید بول رہا ہوں۔ پرسوں جنازے پہ آؤں گا۔" میں نے فون بند کر دیا۔

☆☆

آج قادر خان کی نماز جنازہ ادا کی جانی تھی۔ میں صبح ہی اٹھ گیا اور نہا کر تیار ہونے لگا۔ میری سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسے موقع پر کیا کیا جاتا ہے۔ بہرحال میں نے کپڑے پہنے، کچھ خوشبو لگائی۔ کار نکالی اور مسجد کی طرف ڈرائیو کرنے لگا۔ میں نے آج کام سے چھٹی کر لی تھی۔

مسجد کے قریب سڑک کنارے کار کھڑی کر کے جونہی اندر داخل ہوا تو صحن میں بیس پچیس آدمیوں کو صف بندی میں مصروف پایا۔ امام صاحب نے پہلے تو باآواز بلند نماز جنازہ ادا کرنے کا طریقہ بتایا اور پھر صفوں پر نظر ڈالی۔ میں بھی پیچھے والی صف میں کھڑا ہو چکا تھا۔ امام صاحب کو نماز جنازہ پڑھانے میں دس منٹ لگے گے۔ یہ فریضہ ادا ہوتے ہی میت کے چہرے سے کفن کا پردہ ہٹا دیا گیا تھا۔ اب کچھ لوگ اس پر جھکے ہوئے تھے۔ "بڑا قیمتی تابوت ہے!" کسی نے دوسرے سے سرگوشی کی۔

"بھئی جلدی جلدی دیکھ لیں۔ ابھی ائیر پورٹ بھی جانا ہے۔ ساڑھے دو بجے والی فلائیٹ ہے!" کسی کی آواز آئی۔

"کیا میت پاکستان لے جائیں گے" میرے قریب کھڑے دو آدمیوں نے آپس میں بات چیت کی۔

"جی ہاں۔"

میں ابھی وہاں سے جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ میری نظر ذرا پرے کھڑے ہوئے ایک اپنی ہی عمر کے نوجوان پر پڑی اور پھر وہیں رک گئی۔ وہ کسی گہری سوچ میں پڑا دکھائی دیتا تھا۔ گردن لٹکائے نیچے دیکھتے ہوئے اپنے ایک پاؤں کے جوتے کی نوک سے زمین پر کچھ لائنیں سی بنا رہا تھا۔ چہرہ کچھ شناسا سا لگتا تھا۔ لمبا قد، گندمی رنگت، گھنے سیاہ بال۔ عجیب اجنبی لیکن جانا پہچانا سا۔ میں خودبخود آگے بڑھنے لگا۔ "آپ کا نام قمر عباس تو نہیں؟" میں نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

وہ چونک کر میری طرف متوجہ ہوا۔ لحہ بھر مجھے دیکھنے کے بعد بولا "اور تم۔ تم رشید ہو!" وہ پھر بڑی گرم جوشی سے لیکن دبی ہوئی آواز میں بولا "مدتیں ہو گئیں میاں کہاں غائب ہو؟" وہ مجھے ایک طرف لے جاتے ہوئے مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔

ہم دونوں مغربی جرمنی میں ایک ماہ اکٹھے رہنے کے بعد ڈنمارک تک بھی اکٹھے ہی آئے تھے۔ پھر یہاں آ کر اپنے اپنے کام دھندے میں ایسے لگے کہ پہلے پہل جو ملاقات ہو جاتی تھی، وہ بھی جاتی رہی۔ "کہو بھئی کہاں ہوتے ہو؟" کوپن ہیگن میں یا باہر کہیں!" میں نے پوچھا۔

قمر کے چہرے پر وہی پرانی مسکراہٹ اور ہونٹوں پر شریر ہنسی تھی جس سے وہ ہمیں مغربی جرمنی میں قیام کے دوران بدحالی کے سخت دنوں میں ہنسایا کرتا تھا۔ ہم میں سے کون ہوگا جسے اس نے بھلے دنوں کے آنے کی خوشخبری نہ سنائی ہوگی۔ میاں سید زادہ ہوں سید زادہ' وہ ہر ایک کو دلاسا دیتے ہوئے کہا کرتا تھا' بس ہمارے دن سنورنے والے ہیں' مطمئن رہو۔ میرے ذہن میں قمر کے ساتھ گزارے ہوئے دنوں کی یاد کا جھونکا آیا ہی تھا کہ وہ بولا "تم کہاں ہوتے ہو۔"

"میں تو ایک فیکٹری میں لاؤڈ اسپیکر بناتا ہوں اور تم؟" میں نے پوچھا۔

"یار آہستہ بولو، جنازہ ہے۔" اس نے مجھے میت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو پولیس کے محکمہ میں ترجمان ہوں۔ تم قادر کو جانتے تھے کیا؟ وہ ابھی تک میت کو دیکھ رہا تھا جہاں چند لوگ ابھی تک سر جھکائے کھڑے تھے۔

قادر خان کی بیوی اور بچے آہ وزاریاں کر رہے تھے۔

"کوئی خاص نہیں' بس ویسے ہی جنازہ میں آ گیا ہوں۔" میں نے کہا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے قادر خان کے ساتھ اپنی پہلی اور آخری ملاقات کا تذکرہ گول کر دیا لیکن کیوں؟ یہ مجھے بھی احساس نہیں ہوا۔

"تم تو جانتے ہی ہو گے بے چارے قادر خان...... پردیس میں یوں۔"

میں ابھی اپنی بات ختم نہیں کر پایا تھا کہ قمر بول پڑا۔ "یار کیا پوچھتے ہو' اس کی آواز اتنی آہستہ تھی کہ بمشکل ہی سنائی دی۔ ہم تھے تو دونوں سیالکوٹ کے ایک ہی محلے کے لیکن یہ فوج میں رہا اور پھر یہاں چلا آیا۔ اس لیے یہ مجھے نہیں جانتا تھا لیکن میں اس سے غائبانہ واقف ضرور تھا۔ یہ تھا تو مقامی لیکن سیالکوٹ میں مہاجروں کے محلے میں رہتا تھا۔ اصل میں کسی گاؤں سے تھا'۔ میں نے قمر کے چہرے پر دیکھا تو وہاں اس کی روایتی شریر مسکراہٹ کی جگہ سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔

"رشید بھائی" وہ بولا۔ "رزق کی قسم ہے تم تو جانتے ہی ہو سید زادہ ہوں۔ اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داری کا لحاظ ہے ورنہ تمہیں بتاؤں کہ اس نے ابھی پرسوں ترسوں ہی ایک "جعلی نام نہاد" بیٹے کا ویزا اپلا کروایا ہے۔ اسے امید نہیں تھی کہ یہ کام ہو جائے گا۔" وہ لحہ بھر کو رکا اور پھر بولا "میرے خیال میں اس کو دل کا یہ دورہ اسی بے تحاشا خوشی سے پڑا ہے۔ پہلے سال بھر اس کی تنخواہ کھاتا رہا اور اب ویزا اپلا کروا کے پاکستان کی اپنی کسی بھتیجی کا اس سے رشتہ کروانا چاہتا اور اسے یہاں بلوانا چاہتا تھا۔"

میں حیرت زدہ ہو کر اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ پھر بولا "میں تو کام پر جا رہا تھا۔ ادھر مسجد کے پاس ہی رہتا ہوں۔ دیکھا لوگ جمع ہیں تو میں بھی آ گیا۔ اس کے چہرے پر پھر مسکراہٹ لوٹ آئی تھی۔ اس نے اپنی گھڑی پر وقت دیکھا اور جیب سے کچھ نکالتے ہوئے بولا، "یہ لو یہ میرا وزیٹنگ کارڈ ہے۔ مجھے فون ضرور کرنا۔ یار ملاقات ہوگی اور ہاں میرے گھر کا نمبر کسی اپنے کو نہ دینا۔ اچھا بھئی خدا حافظ۔" اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر لحہ بھر کے لیے میری آنکھوں میں دیکھا اور باہر کی طرف چل دیا۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوا' تو میں بھی آہستہ آہستہ مسجد کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ قادر خان کا تابوت جنازہ لے جانے والی گاڑی میں رکھا جا رہا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا' قادر خان مرحوم کی بیوہ اور دونوں بیٹیاں اسے چھونے کی کوشش کرتی ہوئی زاروقطار روتے ہوئے بین کر رہی تھیں۔ مجھے اس کا "بیٹا" کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ ◆◆◆

کیا خیال ہے؟

بچے کو بڑھانا مقصود ہوتا ہے، اس لیے سوچ محدود کر دی، اور بڑے کو گھٹانا مقصود تھا، اس کو لامحدود سوچ دے دی۔ مستقبل کی سوچ، غموں کی سوچ۔ سوچ آدمی کو یوں چاٹتی ہے، جیسے زنگ لوہے کو، پانی نمک کو۔

ستاروں کی زندگی اتنی طویل کیوں ہے؟

اس لئے کہ وہ دکھتے ہیں، اور گزر جاتے ہیں، اثر نہیں لیتے۔ اپنے کام میں مگن۔ تم طویل زندگی چاہتے ہو؟ ستاروں کی طرح بن جاؤ۔ مطیع اور بے پرواہ۔

پپو یار! تنگ نہ کر

ڈاکٹر منصور احمد باجوہ

کراچی تا خیبر سڑکوں پر رواں دواں ٹرکوں اور بسوں کے پیچھے لکھے جملوں کا قلمی خزانہ

ٹرانسپورٹ کے ڈرائیوروں سے لوگوں کو بیشمار دیگر گلے شکوے تو ہو سکتے ہیں مگر کم از کم یہ شکوہ نہیں ہو سکتا کہ یہ حضرات ادب نواز نہیں۔ رکشے سے لے کر بس اور وین سے لے کر ٹرالر تک ہر ایک کے عقبی حصے پر، نمبر پلیٹ کے گرد و نواح میں سجے اشعار، اقوال، پیغامات، نصائح، نعرے وغیرہ اس ادب نوازی کا بین ثبوت ہیں۔ ان ادب پاروں سے سجے ٹرک پشاور سے چلتے اور کراچی تک ہر خاص و عام کو دعوت غور و فکر دیتے جاتے ہیں۔

ادب کی جو خدمت ہمارے اشاعتی ادارے، ریڈیو، ٹیلیویژن، اخبارات و رسائل زر کثیر خرچ کر کے انجام نہیں دے سکتے، ہمارے ٹرانسپورٹر حضرات دن رات کسی معاوضے کے بغیر ملک کے ہر اس کونے میں انجام دے رہے ہیں جہاں کوئی چھوٹی یا بڑی، کچی یا پکی سڑک جا نکلتی ہو۔ ایک ہی نعرہ جب کراچی سے پشاور اور لاہور سے کوئٹہ تک ہر شاہراہ، ہر چوک، ہر موڑ اور ہر بستی میں گونجتا ہے اور جنوب میں رہنے والے کو پتا چلتا ہے کہ جس طرح 'پپو' اسے تنگ کر رہا ہے، اسی طرح شمال میں رہنے والے کو بھی چین نہیں لینے دیتا تو اس کے دل میں قومی یکجہتی کا یہ گہرا احساس پیدا ہونا فطری امر ہے کہ ملک کے ہر حصے میں بسنے والے لوگ تنگی اور ترشی کی ایک ہی ڈور سے بندھے ہیں۔

ہم جیسے جاہل لوگوں کے ذہنوں میں گویہ سوال ابھرتا ہے کہ یہ 'پپو' کون ہے جس سے ہر ڈرائیور اور کنڈیکٹر تنگ ہے اور اس کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑا ہے کہ

''پپو یار! تنگ نہ کر''

مگر ایک پپو ہے کہ اپنی حرکتوں سے باز آنے کے لیے تیار نہیں۔ اگر ہمیں بھی ادب سے ویسا ہی لگاؤ ہوتا جیسا ہمارے ٹرانسپورٹر حضرات کو ہے اور اشارے کنائے میں کی جانے والی باتیں سمجھ سکتے تو آج سے بہت پہلے ہم پر یہ حقیقت منکشف ہو چکی ہوتی کہ ''پپو یار'' تو دراصل ایک علامت ہے..... ڈرائیور کے لیے ہر ٹریفک کانسٹیبل ''پپو'' ہے جو ماہانہ بھتا لینے اس کی گاڑی کے آگے کھڑا ہو جاتا ہے، ہر وہ طالب علم ''پپو'' ہے جو تعلیمی ادارے کے شناختی کارڈ کے سہارے بس کا مالک بنا بیٹھا ہے۔

ہر دوسرا ڈرائیور ''پپو'' ہے جو اسے راستہ نہیں دے رہا۔ ہر اڈے کا انچارج ''پپو'' ہے جو اس سے جگا ٹیکس لے کر پھر نمبر نہیں دیتا اور ریلوے پھاٹک کا ہر گیٹ مین ''پپو'' ہے جو دور سے آتی بس کو دیکھ کر فوراً دروازہ بند کر دیتا ہے۔ ''پپو'' قریہ قریہ، شاہراہ شاہراہ، ہر موڑ اور ہر نکڑ پر کھڑے ہیں۔ ٹرانسپورٹر بیچارا ان سے بھاگ کر جائے تو کہاں جائے؟ ایک فریاد کر سکتا ہے سو کر رہا ہے: ''پپو یار تنگ نہ کر۔'' مگر پپو فی الحال کچھ سننے کے موڈ میں نہیں۔ ہر ڈرائیور کے لیے 'ماں کی دعا جنت کی ہوا' ہے مگر پپو کا سامنا ہوتے ہی یہ ٹھنڈی ہوا گرم اور خشک جھکڑ میں بدل جاتی ہے۔

شاعر حضرات صرف شعر کہتے اور اپنے دیوانوں میں دفن کر دیتے ہیں۔ عمل کی دنیا میں کم ہی انہیں استعمال کرتا ہے۔ کوئی کرے بھی تو کیسے کہ نانوے فیصد شاعری حسن اور عشق کے ایسے افسانوں سے بھری ہے جن کا وجود صرف شعراء کے دماغوں میں ہوتا ہے۔ یہ حوصلہ صرف ڈرائیوروں کا ہے کہ اشعار گاڑی پر لکھ کر شہر شہر گھومتے ہیں۔ وہ شعر پر اپنے حالات، گاڑی کے مزاج اور دیس بدیس کے تجربات کا رنگ چڑھا کر اس کو دو آتشہ بنا دیتے ہیں۔

حسب ضرورت سپرے پینٹر ان میں فراخ دلی سے ترمیم و اضافہ اور قطع و برید کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ اس فریضے کی انجام دہی کے دوران اکثر اوقات وزن، قافیہ اور ردیف سب غائب ہو جاتے ہیں اور نظم و نثر کا ملغوبہ سا باقی رہ جاتا ہے۔ سپرے پینٹر کا یہ کمال ہے اس کے باوجود جو پڑھتا ہے، اش اش کر اٹھتا ہے۔ بعض اوقات تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے معانی کے ایک سمندر کو دو مصرعوں کے کوزے میں بند کر دیا ہو اور کوزہ بھی ایسا کہ جو جگہ جگہ سے رِس رہا ہو۔

ایک بس کے پیچھے تحریر تھا.....

عزیز اتنا ہی رکھو کہ دل بہل جائے
مجھ کو اتنا بھی نہ چاہو کہ دم نکل جائے

پہلے ہم سمجھے کہ شاید اشارہ دوسری بس کی طرف ہے کہ ''وقفہ بہت ضروری ہے''۔ گلے ملنے کی کوشش دونوں کے لیے خطرناک ہو سکتی ہے، اس لیے اپنی محبت کو قابو میں رکھو اور خواہ مخواہ میری ہیڈ لائٹوں سے ہیڈ لائٹیں ملانے کی کوشش نہ کرو۔ مزید غور کیا تو خیال آیا کہ اشارہ شاید ٹریفک پولیس کی طرف ہے کہ مجھ غریب پر روز چاہت بھری نظریں نہ ڈالیے کہ میں اس مسلسل التفات کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ پھر سوچا شاید روئے سخن مسافروں کی طرف ہے کہ اندر باہر، اوپر نیچے، دائیں بائیں، آگے پیچھے شہد کی مکھیوں کی طرح چمٹے ہوئے ہو، سانس کے لیے تو جگہ چھوڑ دو۔ آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ اشارہ ہر طرف ہے بشرطیکہ کوئی سمجھنے کی کوشش کرے۔ پیغام سیدھا اور صاف ہے کہ 'جیو اور جینے دو' تاکہ محب اور محبوب دونوں کا کام چلتا رہے۔

ایک بس اپنا رونا اس طرح روتی پھر رہی تھی:

سڑکاں تے سواریاں چوکاں وچ سپاہی
ہر کوئی پچھدا پھرے، ۴۴۲۰ کیوں نہیں آئی

ڈرائیور کو شاید اپنی بس کے بارے میں کوئی زیادہ ہی غلط فہمی ہے کہ لوگ اس کے ہجر میں دیوانے ہو رہے ہیں۔ حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ ڈرائیور نے ابھی تک ماہانہ بھتہ، جسے حرف عام میں 'منتھلی' کہتے ہیں، نہیں پہنچائی اور چوک میں کھڑا سپاہی اس کی طاق میں ہے کہ کب آئے اور اسے تھانے کی راہ دکھائے۔ ۴۴۲۰ کے بارے میں پوچھنے والا کوئی اور بھی ہے تو وہ آر ٹی اے کا آدمی ہوگا یا ایکسائز کا۔

پاکستان میں کسی بس کو حسینہ سے تشبیہ دینا، حسینوں کے ساتھ ہے تو بڑی زیادتی، مگر کہتے ہیں کہ اپنی بس اور اولاد اور دوسرے کی بیوی ہمیشہ خوبصورت نظر آتے ہیں۔ بس اور اولاد میں قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں پر انسان اس لالچ میں تمام عمر اپنے خون پسینے کی کمائی لگاتا رہتا ہے کہ کل کو سہارا بنیں گے۔ ڈرائیور کی استادی یہ ہے کہ وہ بھی اپنے پسینے کا حق جتلا رہا ہے:

مالک کا پیسہ، ڈرائیور کا پسینہ
نکلی سڑک پر بن کے حسینہ

اس حسینہ کا حسن قائم دائم رکھنے کی تگ و دو میں آخر کار ہوتا یہ ہے کہ پسینا مالک کے حصے میں آتا ہے اور پیسا ڈرائیور کے حصہ میں۔ بیوٹی پارلر پر جب ڈرائیور کی اجارہ داری ہو تو پھر تو ایسے ہی ہوگا۔

گھڑ سوار اپنے گھوڑے کی حوصلہ افزائی کے لیے اسے تھپکی دیتے ہیں۔ ٹرک والے تھپکی کا یہ کام شعروں سے لیتے ہیں۔ ایک ٹرک والے نے اپنے ٹرک کو کچھ اس طرح ''ہلاشیری'' دے رکھی تھی۔

اے ٹرک! تجھے قسم ہے تو ہمت نہ ہارنا
جتنے بھی آئیں جمپ تو ہنس کے گزارنا

اگر ٹرک اس نصیحت پر عمل کرے تو اسے پشاور سے کراچی تک ہنستے ہی رہنا چاہیے کیونکہ اپنے ملک میں تو:

ایسی کوئی شاہراہ نہیں افلاک کے نیچے
بے جمپ کوئی گاڑی گزر جائے جہاں سے

بہرحال نصیحت خوب ہے اور ہم نے دیکھا ہے کہ اکثر ٹرک جمپوں کا برا نہیں مناتے اور ہنستے مسکراتے، دائیں بائیں سے گزرنے والوں کو ٹھمکا لگاتے، اپنی دھن میں مست چلتے جاتے ہیں۔ بعض ہائی جمپ البتہ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ٹرک اور مالک دونوں کی کمر توڑ دیتے ہیں۔

گاڑیوں سے مالک اور ڈرائیور جو توقعات رکھتے ہیں وہ تو اکثر دیکھنے میں آتی رہتی ہیں۔ ایک ٹرالر کی اپنے مالک سے یہ اپیل انوکھی بات تھی:

یہ ٹرالہ نہیں محبت کا پھول ہے
وزن اتنا ہی ڈالو جتنا اصول ہے

مطلب یہ کہ میری خود سپردگی کا ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ اور بندے کے پتر کی طرح اتنا ہی بوجھ ڈالو جتنا میں اٹھا سکوں۔ رحم کی ایسی اپیلیں اگر کوئی اثر رکھتیں تو آج ہر شاہراہ پر میلوں لمبی لہریں کیوں پڑی ہوتیں۔ خواہش ہر مالک کی یہی ہوتی ہے کہ ایک ہی پھیرے میں اپنے سارے پیسے نکال لے۔

ایسے عالم میں محبت کے پھول اور اصول کس کو یاد رہتے ہیں؟ گدھے، گھوڑے تو پھر بھی صدائے احتجاج بلند کر لیتے تھے، ٹرکوں اور ٹرالوں کو تو یہ اختیار بھی نہیں۔ دھرنا دینے میں البتہ گدھوں اور گھوڑوں سے بہت آگے ہیں۔

ایک رکشے والا اپنا رونا رو رہا تھا:

نہ اپنا ہے نہ بیگانہ
سناؤں کس کو افسانہ
لکھا ہے میری قسمت میں
ہمیشہ ٹھوکریں کھانا

ایک بات کا ذکر کرنا رکشے والا بھول گیا کہ سواری بھی اس کے ساتھ ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے۔ بلکہ اگر حساب لگایا جائے تو سواری کے حصے میں اچھل کود ڈرائیور سے خاصی زیادہ آتی ہے کیوں کہ ڈرائیور کو سامنے نظر آ رہا ہوتا ہے کہ وہ دو فٹ گہرے کھڈے میں اچھل کود شروع کرنے والا ہے اس لیے مضبوطی سے سٹیرنگ کو پکڑ لیتا ہے۔ سواری کو تو اس وقت پتا چلتا ہے جب سر میں گومڑ بن چکا ہوتا ہے۔

موٹر رکشے کا فائدہ یہ ہے کہ سواری اوپر نیچے تو ہوتی رہتی ہے، باہر کم ہی گرتی ہے کیونکہ دائیں بائیں، کندھے رگڑتے ہوئے رکشہ جس طرح ٹریفک کے مکھن سے بال کی طرح نکلتا ہے، دائیں یا بائیں، جسم تو دور کی بات ہے، ہاتھ یا پاؤں نکلنے کی بھی گنجائش نہیں ہوتی۔ سواری باہر گرنے کی کوشش بھی کرے تب بھی اردگرد کی گاڑیاں اس کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیتیں اور اسے واپس سینڈوچ کی طرح رکشے میں دھکیل دیتی ہیں۔ البتہ اگر رکشے کے اوپر چھت نہ ہوتی تو اس بات کا قوی امکان تھا کہ جسم رہائی کے لیے یہ راستہ اختیار کرتا۔ بعض رکشے والے اسی لیے سواریوں کو بٹھانے کے بعد باقاعدہ چیلنج دیتے ہیں:

''توں جا کے وکھاتے سہی''

ادب کی شاہراہ پر گاڑیوں کے دوش پر سفر کرنے والے

ادب پاروں کے مزید نادر نمونے اب تک ہمارے مشاہدے میں آئے ہیں وہ پیش خدمت ہیں:

☆ بار بار ہارن دینے والے اور آگے پیچھے دیکھے بغیر آگے نکلنے کی کوشش کرنے والے کے لیے..... ''توں لنگ جا، ساڈھی خیر اے''

☆ آدھی بس خالی لے جانے والے کے غم و غصے کو دیکھتے ہوئے..... ''جلنے والے اللہ تعالیٰ تجھے بھی دے''

☆ بار بار پیچھے رہنے کا اشارہ کرنے کے باوجود، دائیں بائیں سے نکلنے کی تگ و دو کرنے والے کو..... ''ضد نہ کر سوہنیاں! میں آپ بڑا ضدی آں''

☆ جلنے والے کو جلانے کے لیے..... ''سڑیا نہ کر''

☆ ٹریفک مجسٹریٹ سے..... ''میرے بعد کس کو ستاؤ گے''

☆ آگے چیکنگ کی اطلاع کے باوجود سفر جاری رکھنے پر مصر دوسرے ڈرائیور سے..... ''نواں آیاں اے سوہنیاں''

☆ بار بار انکھلیاں کرنے والی بس سے..... ''میری چھمک چھلو! ذرا دھیرے چلو''

☆ جب ڈرائیور ہوش سے زیادہ جوش میں ہو..... ''سواری اپنے مال اور جان کی خود ذمہ دار ہوگی''

☆ صبح شام، دن رات کی ڈیوٹی سے تنگ آ کر..... ''سفر بے حساب ہے، زندگی عذاب ہے''

☆ بھارتی حکمرانوں کی ہٹ دھرمی کے جواب میں..... ''ضد نہ کر کافر! کشمیر ہمارا ہے''

☆ دھکا سٹارٹ بس کے مسافروں سے..... ''سفر کے کچھ (نا) خوش گوار لمحات ہمارے ساتھ''

☆ وقت کی راہوں میں روڑے اٹکانے والوں سے..... ''غصہ نہ کر سوہنیاں! ٹائم میری مجبوری ہے''

☆ بغیر ٹکٹ سفر کرنے والے طالب علموں کی خدمت میں ڈرائیور کی یادداشت:

پلٹ کے دیکھ اے ظالم تمنا ہم بھی رکھتے ہیں
جو تم کالج میں پڑھتے ہو ڈرائیوری ہم بھی کرتے ہیں

☆ نعرۂ مستانہ..... ''گذری گذران، کیا جھونپڑی کیا مکان''

☆ وٹو کوچ اور چھوٹی باجی.....

بڑی باجی کو کون سمجھائے
میک اپ میں جو دیر لگائے
مجھے ڈر ہے کہیں کہ ہائے
وٹو کوچ نکل نہ جائے

☆ ذرا بچ کے، ذرا ہٹ کے..... اگر پاس کرنے کی ہمت نہیں ہے تو ہارن بجانے کی کوشش نہ کرنا۔ ڈرائیور کی غیرت کو نیند آ گئی ہے اسے تم جگانے کی کوشش نہ کرنا۔

☆☆

ڈرائیور حضرات بری نظر ڈالنے کے سب سے زیادہ مخالف ہوتے ہیں اگرچہ ہمیں کوئی ایسی وجہ نظر نہیں آتی کہ کوئی بری نظر ٹرک یا بس ڈرائیور پر ہی کیوں ڈالے گا، اس کام کے لیے دنیا میں دیگر حسین چیزیں کیا کم ہیں۔ جا بجا بری نظر والوں کے خلاف ایسی تحریریں ملیں گی کہ اگر ان کی نیت پہلے بری نظر ڈالنے کی نہیں تھی تب بھی وہ اس پر مجبور ہو جائیں۔

'بری نظر والے تیرا منہ کالا' تو بے ضرر سی تحریر ہے۔ جس طرح جلنے والے کا منہ کالا کرنے کے لیے سائلنسر کے راستے دھوئیں کی توپیں داغی جاتی ہیں اسی طرح بری نظر والے کو بھی موقع پر ہی روسیاہ کرنا ٹرک ڈرائیور کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ تاہم بری نظر والے کو آگ اس قسم کی تحریروں سے لگتی ہے:

☆ بری نظر والے تیرے بچے جئیں
بڑے ہو کر تیرا خون پئیں

گاڑیوں پر لکھی جو تحریریں ہمیں اچھی لگیں۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

☆ ''شالا خیر ہووے''

☆ ''نیت صاف منزل آسان'' (اللہ جانے کس کی نیت کی طرف اشارہ ہے؟)

☆ ''میرے ساجن دعا کرنا''

☆ ''خیر نال جا خیر نال آ''

☆ ''سدا منگ دوجے دی خیر''

☆ آؤ صنم! کشمیر چلیں''

☆ ''ہوش کر جوش نہ کر''

☆ ''ہماری بلی ہم ہی سے میاؤں''

☆ تختہ ملنگا پولیس را غلے (ملنگا بھاگ، پولیس آ گئی)

☆ 'ہوش کر جوان' ذرا نمبر پہچان (گاڑی خود سارجنٹ کی ہے)

☆ ''سیر کرنی ہے تو میرے دل کی کر، بازاروں میں کیا رکھا ہے!
سفر کرنا ہے تو ۸۸۸۵ میں کر، کاروں میں کیا رکھا ہے!

☆ ''ساتھ رہنے کی کھائی تھی قسم آہستہ چل''

☆ ''مجھے پاس کرتے کرتے تیری عمر بیت جائے''

☆ ''وہ آئے ہماری قبر پر اور دیا بجھا کر چلے گئے
باقی جو تیل تھا دیوے میں وہ سر پر لگا کر چلے گئے
(محبت میں ترے سر کی قسم ایسا بھی ہوتا ہے)

☆ نہ چلتی تیز ہوائیں اور نہ گرتے پتے چناروں سے
نہ ٹرک پہ ڈرائیوری کرتے نہ بچھڑتے اپنے یاروں سے

☆ سڑکوں سے دوستی ہے گاڑی سے یاری ہے
کیسے مزے کی پیارے زندگی ہماری ہے

☆ ہر روز نیا دل کہاں سے لاؤں یارب
حسن والوں نے اندھیر مچا رکھا ہے
(یہ وہ کہہ رہا تھا جس نے خود اوپر نیچے سواریاں بٹھا کر اندھیر مچا رکھا تھا)

☆ گڈ مارننگ پیارے
آجا لے لے ہلارے ●●●

ٹشو پیپر

گئے وقتوں میں ہاتھوں میں کوئی رومال رکھتے تھے
پرانا ہو گیا پھر بھی مہینوں سال رکھتے تھے
گھڑی بھر کے لیے ہاتھوں کو رکھنا ہو اگر خالی
کسی پاکٹ میں اس کو ڈال کر ہر حال رکھتے تھے
بدلتا وقت لے کر کیا مگر سوغات آیا ہے
ہمارے ہاتھ میں اس نے ٹشو پیپر تھمایا ہے
کہیں جو چھینک آنے پر نکل آیا کوئی آنسو
کہیں کھانسی کی سُدت میں ہوا بلغم جو بے قابو
کہیں پہ آ گئی جو پیش اک فطری ضرورت ہے
نظافت کی کہیں در پیش چاہے کوئی صورت ہے
جدھر دیکھا اِسی کو ہر جگہ موجود پایا ہے
یہی تو ہے ضرورت کے سمے جو کام آیا ہے
ہے اک پتلا سا کاغذ جس کی معمولی سی قیمت ہے
وجود اس کا ہمارے واسطے لیکن غنیمت ہے
مٹا کر اپنی ہستی کام یہ اوروں کے آتا ہے
عجب ایثار سے بھرپور اک پیغام لاتا ہے
بظاہر دیکھنے میں چیز ہے یہ ایک بے مایہ
حقیقت میں مگر یہ ہے بڑا انمول سرمایہ
لیے رومال پھرنا ہاتھ میں عادت پرانی ہے
ٹشو پیپر نئی تہذیب کی زندہ نشانی ہے
ہماری زندگی میں اب اسی کی حکمرانی ہے
یہ شاید وہ حقیقت ہے جو اک دنیا نے مانی ہے
نئے انداز سے یونہی اگر آگے کو بڑھنا ہے
اِسی کلچر میں ہم نے اے ضیاء پروان چڑھنا ہے

(شرافت ضیا، اسلام آباد)

گیانی بلی

عام و خاص کے من پسند جانور کی خصوصیات آشکار کرتا منفرد خاکہ

احمد جمال پاشا

مجھے ایسے لوگ بہت پسند ہیں جو مست کہلائیں۔ وہ ذات کے خول یا اپنی کھال میں مست رہتے ہیں۔ مل گیا کھا لیا، نہیں ملا تو مانگ لیا۔ کھایا پیا سو گئے، اُٹھے تو پھر آرام کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سو رہے تھے تو اپنے خراٹوں سے دُنیا کو جگا رہے تھے۔ جاگے تو دیکھنے والے اونگھ گئے' غور و فکر کا نہ ختم ہونے والا بقراطی سلسلہ جاری رہا۔

یہ پتا لگانا آسان نہیں کہ مست سو رہا ہے' جاگ رہا ہے یا سوچ رہا ہے۔ سوال کا جواب دینا تو کجا جواباً مسکرائے یا گھور بھی دے تو بڑی بات ہے۔ مست بُنیادی طور پر مغلوب الغضب ہوتا ہے۔ اس لیے اگر کسی پر مہربان بھی ہو لوگ سمجھتے ہیں کہ بد دعا دے رہا ہے۔ اسے کسی نحوست یا آفت کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں۔ مست کا عمل دراصل خفیہ ہوتا ہے۔ وہ کیا کرتا ہے' کوئی نہیں جانتا۔ ممکن ہے وہ آنکھیں بند کیے لیٹا ہو مگر ایسا فوکس ہو جیسے بلی چڑیوں کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ پھر ایک ہی جست میں چڑیا اس کے پنجوں میں ہوتی ہے۔ چوہے کو اس طرح تاکتی ہے گویا گیان دھیان میں مست، دُنیا و مافیہا سے غافل۔ شکار پہلے چھپتا ہے پھر آہستہ سے سرک جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ ظالم شکاری موت کا شکار ہو چکا۔ پھر وہ اس کے سامنے ''جشن دارد'' کے دوران لقمۂ تر بن جاتا ہے۔

آدمی مست ہو یا مستعد' بُنیادی طور پر اس کے اندر ایک بلی چھپی گیان دھیان میں مصروف رہتی ہے۔ ہر بلی کے اندر انسانی روح اپنے پورے خیر و شر کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔

آخر وہ بھی تو ایک سماجی جانور ہے' اس لیے کھانے پینے میں شرکت غیر کی روادار نہیں۔ ہمیشہ مرنے مارنے پر آمادہ رہتی ہے۔ پھر بھی اپنے ہم زاد سے کہیں خوددار اور آزاد طبیعت رکھتی ہے۔ پالتو ہونے پر اس میں اور عام پیشہ ور بھکاری یا جوگی میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔

بھکاری کھانے کے لیے دعائیں دیتا ہے۔ غیر ضروری رشتے داروں تک کی بخشش کی باآواز بلند سفارش کرتا ہے۔ خوشامد کرتا ہے۔ گڑگڑاتا ہے۔ عذابِ قبر سے ڈراتا ہے۔ خود غرضی اور دُنیاداری کے رویّے پر نظرِ ثانی کی اپیل کرتا ہے۔ راہِ نجات دکھاتا ہے۔ جوگی اپنا معاملہ حمد و مناجات سے شروع کرتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی یاد تازہ کرتا ہے مگر کھانا ملنے کے

بعد دنوں نظر نہیں آتے۔

بلی ٹھیک کھانے، ناشتے یا مہمانوں کی تواضع کے دوران کمرے میں دُم ہلاتی، میاؤں میاؤں کرتی سالِ نو کے لرزاں آفتاب کی طرح نمودار ہوتی ہے۔ جب تک آپ خراج ادا نہ کر دیں' نہ چین سے کھا سکتے ہیں نہ کھلا سکتے ہیں۔ آپ کے پیروں پر لوٹے گی، آپ کی جانب سوال کا پنجہ بلند کرے گی۔ سو سو طرح سے خوشامد و انکسار کا اظہار کرے گی۔ اگر پھر بھی آپ متوجہ نہ ہوئے تو بھکاری کی صدا جوگن کے بھجن میں تبدیل ہو کر آپ کے معدوں پر اثر انداز ہوگی۔

جیسے ہی اس کا پیٹ بھر جائے گا' اس میں طمانیت اور وقار کی لہر دوڑ جائے گی۔ خواہ اس کا من پسند دودھ بالائی ہی منتظر کیوں نہ ہو، کھانے کے کمرے سے اس طرح واک آؤٹ کر جائے گی، گویا کھانا کوئی بے حد غیر دل چسپ اور غیر ضروری عمل ہے۔ یہاں وہ اپنے خالص جنگلی کردار کا مظاہرہ کرتی ہے جس میں صدیوں کے میل جول کے باوجود ابھی تک کوئی ملاوٹ نہیں آسکی۔ اس مقام پر وہ بھکاری یا جوگی سے بلند ہو جاتی ہے۔

جب میں کسی چاٹ کی دکان پر پلیٹیں چاٹنے والوں کی بھیڑ بھاڑ دیکھتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ بہت سی بلیاں اور بلّے جمع ہیں۔ بھلا اس نیک بی بی سے بڑا چٹورا کون ہوگا جو دودھ پینے کے بعد کھانے کے کمرے میں ایک سرے سے دوسرے تک برتن کو زبان سے کھسکا کر اور چاٹ چاٹ کر ایسا صاف کر دے گی کہ آپ اس میں اپنا مُنہ دیکھ سکتے ہیں لیکن اگر کھانا چٹ پٹا نہ ہو تو وہ اس پر نگاہِ غلط انداز ڈال آگے بڑھ جائے گی۔ زہر مار کرنے کے مقابلے میں بھوکی رہنا پسند کرے گی۔

جب میں کسی چور کو دیکھتا ہوں تو مجھے پوسی یاد آجاتی ہے۔ جس صفائی سے وہ پنجوں کے بل چپکے چپکے دیواروں پر چڑھتی، چڑیوں اور کبوتروں کو پار کرنے کے لیے یا جس انداز سے چوزہ یا مُرغ پار کر کے چمپت ہوتی ہے' شاید اس کی حکمتِ عملی، عیاری، تیزی اور پھرتی کا مشاق چور بھی مقابلہ نہ کر سکے۔

تجربہ ہے کہ جلیبیاں، دودھ یا مرغوب غذا چولہے' نعمت خانے یا چھینکے پر کھلی رکھی ہو تو بلّی بڑی سعادت مندی سے اس وقت تک آنکھ اٹھا کر بھی اسے نہیں دیکھتی جب تک کہ اغیار سے میدان صاف نہ ہو جائے۔ اِس پر خوبی کہ یہ صرف ایک ہی سزا دیتی ہے یعنی ترمال ہڑپ کر جاتی ہے نہ مار پیٹتی ہے نہ لوٹتی، پریشاں کرتی ہے۔ کیوں نہ ہو' آخر ہے حیوان!

صدیوں انسان سے میل جول کے نتیجے میں دونوں نے ایک دوسرے کے اتنے گہرے اثرات قبول کیے ہیں کہ جب بلی کا بیان ہوگا تو سمجھیں گے کہ آپ کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔ یہ بلا کی عاشق مزاج واقع ہوئی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ حضرت انسان نے یہ فن اسی قبیلہ سے سیکھا ہو۔ یہاں ہر بلا مجنوں اور ہر بلی لیلیٰ ہے۔ مثل مشہور ہے جس گھر میں بلی ہوگی، بلّے منڈلائیں گے۔ عشق کے چکر میں لیلیٰ کی جانشین کھانا پینا تک بھول جاتی ہے۔ یہاں دمشق کے قحط کا سا معاملہ ہے۔

اس عشق میں بنیادی اہمیت محبوب اور عاشق کے درمیان ہونے والے مسلسل و روحانی ڈائیلاگ کی ہے۔ لیلیٰ مجنوں بلکہ کا آسمان سر پہ اُٹھا لیتے ہیں۔ سُننے والے سمجھتے ہیں کہ ہماری کسی آنے والی مصیبت پر رویا جا رہا ہے حالانکہ عشق و عاشقی میں آہوں اور نالوں کے سوا ہوتا بھی کیا ہے؟ میر و غالب کے عاشق تک یہ نزاکت نہیں سمجھ پاتے اور ٹریجڈی روکنے کے لیے ہر طرف سے بل بل کی صدائیں بلند ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ محلہ بھر عاشق و معشوق کو دوڑانے کے سماجی عمل میں مصروف ہو جاتا ہے۔ سماج کا تو یہی کام ہے کہ وہ دو دلوں کے درمیان دیوارِ چین بن جائے۔

اگر تھوڑی دیر ہمسائے کو جگانے کے لیے میر صاحب اور روتے رہے تو محلہ قبرستان میں نہ تبدیل ہو جائے۔ کیف، نشاط، سرمستی و موسیقی میں مست جوڑا برابر نئے سرے

عشق کے محاذ اور مورچے قائم کرتا رہتا ہے لیکن خاموشی اختیار نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ اہل محلہ کے شور میں عاشقانہ آہ و زاری دَب جاتی ہے۔ تہذیبی ترقی کے ساتھ شور بھی ترقی کر رہا ہے۔ لاؤڈ اسپیکروں اور ہنگاموں کی وجہ سے اب ان کے معاملاتِ وصل کی بھی کچھ پردہ پوشی ہونے لگی ہے۔ با آسانی پتا نہیں چل پاتا کہ کہیں رومانی مکالمات نازل ہو رہے ہیں یا فلمی ریکارڈنگ جس میں اب گانے کم اور مکالمات زیادہ ہوتے ہیں۔

آدمی اپنی نمائش و آسائش کے لیے ڈرائنگ روم سجاتا ہے۔ بیڈ روم کو لحاف، گدّوں سے آراستہ و پیراستہ کرتا ہے۔ صوفوں کرسیوں پر نرم کُشن لگاتا ہے۔ آتشدان روشن کرتا ہے۔ پھر روزی کمانے چلا جاتا ہے۔ اسے بہت ہی کم گھر میں رہنے یا آرام کرنے کا موقع ملتا ہے جب کہ اس کا ہم زاد صرف آرام ہی کرتا ہے۔ گویا سارا اہتمام اسی کے لیے کیا جاتا ہے۔ مگر اس کے لیے گھریلو یا پالتو ہونے کی بھی شرط نہیں۔ اکثر آپ لحاف میں داخل ہوں تو کوئی اجنبی آہستہ سے کونے میں سرک جائے گا لیکن آپ کے سوتے ہی وہ اپنی جگہ بنا لے گا اور صرف آرام کے لیے آرام کرے گا۔ اس کا یہ عمل امربیل ناخواندہ مہمان سے مشابہ ہے۔

بلّی وقت کا منجمد لمحہ ہے۔ آپ اس میں زندگی کی شاید ہی کوئی رمق پائیں۔ آپ اسے گود میں لیں۔ پیار سے چمکاریں۔ سہلائیں۔ بس ایک ہلکی سی نگاہوں کی جنبش' دم کی حرکت اور خفیف سی میاؤں کے بعد خُرخُرانا شروع کر دے گی۔ جاگنے کے نام سے ہی اس کی سانس پھولنے لگتی ہے۔ اگر نظامِ سانس خود کار نہ ہوتا تو وہ اسے بھی آئندہ موسمِ بہار کے لیے اُٹھا رکھتی۔

یہ ''اپنی جنت آپ پیدا کر'' کی بہترین مثال ہے۔ ہمیشہ اچھے گھر میں گھر والوں سے کہیں بہتر رہتی ہے۔ سب سے اچھا کھاتی اور سب سے زیادہ سلیقے سے رہتی ہے۔

مزاج میں اگر صفائی ہو تو شخصیت نکھر آتی ہے جس کے لیے لوگ نہاتے، دھوتے، صابن، کریم، پاؤڈر کا بے تحاشا استعمال کرتے ہیں۔ خصوصاً مرد حضرات لیکن پھر بھی ان میں عام طور سے وہ صفائی ستھرائی نظر نہیں آتی جو ہم بلّیوں میں پاتے ہیں۔ بلّی ہر وقت ڈرائی کلیننگ کرتی رہتی ہے اور ملاقات پر اس کا آپس میں تبادلہ بھی کرتی ہے۔

بہر حال چوپایہ ہے اور سوتیا ڈاہ میں خاصی شہرت رکھتی ہے' اس لیے ایک دوسرے کو ایک لمحہ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ اسی لیے جب دو بلیاں ایک دوسرے سے ملتی ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ دو حکومتیں لڑ رہی ہیں۔ جنگ عموماً فیصلہ کن ہوتی ہے۔ کھانے یا علاقے پر معاملہ شروع ہوتا ہے۔ لڑاکا ہونے کے باوجود دشمن سے نپٹنے کے بعد بھول جاتی ہے کہ کبھی لڑی بھی تھی یا نہیں۔ شاید اس لیے کہ وہ ہر معاملے سے ہر وقت براہِ راست نپٹ سکتی ہے۔ ◆◆◆

روشن کرنیں

دور سے آنے والی آواز بھی اندھیرے میں روشنی کا کام دیتی ہے۔ (واصف علی واصف)

زندگی میں سوال زیادہ اور جواب کم ہیں۔ (مستنصر حسین تارڑ)

دولت کے بھوکے کو کبھی راحت و سکون نہیں ملتا۔ (حضرت معروف کرخیؒ)

اپنی مرضی اور اللہ کی مرضی میں فرق کا نام غم ہے۔ (واصف علی واصف)

اِبنِ آذر

زبیر سلیمانی

صدیوں سے پیری مریدی کے گھن چکر میں پھنسے دیہاتیوں کی ذہنیت پر ماتم کرتی کتھا

کیکر کے نیچے چار پائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ صرف ایک چارپائی پر رضائی بچھی تھی جس پر کھدر کی اجلی چادر رکھی ہوئی تھی اور ایک بڑا تکیہ رکھا ہوا تھا۔ باقی تین چارپائیوں پر مزارعین اور چھوٹے موٹے زمین دار بیٹھے تھے۔ نظام دین نے بچھڑے کی طرف دیکھا' چار پانچ نوجوان اسے رسیوں سے باندھ کر زمین پر گرا چکے تھے قصائی اپنی چھری تیار کر رہا تھا۔ کیکر کے قریب ہی نظام دین کا بڑا سا گھر تھا جہاں عورتیں گھر کی صفائی کرنے میں مصروف تھیں۔ بالاں بھینس کے آگے چارہ ڈال رہی تھی اور چھوٹی بہن شاداں صحن میں پڑا گوبر سمیٹ رہی تھی۔

دفعتاً تمام لوگ مغرب کی جانب دیکھنے لگے۔ چند سو گز کے فاصلے پر ایک گھڑ سوار ان کی جانب آ رہا تھا۔ اس کے آس پاس چند دیہاتی بھی تھے۔ گھوڑا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ گھوڑے کی باگ نظام دین کے نوجوان بیٹے رمضان نے تھام رکھی تھی۔ گھڑ سوار سفید بے داغ شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ سر پر بڑی سی بادامی رنگ کی پگڑی رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نمایاں تھی۔ گھڑ سوار نیچے اترا تو تمام لوگ اس کی جانب لپکے۔

سب سے پہلے نظام دین نے پیر سائیں کے پاؤں چھوئے پھر ہاتھوں کو بوسہ دیا اور الٹے قدموں پیچھے ہٹ گیا۔ پھر اللہ دتہ کی باری آئی۔ اس نے بھی پیر سائیں کے پاؤں چھوئے' ہاتھوں کو بوسے دیے اور خیریت دریافت کی۔ پیر سائیں نے مسکرا کر اپنی خیریت سے آگاہ کیا پھر امام بخش نے یہی عمل دہرایا۔ اس کے بعد مزارعین کی باری آئی۔ انھوں نے باری باری پیر سائیں کے پاؤں چھوئے۔ ہاتھوں کو بوسے دیے۔ آنکھوں سے لگایا اور پیچھے ہٹتے گئے۔

''پیر سائیں قربان جاؤں' بڑی دیر کر دی۔'' نظام دین نے مؤدبانہ لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں نظام دین' زمینوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ مگھر کی آخری تاریخیں ہیں۔ زمین کو پانی دینا ہوتا ہے۔ پوہ آنے پر پانی دینے کا کوئی خاص فائدہ نہیں۔ گندم کو مگھر کے پانی سے رغبت ہوتی ہے۔ تم سناؤ چراغ دین کیسے ہو؟'' پیر سائیں نے ایک زمین دار سے پوچھا۔

''رب کا کرم ہے پیر سائیں' اللہ کا بہت بہت شکر ہے۔ زمینیں بھی تیار ہیں۔ نالیاں بن گئی ہیں' صرف پانی دینا باقی ہے۔ مگر بخار ہے کہ پیچھا ہی نہیں چھوڑتا.....''

''سب ٹھیک ہو جائے گا چراغ دین' اللہ پر بھروسہ رکھو۔'' پیر سائیں نے اسے تھپکی دی۔

بچھڑا اپنی زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔ اب اس کی کھال اتاری جا رہی تھی۔ چار پانچ نوجوان قصائی کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ گاؤں کی بلیاں اور کتے قصائی کی نظر کرم کے منتظر تھے۔ اردگرد بیسیوں کوے بے تابانہ انداز میں پھدک رہے تھے۔ کبھی کبھار قصائی کسی چھیچھڑے کو پھینکتا تو کوئی کوا اسے فضا سے ہی اچک لیتا۔

تھوڑی دیر بعد گاؤں کی اکلوتی مسجد سے اللہ اکبر کی صدا بلند ہونے لگی۔ نظام دین قصائی کی جانب بڑھا اور بولا:

''شاہ جہانے' بڑی دیر کر دی۔ جلدی کر پیر سائیں کے لیے کھانا تیار کرنا ہے۔''

''گوشت کو ذرا دیر ہے نظام دینے۔'' شاہ جہانے نے گوشت پر چھرا چلاتے ہوئے کہا ''تو کوئی مرغی ورغی گرا دے۔ اور دین محمد' تو ذرا ٹانگ کو پکڑ' شاباش اور ہاں نظام دینے سن.....''

نظام دین رک گیا۔

''نظام دینے تجھے پیر سائیں کے آنے سے پہلے کھانے کا انتظام کر لینا چاہیے تھا۔ بانگ ہو گئی ہے اور تو گوشت کی آس لگائے بیٹھا ہے۔ جا شاباش مرغی پر ہی چھری پھیر دے۔''

نظام دین کچھ کہے بغیر واپس چلا گیا۔

پیر سائیں کے ہاتھ میں تسبیح تھی جس کے دانے تیزی سے ایک دوسرے کے اوپر گر رہے تھے۔ چراغ دین گھر سے ایک پرچ میں نمک لے کر آیا اور اسے پیر کے آگے کر دیا۔

''پیر سائیں ذرا نظر کرم کر دیجیے۔''

''پیر سائیں نے اس کے ہاتھ سے پرچ لے لی۔ زیر لب کچھ پڑھا' پرچ میں تھوک کر انگلی سے نمک کو تھوک میں حل کیا اور پرچ چراغ دین کی جانب بڑھا دی۔ کہنے لگے:

''یہ لے دن میں تین بار دو دو انگل چاٹ لیا کر۔''

''بڑی مہربانی پیر سائیں۔'' چراغ دین نے جھک کر پرچ لی اور گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ نظام دین گھر سے باہر نکلا اور پیر سائیں کے سامنے بیٹھ کر ان کے پاؤں دبانے لگا۔

''میرے ساتھ بیٹھا کر نظام دین' کہاں چلا گیا تھا تو؟''

پیر سائیں تسبیح کے دانے تیزی سے ایک دوسرے کے اوپر گراتے ہوئے بولے۔

''پیر سائیں' بابا بیمار ہے' اسے دوا پلا رہا تھا۔ اب حاضر ہوں' قربان جاؤں۔ پیر سائیں' زمینوں پر کام کے لیے بندوں کی ضرورت ہو تو مجھ کو حکم کریں۔ چند بندے روانہ کر دوں گا۔''

''نہیں نظام دین۔'' پیر سائیں بولے۔ ''چک ۶۵ کی زمین پر اپنے مرید کام کر رہے ہیں۔ شاہ پور کی زمینوں کی دیکھ بھال بھی وہاں کے مرید کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ رنگپور چک ۳۲ رحمت آباد اور مٹھا پور کی زمین پر بھی مرید کام کر رہے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے یہاں تیرے بھائی نذر نے ہماری بہت خدمت کی ہے۔ ہم اس سے بہت خوش ہیں۔''

نظام دین سر جھکا کر پیر سائیں کے پاؤں دبا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد چائے کی چینک آ گئی۔ ساتھ ہی چند بسکٹ بھی رکھے تھے۔ نظام دین نے چائے کی کیتلی انڈیلی اور پیالی بھر کر پیر کے سامنے رکھ دی پھر بسکٹ بھی آگے بڑھا دیے۔

نظام دین کے گھر سے ایک ۹۰ سالہ بوڑھا نکلا۔ اس نے لوگوں کو جمع دیکھا تو قریب آیا اور بولا ''اوئے نظام دینا تو نے مجھے بتایا نہیں کہ پیر وزیر علی آیا ہے۔'' پھر وہ کھانسنے لگا اور پیر کی جانب بڑھا۔ اس کے پاؤں چھوئے' ہاتھوں کو چوما اور نیچے زمین پر بیٹھ گیا۔

''کیا حال ہے بابا صدیقے؟'' پیر سائیں اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

''دمہ ہے پیر سائیں' کھانسی سے رات بھر نہیں سو سکتا۔''
پھر وہ کھانستے ہوئے کہنے لگا۔ ''کوئی پھر تعویز دے دے۔''

''میں لے آؤں گا بابا تو آرام کر۔'' نظام دین باپ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

بابا صدیق اٹھ کر گھر کی جانب چل دیا۔

قریب کے دیہہ سے آیا ہوا پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک آدمی آگے بڑھا۔ پیر کے پاؤں چھوئے۔ ہاتھوں کو چوم کر آنکھوں سے لگایا اور زمین پر بیٹھ گیا۔

''یہ اللہ رکھا ہے پیر سائیں۔'' نظام دین بولا۔ ''بستی ڈھانڈلہ کا نائی ہے۔''

پیر سائیں نے مسکرا کر نائی اللہ رکھا کو دیکھا اور اس کا حال احوال دریافت کیا۔

''پیر سائیں کب آئے ہیں؟'' اللہ رکھا نے نظام دین سے پوچھا۔

''کوئی گھنٹا ایک ہوا ہے۔'' نظام دین بولا۔ ''پیر سائیں' میں ذرا کھانے کا پوچھتا ہوں۔ پکا ہے کہ نہیں۔'' یہ کہہ کر نظام دین گھر چلا گیا۔

اللہ رکھا نائی پیر کے پاؤں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا پھر اٹھتے ہوئے مؤدبانہ لہجے میں بولا ''پیر سائیں' اجازت دیں شہر جا رہا ہوں۔ کوئی مزدوری ڈھونڈوں گا۔ گھر کی چھت گر گئی ہے' اسے بنانا ہے۔ اللہ جانے کب بارش آ جائے۔ دو چار پیسے ملیں گے تو چھت ڈلوا دوں گا۔ گھر والی بھی کل سے سخت بیمار ہے۔ اس کی دوائی کے پیسے بھی نہیں ہیں۔ مزدوری کروں گا تو دو چار پیسے بن ہی جائیں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے پیر کے پاؤں چھوئے اور واپس چلا گیا۔

پیر سائیں کے ہاتھوں میں پڑی تسبیح کے دانے تیزی سے ایک دوسرے کے اوپر گر رہے تھے۔

''بہت پہنچے ہوئے ہیں اپنے پیر سائیں۔'' ایک دیہاتی نے دوسرے سے کہا۔

''ہاں دین محمد' انہی لوگوں کے دم سے ہمیں اوپر والا رزق دیتا ہے ورنہ ہم کس قابل ہیں۔ پچھلے برس میری ڈاچی بیمار ہو گئی تھی۔ ہم نے چھریاں تیز کر لی تھیں کہ اسی روز پیر سائیں آ گئے۔ انہوں نے صرف ڈاچی پر ہاتھ پھیرا اور وہ بھلی چنگی ہو گئی۔

''سبحان اللہ' سبحان اللہ' سبحان اللہ۔'' مٹھا خان پیر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

بچھڑے کے حصے بخرے ہو چکے تھے اور قصائی اپنے اوزار تھیلے میں ڈال رہا تھا۔ وہ بولا: ''جا صداقت علی' نظام دین کو بول کہ گوشت تیار ہے' اٹھوا لے۔''

صداقت علی نظام دین کو بلانے چلا گیا۔ آسمان پر چیلیں منڈلا رہی تھیں۔ دو تین کتے اپنے حصے کی ہڈیاں بھنبھوڑنے میں مصروف تھے۔ کوے اپنے اپنے حصوں کے چھیچھڑے تلاش کر رہے تھے۔ چند بھوکے کوے جن کے حصے میں کچھ نہیں آیا' تھا مسلسل کائیں کائیں کرنے لگے تھے۔ قصائی نے ایک چھیچھڑے والی بوٹی اٹھائی اور اسے دور اچھال دیا۔ دفعتاً آسمان سے ایک چیل برآمد ہوئی' بوٹی کو زمین پر گرنے سے پہلے اچک لیا اور فضاؤں میں پرواز کر گئی۔

پیر سائیں کھانا کھانے میں مصروف تھے اور ساتھ بیٹھے ہوئے لوگ انہیں مؤدبانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''پیر سائیں' کھانا کھا لیں اس کے بعد میں رمضان سے کہوں گا وہ آپ کی ڈاڑھی بنا دے گا۔ لگتا ہے ہفتوں سے ڈاڑھی نہیں بنائی آپ نے۔''

''نہیں نظام دین' میرے پاس شیو کرنے کا سامان ہے۔ واپس جا کر خود بنا لوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ دوبارہ کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔ نظام دین واپس گھر چلا گیا۔

کھانا کھا کر پیر سائیں لیٹ گئے اور اونگھنے لگے۔ چند لوگ واپس گھر چلے گئے کچھ نئے لوگ آ گئے۔ وہ پیر سائیں کے اٹھنے کا انتظار کر رہے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد پیر

سائیں اٹھے۔ نئے آنے والوں نے ان کی قدم بوسی کی۔ پیر سائیں نے سب سے مسکرا کر بات کی۔ پھر فارغ ہونے کے بعد لوٹا منگوایا۔ ایک آدمی لوٹا لے آیا۔ پیر سائیں قریب کے کھیت میں گھس گئے۔ دو تین منٹ بعد واپس آئے اور دوبارہ اپنی چارپائی پر بیٹھ کر لوگوں سے باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد نظام دین واپس آ گیا۔

''قربان جاؤں پیر سائیں' گوشت میں نے آپ کی طرف بھجوا دیا ہے۔ رمضان لے کر گیا ہے۔ آپ ذرا دعا کر دیں۔''

یہ سُن کر پیر سائیں نے ہاتھ دعا کے لیے اٹھا دیے۔ تمام بیٹھے لوگوں نے بھی ان کی تقلید کی۔ پھر تمام لوگوں نے پیر کی تقلید کرتے ہوئے ہاتھ گرا دیے۔

''نظام دین' تم نے آج میری بہت خدمت کی ہے۔'' پیر سائیں اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولے۔

''پیر سائیں' آپ ہم لوگوں کے پاس چل کر آتے ہیں۔ یہ بھی آپ کی مہربانی ہے ورنہ ہم کس قابل۔'' یہ کہہ کر اس نے سو روپے کا ایک نوٹ ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ پیر سائیں نے نوٹ دیکھے بغیر جیب میں ڈال لیا اور کہا:

''اچھا نظام دینے' میں چلتا ہوں' گھوڑا لے آ۔''

''پیر سائیں' آج ہمارے غریب خانے پر رات گزار لیتے۔'' نظام دین نے پر امید نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''پھر کبھی نظام دین۔'' پیر سائیں مسکرا کر بولے۔

''سکندر جا گھوڑی لے آ اور پیر سائیں کو ان کے ڈیرے تک چھوڑ آ۔'' نظام دین نے ایک مزارع سے کہا۔ سکندر جی اچھا کہتا ہوا گھوڑا لینے چلا گیا۔

گاؤں کی اکلوتی مسجد سے اللہ اکبر کی صدا بلند ہو رہی تھی۔

سکندر گھوڑی لے کر آ گیا۔ پیر سائیں اٹھے اور گھوڑی کی جانب بڑھے۔ تمام لوگوں نے باری باری ان کے قدموں کو چھوا اور ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ پیر سائیں گھوڑی پر سوار ہوئے اور سب کو خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ ان کے آگے آگے نظام دین کا مزارع سکندر گھوڑی کی باگ تھامے گاؤں کے کچے راستے پر پیدل چل رہا تھا۔

◆◆◆

شاید ایسا ہی ہو.....؟

سُورج سے میں نے پُوچھا ''تُم مشرق سے نکلتے ہو، بڑی آب و تاب میں ہوتے ہو۔ تمہاری کرنیں یُوں لگتی ہیں، جیسے خوشی میں مُسکرا رہے ہو، مغرب میں پہنچتے ہی تمہیں کیا ہو جاتا ہے؟ مُرجھائے ہوئے پھول کی طرح لگتے ہو یا پریشان مسافر کی طرح۔'' بولا ''مجھے مشرق کی عادات بڑی اچھی لگتی ہیں، ماں باپ کا ادب، بڑوں کا احترام، شرم وحیا، پردہ۔ اس لئے میں خوش ہوتا ہوں۔ مغرب کی بے حیائی دیکھ کر ڈوب جاتا ہوں، پژمُردہ و افسردہ ہو جاتا ہُوں۔''

میں نے پوچھا: ''تم مغرب کے ممالک میں بھی نکلتے ہو۔'' کہنے لگا ''غور سے دیکھنا، کئی کئی دِن تک میرے چہرے پر دُھند کا نقاب ہوتا ہے۔''

ہر انسان کی زندگی میں کچھ چیزیں، واقعات اور حقائق ایسے ہوتے ہیں جن کو وہ پسند نہیں کرتا۔ وہ انہیں اپنی زندگی سے نکال دینا چاہتا ہے لیکن نکالنے پر قادر نہیں ہوتا۔

اس کے سامنے دو راہیں ہوتی ہیں..... ایک یہ کہ وہ ہر وقت ان ہی چیزوں کے بارے میں سوچتا رہے، کڑھتا

مثبت سوچ کا کمال

عائشہ خان

شخصیت میں انقلابی تبدیلی پیدا کرنے والے تیر بہدف مشورے

رہے..... آزردگی اور رنجیدگی کی تصویر بنا خود اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی تکلیف کا باعث بنا رہے۔ یا اپنی سوچ کا رخ زندگی میں موجود ان چیزوں کی جانب موڑ لے جو اس کے حسب خواہش ہیں اور دل پسند ہیں۔

مثال کے طور پر ہوسکتا ہے کہ ہماری صحت بہت اچھی نہ ہو۔ جب ہم صبح بیدار ہوں تو خود کو تازہ دم محسوس کرنے کے بجائے مضمحل محسوس کرتے ہوں۔ سر بوجھل ہوتا ہو۔ جسم میں درد ہوتا ہو، اٹھنے کے لیے اپنی تمام تر توانائی مجتمع کرنی پڑتی ہو۔ لیکن ہمیں کوئی خطرناک بیماری نہ ہو۔ کسی قسم کی معذوری اور بالکل لاچار کر دینے والی تکلیف نہ ہو۔ ہم ہر جگہ آسانی سے آجا اور اپنا ہر کام خود انجام دے سکتے ہوں۔

اپنی معمولی تکلیفوں پر غمگین اور دکھی ہونے کی وجہ سے ہمارا دھیان کبھی اس طرف گیا ہی نہیں کہ ہم دنیا میں موجود ان بے شمار لوگوں سے ہزار درجے بہتر ہیں جو خراب صحت کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے بھی دوسروں کے یوں محتاج ہو جاتے ہیں کہ زندگی ایک آزمائش بن کر رہ جاتی ہے۔

ہوسکتا ہے کہ ہم بہت خوبصورت نہ ہوں لیکن بہت ذہین

ہوں۔ ہم ہر امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرتے ہوں مگر اس جیت سے حاصل ہونے والی خوشی اور مسرت سے صرف اس لیے محروم رہے کہ ہماری نگاہ اپنی کم صورتی سے ہٹ کر کہیں اور جاتی ہی نہیں۔

ہوسکتا ہے ہمارے پاس روپے پیسے کی فراوانی نہ ہو۔ ہم انتھک محنت کرتے ہوں لیکن بمشکل اتنا ہی کما پاتے ہیں کہ ضروریات زندگی پورا کرنے کے لیے بے حد سوچ کر، بڑے حساب کتاب اور کفایت کے ساتھ خرچ کرنا پڑتا ہو لیکن ہمارے پاس رشتوں کی، دوستوں کی فراوانی ہو۔ ہم پر خلوص اور محبت نچھاور کرنے والے بے شمار لوگ ہوں مگر ہمیں ان کی محبت اور خلوص کی اہمیت اس لیے محسوس نہیں ہوتی کہ ہم ہر وقت روپے پیسے کی قلت پر ہی پیچ و تاب کھاتے اور اپنا دل جلاتے رہتے ہیں۔

منفی سوچ کے زیر اثر ہم اکثر اللہ تعالیٰ کی بے حد ناشکری کر جاتے ہیں اور ہمیں پتا نہیں چلتا۔ گزشتہ دنوں ایک خاتون کو دیکھا جو میڈیکل رپورٹس کا لفافہ ہاتھ میں تھامے بڑی افسردہ اور ملول سی ڈاکٹر کے کمرے سے نکلیں۔

''پتا نہیں بے چاری کو کیا بیماری ہے۔'' میں نے رنجیدہ ہوتے ہوئے سوچا۔

''کیا بتایا ڈاکٹر نے۔'' ساتھ کھڑی میری بہن نے پوچھ لیا

''کچھ بھی نہیں۔'' بڑے تاسف سے کہا گیا ''نئے ڈنر سیٹ کے لیے پیسے رکھے ہوئے تھے جو ان ٹیسٹوں پر لگا دیے۔ تھا کچھ بھی نہیں۔'' وہ خاتون رک کر بتانے لگی اور میں حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

یہ سوچ کا وہ انداز ہے جو آج کل ہر دوسرے فرد میں نظر آتا ہے اور جسے بدلنے کی اشد ضرورت ہے۔ سوچ کے بدلتے ہی انسان کی کیفیت بدل جاتی ہے..... اور کیفیت بدلتے ہی چیزیں بدلی ہوئی نظر آنے لگتی ہیں۔

مثبت سوچ یہ ہے کہ اگر گلاب کا پھول توڑتے ہوئے کانٹا چبھ جائے تو ہم برا سا منہ بناتے ہوئے یہ نہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اتنے خوبصورت پھول کے ساتھ کانٹے ضرور لگانے تھے بلکہ..... تحسین بھرے لہجے میں کہیں ''اللہ کی قدرت ہے کہ اس نے کانٹوں کے ساتھ بھی ایسے خوبصورت پھول لگائے ہیں۔''

یا کبھی چلتے ہوئے کسی اینٹ یا پتھر سے ٹھوکر لگ جائے تو ہم اینٹ یا پتھر پھینکنے والے کو کوسنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں کہ ہمیں زیادہ چوٹ نہیں آئی..... ناخن نہیں اترا..... پاٹھوکر لگنے سے ہم گر نہیں پڑے۔

بھی کسی بہت اچھے دوست، کسی بہن، بھائی یا عزیز رشتہ دار کے رویے سے ہماری دل آزادی ہوتی ہے۔ کوئی بیماری میں ہماری مزاج پرسی نہیں کرتا..... کسی تہوار، کسی خاص دن یا خاص موقع پر ہمارا حال نہیں پوچھتا۔ اداس یا کبیدہ خاطر ہونے کے بجائے ان لوگوں کی محبت اور خلوص کے بارے میں سوچیں جنہوں نے ہمیں یاد کیا ہے اور ہر موقع پر یاد رکھتے ہیں۔

مثبت سوچ صرف ہماری کارکردگی پر ہی اثر انداز نہیں ہوتی بلکہ ہماری شخصیت پر بھی گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ ہمیں اور ہم سے وابستہ لوگوں کو خوش رکھتی ہے۔

اگر یہ سادہ سی بات ہماری سمجھ میں آجائے کہ زندگی میں ہمیں جو بھی حالات، واقعات یا حادثات پیش آتے ہیں، ان سے نبرد آزما ہونا ہی پڑتا ہے..... کیسے اور کیونکر!!! یہ بھی ہم پر ہی منحصر ہوتا ہے۔

ہمیں حالات کا رونا روتے ہوئے، مشکلات پر جلتے اور کڑھتے ہوئے خود پر ایک ناکام انسان کا لیبل لگا کر معاشرے میں پھیلے اضطراب اور انتشار میں اضافہ کرنا ہے یا پھر ہمت اور حوصلے کا مظاہرہ کرتے ان حالات و مشکلات کا مقابلہ کرنا ہے اور معاشرے کا ایک اچھا انسان اور اچھا مسلمان بننا ہے..... یہ تعین خود ہمیں ہی کرنا ہے۔

انسان اگر مثبت طرز فکر اپنالے تو یقین جانے اُسے اندھیرے میں بھی اجالے نظر آنے لگیں گے..... پتھر بھی مسکرانے لگیں گے۔

تاروں سے سجالیں گے رہ شہر تمنا
مقدور نہیں صبح، چلو شام ہی آئے

موت کو بخوشی گلے لگا لینے والے ایک فرانسیسی نوجوان کا قصہ عجب' قسمت اس پر مہربان تھی

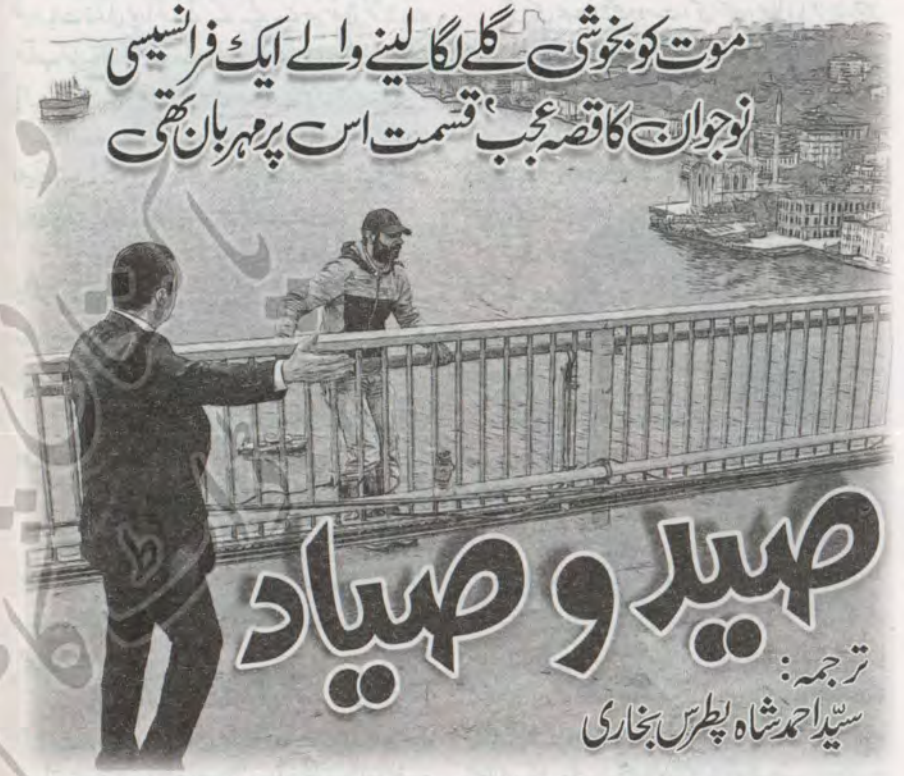

صید و صیاد

ترجمہ: سیّد احمد شاہ پطرس بخاری

پیرس کا ایک نوجوان دریائے سین کے قدیمی پل پر چلا جا رہا تھا۔ اس نے خودکشی کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ قدم نہایت آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔ جوں جوں وہ اپنی منزل کے قریب پہنچتا' دل میں اطمینان اور سکون بڑھ رہا تھا۔

اوورکوٹ کو تہہ کر کے اس نے زمین پر رکھ دیا۔ تھوڑے سے تامل کے بعد اس نے جنگلے کو مضبوط پکڑ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ دریا میں کود پڑنے ہی کو تھا کہ کسی نے اسے کندھے سے پکڑ لیا اور اس کے کانوں میں آواز آئی: ''ذرا ٹھہر جایئے حضرت!''

موت کے تمنائی نے اجنبی کے ہاتھ کو ایک جھٹکا دے کر ہٹا دیا اور پھر چھلانگ مارنے لگا لیکن اب کے بار اس کے کندھے کو دو ہاتھوں نے زور سے کھینچ لیا اور پھر وہی آواز آئی:

''حضرت! ذرا ٹھہر جایئے، صرف ایک گھنٹے کے لیے ٹھہر جایئے! کیا اتنا بھی آپ کو بہت وقت لگتا ہے؟''

سیوین نے مڑ کر دیکھا' اجنبی درمیانے قد کا ایک دبلا پتلا سا آدمی تھا۔ چہرے کے نقش باریک جن پر نیکی یا بدی کسی صفت کی کوئی تحریر نہ تھی۔ صرف ایک تفکر سا تھا۔ آواز اس نازک وقت میں بھی نہایت مطمئن معلوم ہوتی تھی۔

موسیوین کو غصہ سا آ گیا۔ اس نے اپنے دل کو جس محنت سے خودکشی پر آمادہ کیا تھا' اس کا یوں رائیگاں جانا اسے ناگوار معلوم ہوا۔ وہ جھلا کر بولا ''آپ ہوتے کون ہیں؟''

اجنبی نے کہا ''حضرت' یہی تو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ میرا ایک کام ہے جو پیرس بھر میں سوائے آپ کے کوئی نہیں کر سکتا ورنہ میں کاہے کو مخل ہوتا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ اگرچہ آپ کا خودکشی کا طریقہ نہایت بھدا سا ہے' میں کیوں دخل دیتا لیکن بات یہ ہے کہ اس وقت ایک خاتون کو آپ کی امداد کی بہت ضرورت ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو آپ یقین جانیے میں کبھی یوں آپ کو تکلیف نہ دیتا۔''

سیوین بڑی درشتی سے ہنس کر کہنے لگا ''تو تم نے میرے پاس آنے میں غلطی کی ہے۔ ایک عورت ہی کی خاطر تو میں یہاں (اس نے دریا کی طرف ہاتھ پھیلا دیا) جان کا خراج ادا کرنے آیا ہوں۔ اس سے زیادہ میں کیا کر سکتا ہوں؟''

اجنبی بولا: ''قصور ایک عورت کا اور آپ سب عورتوں کو الزام دے رہے ہیں۔ اب انکار نہ کیجیے۔ میں آپ کے منہ سے ''نہ'' نہیں سن سکتا۔ دوبارہ آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ایک خاتون کی چل کے مدد کیجیے۔ ایک حسین خاتون کی۔ آپ اپنے سفر کو ایک گھنٹے تک ملتوی کر دیجیے محض ایک گھنٹا تک، کیا یہ بہت زیادہ ہے؟ اس وقت سے لے کر ابد تک جتنا بھی زمانہ ہے' آپ اس کے مالک و مختار ہیں۔ کیا آپ اس میں سے ایک گھنٹا بھی کسی کو نہیں بخش سکتے؟''

سیوین نے جو باوجود ناراض ہونے کے اجنبی کی باتوں کو غور سے سننے لگا تھا' پوچھا ''تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

اجنبی نے کہا: ''یہاں سردی ہے۔ آپ اتنی مہربانی کیجیے کہ اپنا اوورکوٹ پہن لیجیے اور میرے ساتھ اس مے خانے تک چلیے۔ وہ جہاں سرخ روشنی نظر آ رہی ہے۔ جو کچھ مجھے کہنا ہے آپ وہاں پہنچ کر سن لیجیے۔ اگر اس سے آپ کی تشفی نہ ہوئی تو آپ بے شک واپس آ جایئے۔ اس میں ہے ہی کیا؟''

سیوین نے دریا کو ایک نظر دیکھا اور اجنبی کی بات مان لی۔ اپنا کوٹ پہنا اور ساتھ ہو لیا۔

اجنبی نے کہا: ''شکر ہے کہ آخر کار آپ مجھے مل گئے ورنہ جانے میں کہاں مارا مارا پھرتا۔ آج رات مجھے آپ سے پہلے دو آدمی ملے تھے لیکن وہ کسی کام کے نہ تھے۔ بدتمیز کہیں کے، میری سنی ہی نہیں میں کرتا کیا۔ اس وقت وہ دونوں دوسری دنیا میں ہیں۔ شاید تمنا کر رہے ہوں کہ کسی طرح واپس پیرس پہنچ جائیں لیکن آپ بالکل میرے مطلب کے آدمی ہیں۔ یہ لیجیے ہم پہنچ گئے، یہ مے خانہ ہے تو چھوٹا سا لیکن کیا مضائقہ ہے..... پہلے آپ صاحب۔''

دونوں کمرے میں ایک طرف بیٹھ گئے اور ایک دوسرے کو غور سے دیکھنے لگے۔ اجنبی کی شکل پہلے کی بہ نسبت زیادہ عقاب سے مشابہ اور زیادہ متفکر معلوم ہوتی تھی لیکن یوں دیکھنے میں برا نہ تھا۔ موسیو سیوین پچیس برس کی عمر کا نوجوان تھا۔ چہرے کے نقش نفیس ترشے ہوئے، لباس پیرس کے دیہاتیوں کا، رنگ ذرا زرد۔ بولا: ''تو تمہارا کیا مقصد ہے؟''

اجنبی نے کہا: ''مجھے مقصد تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ چل کے ''شیر شکاری'' کھیلیے۔ ''شیر شکاری'' کے کھیل سے تو آپ واقف ہوں گے؟''

''نہیں۔''

''افسوس! انسان اپنی شہرت پر کیا بھروسہ کر سکتا ہے۔ تو حضرت آپ نے میرا نام تو یقیناً سنا ہوگا؟ مجھے یول کہتے

ہیں۔"

سیوین نے کہا "کہتے جاؤ' میں نے تمہارا نام کبھی نہیں سنا۔"

یول مایوسی کے لہجے میں بولا: "جب تو مجھے بہت ہی افسوس ہے۔ تو جناب سنیے۔ جو حضرات اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہیں' ان کے لیے میں ایک ایسا طریقہ ایجاد کر رکھا ہے جس پر انہیں کسی طرح کی ملامت نہ ہو سکے۔ اگر آپ کو اس بات کا علم ہوتا تو دریائے سین جانے کے بجائے یقیناً میرے پاس آتے۔ اگر اشتہار دینے میں مجھ سے کوئی دقیقہ فروگذاشت ہو گیا ہے تو یہ میرا قصور نہیں۔ میں مجبور ہوں۔ میرا کام ہی ایسا ہے لیکن میرا خیال تھا کہ آپ نے معزز طبقوں میں میرا ذکر ضرور سنا ہوگا۔"

سیوین نے کہا: "جو کچھ تمہیں کہنا ہے جلدی کہو، آدھ گھنٹے سے زیادہ گزر چکا اور مجھے ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا۔"

یول نے کہا: "میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ دیکھیے نا، آخر ایک موجد بھی سینے میں دل رکھتا ہے۔ اس کی حسیات کو بھی صدمہ پہنچ سکتا ہے۔ تو صاحب بات یہ ہے کہ آپ جانتے ہیں انسان ایک حیوان متمدن ہے۔ تمدن حقوق و فرائض کے باہمی تعلقات کا نام ہے۔ چند فرائض ایسے بھی ہیں، جن کو زندگی کے آخری لمحوں میں بھی پورا کرنا ضروری ہے۔ سوسائٹی کا تقاضا یہی ہے۔ کیا آپ کو دنیا سے یوں اکیلے جانا مناسب معلوم ہوتا ہے جب کہ کئی لوگ ایسے موجود ہیں جو تشریف لے جانے میں مدد دینے کے لیے تیار ہیں۔ تیار کیا؟ خواہش مند ہیں۔ جن کی مدد سے آپ کے وداع آخری کو نہ صرف زیادہ پر لطف بلکہ زیادہ خوبصورت بنایا جا سکتا ہے۔

"اس حسن آفرینی کے لیے میں نے ایک معمولی سا کھیل ایجاد کیا ہے جس میں دو کھلاڑی اعلیٰ درجے کا لطف حاصل کر سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک کا انجام قطعی یقینی ہوتا ہے۔ زندگی سے تنگ آئے ہوئے دو آدمی آپس میں قرعہ اندازی سے فیصلہ کر لیتے ہیں کہ کون شیر ہے اور کون شکاری۔ اس کے بعد شیر اپنے گلے میں نقرئی گھنٹی باندھ لیتا ہے۔ شکاری ہاتھ میں ایک بھرا ہوا پستول لیتا ہے۔ کمرے کے تمام چراغ گل کر دیے جاتے ہیں اور صید و صیاد کو تنہائی میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ پھر شیر کی مرضی کے مطابق موسیقی سے اس کی سامعہ نوازی کی جاتی ہے۔ پھر موسیقی بند ہو جاتی ہے۔"

"شیر کی حرکت سے اس کے گلے میں لگی گھنٹی بجتی ہے۔ شکاری اندھیرے میں فائر کرتا ہے ایک دفعہ اور پھر ایک دفعہ اور۔ پھر چراغ روشن کر دیے جاتے ہیں۔ اگر شیر زخمی ہو گیا تو وہ یقیناً مر جاتا ہے کیونکہ سب گولیاں زہر آلود ہوتی ہیں۔ اگر وہ بچ جائے تو گھنٹی اس کے گلے سے اتار کر شکاری کے گلے میں باندھ دی جاتی ہے اور یہ کھیل پھر سے شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کھیل جاری رہتا ہے حتیٰ کہ ان میں سے ایک رخصت ہو جاتا ہے۔"

"پہلے پہل صرف مردوں میں اس کھیل کا رواج تھا۔ لیکن جب اس کی شہرت بہت بڑھ گئی تو ایک خاتون نے بھی اس میں شرکت کی درخواست کی۔ یہ بدعت کسی قدر پسند کی گئی۔ اب جہاں تک ممکن ہو سکے ایک مرد کو ایک عورت کا شریک بنایا جاتا ہے۔ عام طور پر وہ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں۔ تو صاحب اس کھیل کو بہت پسندیدگی نصیب ہوئی۔ میں نے اس میں ایک دو جدتیں بھی کی ہیں۔ مثلاً کبھی کبھی ایک خالی کارتوس بھی بھر دیتا ہوں۔ سوائے میرے اور کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ کون سا کارتوس خالی ہے۔ اس سے ذرا لطف اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ معزز خواتین و حضرات کو اب اس بات کی ضرورت نہیں کہ دریائے سین میں پڑے پائے جائیں۔ وہ اب اس پر لطف موت کو ترجیح دیتے ہیں۔"

سیوین نے پوچھا: لیکن تمہاری اس ہرزہ سرائی کا مجھ سے کیا تعلق؟ اگر مجھے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا منظور ہے تو یہ میرا اپنا ذاتی معاملہ ہے۔ تم اس میں کیوں دخل دیتے ہو؟ میں

سمجھتا ہوں تمہیں اپنے اس قبیح فعل کے لیے کسی فیس کی توقع ہے تو وہ پھر تم کو مجھ سے نہ ملی، میں واپس پل پر جا رہا ہوں اور نہیں سمجھتا کہ کسی طرح بھی تمہارا ممنون ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اپنی ٹوپی کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

یول نے نوجوان کا کوٹ پکڑ کر کہا: "خدا کے لیے پانچ منٹ یہاں اور بیٹھ جائیے۔ میں آپ سے کوئی فیس نہیں مانگتا۔ آج رات ایک ڈیوک اور ایک خاتون کو آپس میں یہ کھیل کھیلنا تھا۔ خاتون تو پہنچ گئی لیکن ڈیوک صاحب اب تک تشریف نہیں لائے۔ ان کے بغیر کھیل کیسے کھیلا جا سکتا ہے؟ اس طرح کا واقعہ کبھی پہلے پیش نہیں آیا۔ اس میں میری سخت بدنامی ہے۔ دربار میں یہ خبر پہنچی تو میری ناموری میں خلل آ جائے گا۔ آپ چل کر ڈیوک کی جگہ لیجیے اور مجھے اور اس خاتون کو اپنا شرمندۂ احسان بنائیے۔ اگر خدانخواستہ آپ اس کے نشانے سے بچ گئے تو خاتون پر احسان کر کے واپس یہاں تشریف لے آئیے۔"

سیوین نے گھبرا کے پوچھا: "تم چاہتے ہو میں اس کی جان لے لوں۔"

یول نے کہا: "یہ کیا ضروری ہے؟ ممکن ہے آپ اس کا نشانہ بن جائیں۔ آپ یہ بتائیے کہ آپ کو دونوں میں سے کون سی بات پسند ہے..... چشم زدن میں ایک حسین خاتون کے ہاتھوں مر جانا یا ایک دریا میں پڑے سڑتے رہنا۔ جہاں اس بات کا بھی خطرہ ساتھ لگا ہے کہ کوئی خدائی فوجدار آ کے آپ کو نہ بچا لے۔ کس قدر شرم کی بات ہے۔ میرے ہاں آپ کی تسلی کے لیے کم از کم یہ خیال تو ہوگا کہ آپ کی موت دل پسند صحبت میں واقع ہوئی ہے۔"

سیوین نے کہا: "ممکن ہے میں جانبر ہونے کو ایک حسین عورت کے قتل پر ترجیح دوں۔ تمہیں تمہاری ایجاد مبارک ہو، جس کی بدولت تم نے خدا جانے کتنے انسانوں کو پیش از وقت مروا دیا ہے۔"

موجد بولا: "حضرت' آپ بہت کج نگاہی سے کام لے رہے ہیں۔ آپ کے الفاظ سے مجھے صدمہ پہنچا۔ ذرا آپ غور تو فرمائیے۔ میں نے کس کو جا کر کہا کہ تم قبل از وقت مر جاؤ۔ میرے پاس تو وہی لوگ تشریف لاتے ہیں جنہوں نے مر جانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ اس کا فائدہ کیا؟ یہ سنیے (جیب سے ایک پاکٹ بک نکال کر) یہ میرے بہی کھاتے کا حساب ہے۔ آج تک کل بیاسی فرمائشیں ہو چکی جن میں سے باون مردوں کی تھیں اور تیس عورتوں کی۔ کل بیالیس بازیاں کھیلی جا چکی۔ نتیجہ؟ بیالیس اموات۔ اب حضرت! اگر میرے مربی اپنا طریقہ مرگ خود سوچتے تو اموات کی تعداد اس سے قریباً دگنی ہوتی۔ ہے یا نہیں؟ جناب عالی! میں تو مصلح بنی نوع انسان ہوں۔ میں تو جانیں بچاتا ہوں۔"

سیوین نے کہا: "اور تمہیں اس بات کا خیال نہیں کہ جو لوگ تمہاری بازی کے بعد زندہ بچ جاتے ہیں' وہ پھر کسی اور طرح خودکشی کر لیتے ہوں گے۔"

"حضور مجھے معاف کیجیے۔ آپ پھر غلطی پر ہیں۔ پہلی اکتالیس بازیوں میں سے جو زندہ بچ گئے ممکن تھا کہ وہ سب آپس میں پھر یہ کھیل کھیلتے۔ حتیٰ کہ ان میں سے صرف ایک باقی رہ جاتا لیکن ہوا یوں کہ زندہ بچ جانے والوں میں سے صرف ایک نے دوبارہ مرنے کی خواہش کی۔ اس ایک کے ماسوا باقی سب اپنے اپنے گھر چلے گئے اور جاتے ہوئے میرا شکریہ ادا کرتے گئے۔ اندھیرے میں گولی چلنے کا ڈر' ایک مختصر، مگر شدید انتظار مرگ' مجروح نعش کا گھناؤنا نظارہ..... یہ ایسی ہیبت ناک باتیں ہیں کہ جو لوگ زندہ رہ جائیں وہ پھر فیصلہ کر لیتے ہیں کہ مرنا ہے تو گھر جا کر طبعی موت ہی مریں گے۔ حضور! اگر آپ چل کر اس خاتون کے سر پر تھوڑا سا احسان کر دیں اور خوش قسمتی یا بدقسمتی سے آپ اس کی گولیوں سے بچ جائیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ خدا تعالیٰ کا شکریہ ادا کریں گے کہ زندہ بچ گئے۔"

سیوین نے کہا: ''خیر یہ بات تو غلط ہے لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ تمہاری باتیں بہت دلچسپ ہیں۔ میں یہ کھیل کھیلنے کو تیار ہوں۔ بقول تمہارے زیادہ سے زیادہ یہی ہوسکتا ہے کہ میری موت چند گھنٹے دیر میں آئے اور کیا؟''

یول بے انتہا مسرور ہوا اور بڑے لچھے دار فقروں میں شکریہ ادا کرنے لگا۔

سیوین نے اس کی بات کو کاٹ کر کہا: ''بل ادا کرو اور چلو چلیں۔ بہت وقت ضائع ہو چکا۔''

مے خانے سے نکلے تو یول آگے آگے چلنے لگا۔ چلتے چلتے وہ تنگ و تاریک گلیوں میں پہنچ گئے جہاں کہیں کہیں آویزاں لیمپ کی ناکام روشنی رات کی سیاہی کو اور بھی تاریک کر دیتی تھی۔ یول نہایت لسانی سے باتیں کرتا جاتا تھا۔ شاید اس ڈر سے کہ کہیں ساتھی خاموشی سے گھبرا کر واپس ہو جانے کا ارادہ نہ کر لے۔ دن بھر کی تازہ خبروں پر تبصرہ کرتا رہا۔ کبھی دربار شاہی کے معاملات پر اور کبھی تازہ ترین ڈرامے کے متعلق کہ فلاں اداکارہ نے بہت بری طرح ایکٹ کیا اور گاتے وقت بے سری ہو گئی۔ جب باتیں ختم ہو چکیں تو اس نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور چاند ستاروں کے متعلق تقریر شروع کر دی۔ سیوین بالکل خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔

پانچ منٹ چلنے کے بعد وہ ایک کشادہ بازار میں پہنچے اور کسی قدر بڑے گھر کے دروازے کے سامنے ٹھہر گئے۔ یول نے ایک گھنٹی کی رسی پکڑ کر کھینچا۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازے کی کھڑکی سے کسی نے باہر جھانکا اور آواز آئی ''کون ہے؟''

یول نے کہا: ''میں ہوں دروازہ کھولو۔''

دروازہ کھلا اور یہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ یول نے پوچھا: ''وہ خاتون ابھی یہیں ہیں؟''

جواب ملا: ''ہاں صاحب۔''

''ڈیوک آئے ہیں۔'' جواب ملا ''نہیں صاحب۔''

یول نے اپنے ساتھی کی آستین پکڑ کر کہا: ''آیئے۔''

دونوں ایک کمرے میں داخل ہوئے جہاں ایک بربط دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ میز پر ایک رباب رکھا تھا۔ کرسی پر ایک عورت سوئی پڑی تھی۔ شکل حسین نہ تھی۔

سیوین نے مایوس ہو کر پوچھا: ''کیا یہی وہ خاتون ہیں؟''

یول نے کہا: ''نہیں صاحب! یہ تو بربط بجانے والی عورت ہے۔ انتظار کرتے کرتے تھک کر سو گئی۔ وہ خاتون تو ساتھ کے کمرے میں ہیں۔ آپ اپنی ٹوپی اور لبادہ اتار کر یہاں لٹکا دیجیے۔ یہ ایک معمولی سی رسم ہے۔ اسے بھی پورا کر دیجیے یعنی یہ نیم نقاب پہن لیجیے۔ گمنامی میرے یہاں کا سب سے مقدم اصول ہے۔ ٹھیک۔ ادھر کو تشریف لائیے۔''

ساتھ کا کمرا پہلے کمرے سے بڑا تھا۔ فرنیچر تھوڑا مگر اچھا تھا۔ ایک دیوار تصویروں سے بالکل عاری تھی۔ انگیٹھی میں لکڑیاں جل رہی تھیں اور آگ کے سامنے ایک عورت نہایت قیمتی لباس پہنے بیٹھی تھی۔ دروازہ کھلا تو وہ چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی: ''اب آ بھی چکو۔ اتنی دیر کر دی تم نے' اگر میرا دل مضبوط نہ ہوتا تو میں کب کی واپس چلی گئی ہوتی۔''

یول نے کہا: ''بیگم صاحبہ میں تہ دل سے معافی کا خواستگار ہوں۔ مجھے کچھ مشکلات پیش آ گئی تھیں جن کی وجہ سے میں رک گیا۔ یہ میرے ساتھ جو صاحب ہیں' وہ ان بے وفا حضرت کی قائم مقامی کریں گے جو آنے کا وعدہ کر کے نہیں آئے۔ اب قاعدے کی رو سے آپ کو آدھ گھنٹا دیا جاتا ہے۔ آپ اس دوران ایک دوسرے سے واقفیت پیدا کر لیجیے۔ یا دنیا کے لیے کوئی پیغام چھوڑنا ہو تو وہ لکھ ڈالیے۔''

عورت نے اٹھ کر کہا: ''نہیں میں ضرورت سے زیادہ انتظار کر چکی۔ یہ ابھی اور انتظار کیا معنی؟ اجنبی صاحب' اگر ہم قاعدے کی خلاف ورزی کر کے یہ آدھ گھنٹا استعمال میں نہ لائیں تو آپ کو اعتراض ہے؟''

سیوین نے کہا: ''سچ بات یہ ہے کہ تھوڑی دیر ہوئی میں

فوراً اس دنیا سے رخصت ہو جانا چاہتا تھا لیکن کچھ یول کی باتوں اور کچھ آپ کی ملاقات کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ جلد بازی سے کوئی فائدہ معلوم نہیں ہوتا۔ آپ یہ آدھ گھنٹا ٹھہر جایئے۔ مجھے آپ سے یہ درخواست کرنے کا حق ہے کیونکہ آپ ہی نے میرے اصلی ارادے کو درہم برہم کر دیا۔ آپ نہ ہوتیں تو میں اس وقت دریا کی تہ میں پڑا ہوتا یا بہہ کر سیورے تک پہنچ گیا ہوتا۔''

خاتون نے کہا: ''جس طرح آپ کی مرضی ہو صاحب! افسوس کہ میں اس وقت اپنی رفاقت میں کوئی دل پذیری پیدا نہیں کر سکتی''۔

چند منٹ تک کمرے میں بالکل خاموشی رہی۔ سیوین حسینہ کے چہرے کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ نقاب نے چہرے کا بالائی حصہ مستور کر رکھا تھا پھر بھی تھوڑی کی گولائی، ہونٹوں کی کمان اور چھوٹے چھوٹے کانوں کی خوبصورتی بالوں کے گھنگریالے جال سے جھانک رہی تھی۔ شاید خاتون بھی اسی طرح اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ بہرحال ان کی آنکھیں کبھی کبھی چار ہو ہی جاتی تھیں۔

اتنے میں خاتون بولی: ''جناب اگر ہمیں اپنی زندگی کے آخری لمحے اکٹھے ہی گزارنے ہیں تو ہنس کھیل کے ہی گزار دیں۔ دو گھنٹے خاموش بیٹھی رہی ہوں۔ ذرا میرے دل کو بہلنے دیجیے۔ خدا کے لیے بات کیجیے۔''

سیوین نے کہا: ''بسر و چشم' کیا بات کروں۔ اچھا استعارے میں بات کرتا ہوں۔ جب میں ادھر آ رہا تھا تو راستے میں یول ستاروں کے متعلق باتیں کرتا رہا تھا۔ ایک طرف زہرہ دکھائی دے رہی تھی۔ یول نے مجھ سے پوچھا تھا' یہ زہرہ یہاں کیسے آ گئی؟ اسی قسم کا ایک سوال اس وقت میرے دل میں پیدا ہوتا ہے کہ زہرہ یہاں کیسے آ گئی۔ کیا دنیا میں کوئی ایسا دل باقی نہیں رہا جسے توڑا جا سکے۔ کوئی ایسا انسان موجود نہیں جو حسن کا فریب کھا سکے۔ دل توڑنے کا مشغلہ اسی قدر دل چسپ ہے جس قدر یہ کھیل جو ہم کھیلنے والے ہیں۔ اسی طرح اس میں بھی صرف ایک ہی آدمی مجروح ہوتا ہے۔ میں پھر پوچھوں گا کہ زہرہ یہاں کیسے آ گئی؟''

خاتون نے جواب دیا: ''جناب معلوم ہوتا ہے آپ کو تشبیہوں کا بہت شوق ہے۔ یہ سوال آپ کسی اور وقت پوچھتے تو میں اس کو آپ کی دیدہ دلیری سمجھتی اور خاموشی کے سوا دوسرا جواب دینا گوارا نہ کرتی، لیکن اب چونکہ ہم میں سے ایک کو صرف آدھ گھنٹا اور زندہ رہنا ہے لہٰذا میں سمجھتی ہوں کہ صاف گوئی سے کام لیا جائے تو بہتر ہوگا۔ تو جناب زہرہ کے یہاں موجود ہونے کی وجہ عطارد ہے جس کی ظاہری شکل و صورت تو اچھے بھلے انسان کی تھی لیکن دل دغا سے بھرا ہوا تھا۔''

سیوین نے کہا: ''اس کے اور حالات سے مجھے آگاہ کیجیے۔''

خاتون نے حقارت آمیز لہجے میں کہا: ''میں اس سے زیادہ کیوں بتلاؤں۔ میں راز کے بدلے راز کا اظہار کر سکتی ہوں۔ گمنام صاحب! آپ بتایئے۔ آپ یہاں کیوں تشریف لائے؟''

''بیگم صاحبہ! میرے یہاں آنے کا باعث حسن و خوبی کا ایک درخشندہ ستارہ ہے۔ کچھ عرصے تک میری ہمراہی میں گردش کرتا رہا لیکن ستارہ آخر میں آپ کی طرح کج رفتار نکلا۔ اب وہ ایک سپاہی کی آغوش میں چمک رہا ہے۔ یہ دنیا اس کے بغیر تاریک ہے' اسی لیے کسی دوسری دنیا میں جانا چاہتا ہوں۔''

''تو آپ سے ایسا سلوک پہلے کبھی نہیں ہوا؟''

''کبھی نہیں۔ اسی لیے میں نے قسم کھالی ہے کہ پھر اس طرح کا واقعہ کبھی پیش نہ آئے گا۔''

''آپ کے خیال میں وہ خاتون اس قابل ہے کہ اس کی خاطر جان یوں قربان کر دی جائے۔''

''کیا آپ کا محبوب اس قابل ہے۔''

خاتون نے جوش میں آ کر کہا: ''ہرگز نہیں۔ قطعاً نہیں۔ آپ یہ نہ سمجھیے کہ دل شکستہ کا مرہم جان کر اس کی طلب گار ہوں۔

آپ کا شاید یہ خیال ہو لیکن میں تو صرف اس لیے مرنا چاہتی ہوں کہ مبادا دربار شاہی کے لوگ میری ہنسی اڑائیں۔ زندگی میں پہلے بھی ایک دفعہ مجھ سے یوں دغا کی گئی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تیسری دفعہ پھر یوں ہو! مرد جھوٹے اور بے وفا ہیں۔"

"بیگم صاحبہ! ایک آپ کو چھوڑ کر عورتیں بھی کچھ کم نہیں۔"

بات کو یہاں پہنچا کر دونوں غمزدہ نظروں سے آگ کے شعلوں کو دیکھتے رہے۔ تھوڑی دیر خاموشی کے بعد سیون نے کہا: "بیگم صاحبہ! زندگی کی چند گھڑیاں باقی ہیں۔ آپ میری اتنی بات مان لیجیے کہ اپنا نقاب اتار کر مجھے اپنا چہرہ دکھا دیجیے۔"

خاتون نے نہایت بے پروائی سے کہا: "کیوں؟"

"میری آرزو ہے کہ میں اس خاتون کی شکل دیکھ لوں جو ابھی مجھے دوسری دنیا میں بھیج دے گی یا مجھ سے چند منٹ پہلے وہاں جا پہنچے گی۔"

جواب ملا: "فضول تمنا ہے۔ آپ کو چاہیے کہ اس وقت آپ اپنے دل کو اعلیٰ وارفع خیالات میں مصروف رکھیں۔"

سیون نے کہا: "بیگم صاحبہ! یہ نہ کہیے۔ ابھی ابھی مجھ سے یول نے کہا تھا کہ انسان ایک حیوان متمدن ہے۔ ہم ایک طویل سفر کی تیاری کر رہے ہیں۔ اگر میں اپنے ہم سفر کی شکل دیکھنا چاہوں تو یہ کون سی تعجب کی بات ہے۔ معاف کیجیے' آپ کو میرا شرمندۂ احسان ہونا چاہیے۔ آپ نہ ہوتیں تو میری تکلیف کا اب تک خاتمہ ہو گیا ہوتا۔ پھر آپ کی گولی کا نشانہ بننا یا آپ کو اپنا نشانہ بنانا کوئی معمولی سی بات نہیں.... مجھے اپنی شکل دکھا دیجیے۔"

کچھ دیر تک وہ تامل میں رہی۔ پھر کہنے لگی "جناب فی الحقیقت، بقول آپ کے میں آپ کی احسان مند ہوں۔ آپ کا حکم ماننے کے بغیر چارہ نہیں۔ آپ بھی اپنا نقاب اتار دیجیے۔"

دونوں نے اپنے نقاب اتار دیے اور غور سے ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھتے رہے۔ سیوین خوش شکل تھا لیکن بے نقابی نے خاتون کے چہرے کے جس حسن کو آشکار کر دیا تھا اس کی توقع سے بالا تھا۔ باریک نفیس ابرو، جیسے کسی خوش مذاق مصور کی قلمطرازی، نیلی نیلی خوبصورت آنکھیں، لمبی لمبی محبوب پلکیں اور آنکھوں کی نیلگوں گہرائیاں۔ سیون کا دل دھڑکنے لگا۔

خاتون نے کہا: "کیا آپ کو میرے چہرے میں کوئی ایسی قباحت نظر آتی ہے جس کی وجہ سے دو مرد مجھ سے یوں منہ پھیر لیں۔"

سیوین نے کہا: "جو کچھ میری آنکھوں کو نظر آ رہا ہے اس سے تو ایک تیسرا شخص بھی مسحور ہو سکتا ہے۔ اگر ان دونوں نے آپ سے بے وفائی کی تو وجہ اس موہنی صورت میں مجھے کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ کیا انہوں نے کوئی اور وجہ نہیں بتائی؟"

"ایک بے وفا کو میرا افلاس ناگوار تھا۔ جب میرے والد کے ساتھ ہی میرا اتمول بھی رخصت ہو گیا اور ناداری نے مجھے آن گھیرا تو میرا عاشق ایک دن مجھے ملنے آیا۔ عشق و محبت کی داستان رک رک کے اور تھم تھم کے مجھ سے کہتا رہا۔ آواز میں عجز تھا' انداز میں انکسار۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ گیا کہ میں محض اپنی آمدنی پر گھر بار کے اخراجات کا کفیل نہیں ہو سکتا۔ شادی کیسے ہو سکتی ہے۔ حضرت میرے جہیز کی ہوس میں منہ کھولے بیٹھے تھے۔ دور اندیش واقع ہوئے تھے۔"

سیون نے جیسے ایک درد محسوس کر کے کہا: "او خدا ایسی شکل کو دیکھنا اور پھر دور اندیش رہنا چہ معنی؟ آپ کے عشق کا دوسرا شعلہ' وہ عطارد بھی دور اندیش تھا؟"

"نہیں اب میں دولت مند ہوں۔ چچا کے مرنے پر مجھے بہت کچھ ورثے میں ملا۔ میرے سورما کا دل اور شمشیر چھ مہینے تک میری معبوسی کرتے رہے لیکن آہ میں کیا کہوں۔ جوانمرد سپاہی ایسے نہیں ہوا کرتے۔ یکایک انہوں نے حسن کا معیار بدل لیا۔ ذرا عذر ملاحظہ فرمائیے۔ میری دردمندی کا بھی خیال کیجیے۔ مجھ کو لکھتے ہیں: "رنگ کے بارے میں میرے خیالات کچھ بدل گئے ہیں۔" اب تک وہ اندھا تھا۔ ایک نئی محبوبی نے اسے بصارت بخشی۔ اب اسے نیلی آنکھوں کی بجائے بھوری آنکھیں اچھی لگتی ہیں۔"

سیون نے کہا: "یہ کس طرح ممکن ہے لیکن نہیں بیگم صاحبہ، یوں ہو سکتا ہے۔ اس سے پیشتر مجھے بھورا رنگ دنیا کے تمام رنگوں سے پیارا معلوم ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر ہوئی میں نے اپنا مذہب بدل ڈالا۔ اب اس نیلے رنگ کی قسم کھایا کروں گا۔"

"حضرت آپ اسی بھورے رنگ کا ذکر کر رہے ہیں جس کی خاطر آپ ایک گھنٹا پہلے جان دینے کو تیار تھے؟"

"بیگم صاحبہ میں شاعر ہوں۔ جس بے رحم عورت کی خاطر میں آج جان دینے والا تھا' اس کی صورت میں مجھے تمام محاسن، سب کی سب خوبیاں نظر آتی تھیں۔ میں نے اس کی تعریف میں قصیدے لکھ لکھ کر گائے ہیں لیکن اب مجھے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ یہ میری جہالت کا نتیجہ تھا۔ میں گاؤں کا رہنے والا ہوں اور مجھے شہر سے نفرت تھی۔ اب مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو رہا ہے۔ میں اسے تمام عورتوں سے بڑھ کر حسین جانتا تھا' اس لیے کہ ابھی آپ کو دیکھا نہ تھا۔"

نفرت آمیز جواب ملا: "شاعر صاحب کیا کہنے! آپ بھی اور مردوں کی طرح ہر لحہ بدلنے والے ہیں۔ آپ بھورے رنگ کی پرستش کرتے ہیں۔ اس کے لیے جان دینے کو تیار ہوتے ہیں اور بہ مشکل ایک گھنٹا گزرنے پاتا ہے کہ آپ کو نیلا رنگ موہ لیتا ہے۔ شاید آپ نیلے رنگ کے لیے بھی جان دینے کو تیار ہو جائیں۔"

سیوین نے کہا: "میں نیلے رنگ کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ یہ نیلی آنکھیں مجھے بہ التفات نظر دیکھیں تو یہی زندگی جنت ہو سکتی ہے۔"

خاتون طنزاً ہنس دی اور کہنے لگی: "جناب' آپ یقین مانیے کہ نیلا رنگ کبھی مہربان نہیں ہو سکتا۔ آپ شاعر لوگ سمندر کو نیلا کہتے ہیں لیکن اس کی لہریں غرق وفنا کر سکتی ہیں۔ آسمان نیلگوں ہے لیکن اس کی بجلیاں تاراج کر سکتی ہیں۔ ابھی میں آپ کو دکھا دوں گی کہ نیلی آنکھیں پستول کا نشانہ بھی لگا سکتی ہیں۔"

سیون نے آہستہ سے کہا: "آپ کو شاید یاد نہیں کہ پستول اندھیرے میں چلانا ہوگا۔"

خاتون نے جوش میں آ کر کہا: "میں بہت ہی خوش ہوں کہ آپ تشریف لے آئے۔ آپ کو مار دینے سے مجھے بہت ہی مسرّت حاصل ہوگی۔"

سیوین نے کہا: "اب میری سمجھ میں آیا ہے کہ دور اندیش صاحب اور عطارد نے کیوں آپ سے بے اعتنائی کی۔ بیگم صاحبہ! یہ برہم مزاجی نیلی آنکھوں کو نہیں سجتی۔ آپ بہت بے رحم ہیں لیکن آپ کے عطارد کا دل معلوم ہوتا ہے شعریت سے بالکل مبرا تھا۔ عتاب میں بگڑنا آپ میں جو حسن پیدا کر دیتا ہے' وہ اسے دیکھ نہ سکتا تھا۔ ان نیلی آنکھوں میں جب غصہ چمک آئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا آسمان کی نیلگوں گہرائیوں کے تلاطم میں کہیں سورج نظر آ رہا ہے۔ پھر اس پر بادل گھر کر آ جاتے ہیں پھر کس ناز سے بجلیاں چمکتی ہیں پھر شاید چند بوندیں ٹپک پڑتی ہیں اور پھر سورج اپنا رخ تاباں بے نقاب کر دیتا ہے۔ جس نے اس روح افزا نظارے کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں' وہ حسن کی کس طرح قدر کر سکتا ہے؟ لیکن بیگم صاحبہ اگر میں آج رات زندہ بچ جاؤں تو، ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا۔ جو آپ کے ساتھ بے وفائی کر گئے ہیں' کف افسوس ملیں۔ آپ کو فردوس کی پرفضا گل گشتوں میں مسرت ہو کہ اے کاش میں اس بے چارے شاعر کی پرستش قبول کر لیتی اور زندہ رہتی۔ اس وقت شہرۂ آفاق ہوتی۔"

اس تقریر کے دوران خاتون اس کے چہرے کا نہایت

غور سے مطالعہ کرتی رہی۔ آخر بولی: ''سبحان اللہ! کیا فصاحت ہے۔ کیا شاعر احمق ہوتے ہیں۔ کیوں صاحب! کوئی شخص آپ کی نظموں کو چھاپنا بھی گوارا کرتا ہے؟''

شاعر نے فخر و غرور سے کہا: ''بیگم صاحبہ میرا نام ایڈمنڈ موسیوین ہے۔''

''کون سیون؟ مان کانٹو کا رہنے والا؟''

شاعر نے کہا: ''میں وہی ہوں۔ آپ کو میری نظموں میں سے کون سی پسند ہے' حسن شیریں' یا 'عشق لیلیٰ'؟

''نظمیں؟ میں نے نظمیں کبھی نہیں پڑھیں! شاعر کا سیوین نام میں نے آج سے پیشتر کبھی نہیں سنا۔ کیا آپ کی محبوبہ اس بھوری آنکھوں والی کا نام ڈوبائے ہے؟''

''ہاں، ہاں۔ مگر آپ اسے کیونکر جانتی ہیں؟''

''میرا کپتان، میرا سورما، میرا اعطارد مان کانٹو میں اسے اپنا دل دے چکا۔ مجھے اس نے خط میں لکھا تھا کہ وہ پہلے سیوین نامی ایک مجنوں شاعر کی دلدادہ تھی۔ اب وہ ایک جنگ جو اور بہادر سپاہی کو ترجیح دیتی ہے۔ میرا اعطارد مشہور خطوط باز ہے۔ خط بہت مفصل لکھا کرتا ہے۔''

غصے سے سیوین کا چہرہ تمتما اٹھا اور وہ بیتاب ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ آخر کار بولا:

''سو بیگم صاحبہ آپ ہی ہیں جنہوں نے بے دردی کے ساتھ میری خوشی، میری راحت مجھ سے چھنوا دی۔ اگر آپ اپنے اس سورما کو سنبھال کر رکھتیں تو میں اپنی زندگی مسرت اور اطمینان سے گزارتا۔ میں شہر ایک ضروری کام کے لیے آیا تھا۔ مجھے کیا معلوم کہ میری عدم موجودگی میں میری دولت کو یوں ایک لٹیرا آ کر لوٹ لے جائے گا۔''

اس نے اتنا کہا اور ٹہل کر کمرے کی ایک دیوار سے دوسری دیوار تک چلا گیا۔ وہاں سے مڑ کر اس نے اپنی نظریں خاتون کے چہرے پر گاڑ دیں۔ گرمی تقریر سے خاتون کے چہرے پر ایک سرخی جھلک رہی تھی۔ آنکھوں میں ایک نور چمک رہا تھا۔ اس کے حسن کا طلسم پہلے سے بھی زیادہ ہوش ربا تھا۔

سیوین کی پلکوں کو انکسار نے جھکا دیا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور پیکر التجا ہو کر بولا: ''بیگم! کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ اپنے سورما کو بھلا دیں اور میں اپنی بے وفا محبوبہ کو بھول جاؤں اور......''

''اور کیا؟''

''اور ہم دونوں ایک دوسرے کے ہو جائیں؟''

خاتون نے قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستی رہی۔ اتنی دیر تک کہ سیوین توہین محسوس کرنے لگا۔ کہنے لگی: ''شاعر صاحب! میں آپ کے عشق کی پائیداری کو تو نہیں سراہا سکتی۔ البتہ آپ کی جدت طبع کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتی لیکن مجھے افسوس ہے میں آپ کی دانش مندانہ تجویز قبول نہیں کر سکتی۔ میں نے عشق کی پہچان الفاظ سے کرنی چھوڑ دی ہے۔ جو مجھ سے شادی کرنا چاہے' اسے کچھ کر کے دِکھانا پڑے گا۔ میں اپنا دل کسی ایسے آدمی کو نہیں دے سکتی جو آج تو نیلی آنکھوں پر مرتا ہے اور پھر قوس قزح کے ساتوں رنگ باری باری اسے اپنی طرف مائل کر لیتے ہیں۔ مجھ سے ایسی حماقت نہیں ہو سکتی اور چونکہ ایسے شخص کا ملنا ناممکن ہے اس لیے......''

اتنے میں دروازہ کھلا اور یول اندر داخل ہوا۔ دونوں کو بے نقاب دیکھ کر چونکا اور کسی قدر درشتی سے کہنے لگا: ''یہ سخت بے قاعدگی ہے۔ آپ از راہ نوازش اپنا اپنا نقاب پہن لیجئے۔''

خاتون نے کہا: ''اب کیا ہے؟ اب تو ہم نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا ہے۔ یول! تمہیں جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔ یہ صاحب تو ایسے خشک گفتار ہیں جیسے کوئی واعظ۔ آپ شاعر ہیں اور مجھے شاعروں سے نفرت ہے۔ میں انھیں گولی سے بھی مار سکتی ہوں۔''

یول نے ایک تھیلی آگے بڑھا کے کہا: ''اس میں کپڑے کی بہت سی چھوٹی بڑی کترنیں ہیں۔ آپ ایک ایک کترن نکال لیجئے۔ جس کے حصے میں چھوٹی کترن آئے گی اسے ہٹنا پڑے گا۔''

خاتون نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر کپڑے کا ایک ٹکڑا نکال لیا۔ سیون نے بھی اپنی قسمت آزمائی۔ کترنوں کو ایک ساتھ رکھ کر ماپا گیا۔

خاتون پکار اٹھی: ''میں شکاری ہوں۔''

سیوین نے کہا: ''اور میں شیر ہوں۔ بیگم صاحبہ! گولی بالکل سیدھی چلائیے گا تاکہ یہ جھگڑا جلد پاک ہو جائے۔''

یول نے کہا: ''یہ دیکھیے یہ گھنٹی ہے، اسے اپنے گلے میں لٹکا لیجیے اور ہلا کے دیکھیے ٹھیک بجتی ہے یا نہیں۔ ٹھیک۔ بیگم صاحبہ یہ رہا پستول۔ اس میں کسی طرح کا نقص نہیں۔ صاحب' آپ اس دیوار کے سامنے ہی رہیے اور جس وقت موسیقی بند ہو جائے تو دو تین قدم چلیے اور گھنٹی کو بجنے دیجیے۔ اور بیگم صاحبہ' آپ جس وقت گھنٹی کی آواز سنیں فوراً پستول چلا دیں۔ لیجیے آداب عرض ہے۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ خدا کرے آپ کا سفر جلد طے ہو جائے اور آپ کی منزل خوشگوار و دل پزیر ہو۔ صاحب آپ کو کس طرح کی موسیقی چاہیے۔''

سیوین نے کہا: ''کوئی دردناک سا سر بجاؤ جو امیدوں کا خاک میں مل جانا ظاہر کرے۔ جس میں نیلی آنکھوں کی سفا کی ہو جس میں ایک درد بھرے دل کا نالہ ہو۔ ایک بے رحم شکاری کے شکار کی آہ و زاری ہو۔ بیگم صاحبہ! لیجیے جو انتقام آپ کو مردوں کی جنس سے لینا ہے' وہ مجھ اکیلے کی ذات سے لے لیجیے۔''

یول نے طاق پر رکھی شمعیں بجھا دیں۔ انگیٹھی کی آگ کے سامنے لوہے کا ایک تختہ رکھ دیا۔ پھر میز کا لیمپ اٹھا باہر چلا گیا۔ جب دروازہ بند ہوا تو کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ ساتھ کے کمرے سے بربط اور رباب کی دردناک موسیقی نے فضا میں بے تابی پیدا کر دی۔ تین منٹ تک یہی حالت رہی اس کے بعد موسیقی بند ہو گئی۔

محیط تاریکی اور خاموشی میں گھنٹی کی نقرئی آواز بالکل صاف سنائی دی۔ پستول کی ایک گولی چل گئی۔ دوبارہ گھنٹی بجی۔ ایک اور گولی چلائی گئی۔ یول لیمپ ہاتھ میں اٹھائے اندر داخل ہوا۔ پستول خاتون کے ہاتھ میں تھا۔ نالی میں سے دھواں ابھی نکل رہا تھا۔ اس نے دیکھا سیوین ویسے کا ویسا کھڑا تھا۔

یول نے دیوار پر نظر ڈال کر کہا: ''گولیوں کے نشان کہاں ہیں؟ وہ ہیں دو سوراخ۔ بیگم صاحبہ۔ آپ کا نشانہ بہت ہی غلط تھا۔ اب صاحب' آپ گھنٹی بیگم صاحبہ کو دے دیجیے۔ میں پستول ابھی آپ کو بھر کے لا دیتا ہوں۔''

یول کونے میں میز کے پاس کھڑا ہو کر پستول بھرنے لگا۔ شاعر نے کہا:

''بیگم صاحبہ! آپ نے پستول بہت اونچا چلایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آپ نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔ میرے دل میں اتنا رحم نہیں میری ایک نہ ایک گولی ضرور مہلک ہو گی۔''

خاتون نے کہا: ''شاعر صاحب یہی تو میری تمنا ہے۔''

یول نے پستول بھر کر سیوین کو دے دیا پھر خاتون سے پوچھا: ''آپ کو کس طرح کی موسیقی چاہیے؟''

جواب ملا: ''کوئی بے پروا سی چیز بجا دو۔ دردناک سر مجھے نہیں بھاتے۔''

دروازہ بند ہو گیا۔ ایک لمحے کے بعد اس تاریکی میں ایک ہنستا کھیلتا سر سنائی دیا۔ آخر وہ بھی بند ہو گیا۔ ایک گھنٹی کی آواز آئی۔ ایک گولی چلی۔

صید نے آواز دی: ''شاعر صاحب، پستول ذرا نیچے کر کے چلائیے۔''

صیاد نے کہا: ''نیلے نیناں والی خدا حافظ۔''

اندھیرے میں ایک ہنستی ہوئی آواز نے جواب دیا: ''بے وفا شاعر، خدا حافظ'' اور پھر گھنٹی بجی۔ ایک فائر ہوا۔ ایک چیخ سنائی دی۔ کوئی زمین پر جیسے گرا۔ یول روشنی لے کر

اندر آیا۔ خاتون اپنی جگہ پر کھڑی تھی۔ سیوین کے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ خود فرش پر پڑا تھا۔

خاتون نے چیخ ماری اور گرتی پڑتی سیوین کے پاس پہنچ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ چلا چلا کر کہتی رہی:

"میرے شاعر، میرے پیارے شاعر، تو نے اپنے آپ کو کیوں مار ڈالا۔ ہائے کس انداز سے تو نے خدا حافظ کہا تھا اور میں نے یونہی تیرا مضحکہ اڑا دیا۔ میرے خوبصورت شاعر تو کیوں مر گیا؟"

پول نے شبے کی نظروں سے دیوار کو دیکھ کر کہا: "لیکن وہ کیسے مر سکتا ہے؟ کارتوس تو خالی تھا۔"

"کیا کہا تم نے؟"

"میرا خیال ہے میں نے آپ سے ذکر کیا تھا کہ میں کبھی کبھی ایک خالی کارتوس بھر دیا کرتا ہوں۔ پہلا کارتوس جو چلایا گیا اس کا نشان تو دیوار پر موجود ہے۔ اس لیے دوسرا کارتوس خالی ہوگا۔ ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ کارتوس خالی ہے۔ یہ مر کیسے سکتے ہیں؟ صرف بے ہوش ہو گئے ہیں! وہ بھی نہیں، دیکھیے ان کی آنکھیں کھل رہی ہیں!"

سیوین نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا کہ حسن عشق کے انداز میں نیاز مند ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا: "تو گویا جنت میں پہنچ گیا ہوں۔ تم بھی یہاں ہو۔ او خدا میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟"

خاتون نے آہستہ سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا، اٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی: "نہیں میرے صاحب! ہم ابھی پیرس میں ہیں۔"

"پیرس میں؟ کیا کہا تم نے؟ پیرس میں! کیا لغو بات ہے؟" سیوین اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں نے اپنے دل پر پستول چلایا تھا۔ یہ دیکھو بارود کا نشان اس بات کا شاہد ہے۔"

پول بولا "وہ خالی کارتوس تھا۔ آپ کو نئے سرے سے کھیل شروع کرنا پڑے گا۔ بیگم صاحبہ! اب آپ کے شکاری بننے کی باری ہے۔"

خاتون نے کہا: "اب مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ میں تنگ آ گئی ہوں۔ براہِ مہربانی مجھے ایک گاڑی منگوا دیجیے۔ مجھے آج ہی ورسیلز پہنچنا ہے۔"

پول نے کہا: "بیگم صاحبہ یہ نہیں ہو سکتا۔ ابھی تو کھیل شروع ہی ہوا ہے۔ دیکھیے ایک دو گھونٹ سے آپ کا خون ابھی پھر گرم ہو جائے گا۔ یہ پی لیجیے۔"

"نہیں صاحب! آپ مجھے فوراً گاڑی منگوا دیجیے۔ آپ سنتے ہیں؟"

پول مایوس ہو کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ سیوین آہستہ آہستہ فرش پر سے اٹھا۔ خاتون نے پوچھا: "میرے اچھے صاحب! مجھے ایک بات بتا دیجیے۔ آپ نے مجھ پر گولی کیوں نہ چلائی؟"

"تم میرے عشق کی سچائی کا ثبوت مانگتی تھیں۔ میں یہی کر سکتا تھا کہ تمہارے لیے اپنی جان دے دوں! افسوس وہ بھی نہ ہوا۔"

خاتون نے بڑی ملائمت سے کہا: "یہ آپ کیا جانیں؟" اور پھر خاموش ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد بولی: "میرا نام ون سنیر ہے۔ میں ملکہ کی درباریوں میں سے ہوں۔ کیا آپ اتنی تکلیف گوارا کر سکتے ہیں کہ کل دوپہر کے بعد ورسیلز میں آ کر مجھ سے ملیں۔ میں آپ کے شعر آپ کے منہ سے سنوں گی۔ اور پھر......"

"اور پھر کیا؟"

"اور پھر میرے شاعر! ہم ستاروں کی باتیں کریں گے۔"

شاعر نے پوچھا: "ان دو نیلے ستاروں کی جو اس وقت مجھ پر چمک رہے ہیں؟"

خاتون نے نوجوان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر کہا: "یونہی سہی۔" ◆◆◆

کبیکی نے مفاہمت کر لی۔

۲۰۱۳ء کے الیکشن میں کبیکی کے دست راست، ابورو کینیاٹا اور رایلا کا مقابلہ ہوا۔ اس بار بھی رایلا نے اسٹیبلشمنٹ پر الزام لگایا کہ اس نے من پسند امیدوار (ابورو) کو جتوانے کے لیے لاکھوں جعلی ووٹ ڈلوائے ہیں۔ الیکشن میں ابورو کو ۶۱ لاکھ ۳۷ ہزار ووٹ پڑے جبکہ رایلا ۵۳ لاکھ ۴۰ ہزار ووٹ حاصل کر سکا۔

اس بار پھر یہ خدشہ موجود تھا کہ رایلا کے حامی مخالفین پر حملہ کر سکتے ہیں۔ تاہم رایلا نے دانش مندی کا ثبوت دیا اور اپنی شکایات سپریم کورٹ کے پاس لے گیا۔ اس نے یہ رٹ دائر کی کہ الیکشن کالعدم قرار دیا جائے۔ تاہم سپریم کورٹ نے اس کی رٹ مسترد کر دی۔ رایلا نے فیصلہ تسلیم نہیں کیا مگر اس کے سامنے سر ضرور جھکا دیا۔

۸ اگست ۲۰۱۷ء کو کینیا میں اگلے صدارتی الیکشن منعقد ہوئے۔ اس بار بھی ابورو اور رایلا کے مابین مقابلہ تھا۔ سبھی کو کانٹے دار مقابلے کی توقع تھی مگر نتیجہ خلاف توقع رہا۔ ابورو نے ۸۲ لاکھ ۲۳ ہزار ووٹ پائے۔ رایلا ۶۸ لاکھ ۲۲ ہزار ووٹ ہی حاصل کر سکا۔

رایلا نے فوراً اسٹیبلشمنٹ پر الزام لگا دیا کہ اس نے ابورو کو جتوانے کے لیے الیکشن میں مختلف اقسام کے فراڈ کیے ہیں۔ مثلاً جعلی ووٹ بھگتائے، اس کے حامیوں کو شناختی کارڈ جاری نہ کیے، ووٹ ضائع کر دیے وغیرہ۔ ان انتخابی بے قاعدگیوں کے باعث رایلا نے دوبارہ سپریم کورٹ سے رجوع کر کے یہ رٹ پیش کی کہ الیکشن کالعدم قرار دیا جائے۔

کینیا میں ۳۷ فیصد آبادی تیس سال سے کم عمر یعنی جوان ہے۔ ان جوانوں میں سے کئی رایلا کے ووٹر ہیں۔ جب نتیجہ سامنے آیا، تو یہ جوان غم و غصے سے بھر گئے۔ جلد ہی وہ مخالفین پر حملے کرنے لگے۔ یوں کینیا میں دوبارہ نسلی تصادم ہونے لگا۔ تادم تحریر اس فساد میں ۱۱۳ افراد جاں بحق ہو چکے۔

رایلا اوڈینگا

۲۸ اگست کو سپریم کورٹ میں رایلا کی رٹ پر سماعت شروع ہوئی۔ فریقین کے دلائل سنے جانے لگے۔ کینین الیکشن کمیشن نے انتخابات کا ریکارڈ پیش کیا جس میں بے قاعدگیاں پائی گئیں۔ انہی کی بنیاد پر سپریم کورٹ کے چھ ججوں میں سے چار نے اکثریتی فیصلہ سناتے ہوئے صدارتی الیکشن کو کالعدم قرار دے دیا۔ سپریم کورٹ نے حکومت کو یہ بھی حکم دیا کہ اگلے ۶۰ دن میں نیا صدارتی الیکشن کروایا جائے۔

سپریم کورٹ کے اس فیصلے نے کینیا ہی نہیں پورے افریقا میں سنسنی پھیلا دی۔ دراصل افریقی ممالک میں یہ خیال عام ہے کہ عدالتیں حکومتوں اور اسٹیبلشمنٹ کی باندیاں ہیں لہٰذا حکومت جو فیصلہ چاہے، وہی سامنے آتا ہے لیکن کینیا کے سپریم کورٹ نے صدارتی الیکشن کالعدم قرار دے کر ثابت کر دیا کہ وہ آزاد و خود مختار ادارہ ہے۔ اس کے فیصلے سے یہ بھی اجاگر ہوا کہ قانون کی حکمرانی اور انصاف کی فراہمی کسی بھی مملکت میں شرط اول ہونی چاہیے۔

یہ فیصلہ آنے پر رایلا اوڈینگا کے حامیوں نے خوب خوشیاں منائیں۔ انہوں نے جلوس نکالے اور مٹھائیاں بانٹیں۔ شروع میں ابورو کینیاٹا نے فیصلہ تسلیم کر لیا مگر بعد ازاں اس نے تصادم کی راہ اختیار کر لی۔ ابورو نے سپریم کورٹ کے ججوں کو "احمق" قرار دیا اور دھمکی دی کہ وہ نئے صدارتی الیکشن بھی جیت کر ان سے نمٹ لے گا۔

ماہرین کے نزدیک یہ عدالتی فیصلہ کینیا کے مستقبل کے سلسلے میں خوش آئند ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کینیائی باشندے حکومتی نظام پر اعتماد نہیں رکھتے، اسی لیے وہ فساد کی جانب مائل ہوتے ہیں مگر حالیہ عدالتی فیصلے سے ثابت ہو گیا کہ حکومت پر "چیک اینڈ بیلنس" موجود ہیں۔ یوں سرکاری اداروں پر عوام کا

اعتماد بحال ہوگا نیز ملک میں قانون کی رٹ بحال ہوگی۔

دلچسپ بات یہ کہ کینیا کا حالیہ صدارتی الیکشن اور پاکستان کا پارلیمانی الیکشن ۲۰۱۳ء خاصی مماثلت رکھتا ہے۔ ۲۰۱۳ء میں تحریک انصاف کے قائد، عمران خان نے پاکستانی اسٹیبلشمنٹ پر الزام لگایا تھا کہ اس نے راتوں رات انتخابی نتائج بدل کر میاں نواز شریف کو جتوایا ہے۔ انہوں نے انتخابی بے قاعدگیاں کرنے پر الیکشن کمیشن کو تنقید کا نشانہ بنایا اور سپریم کورٹ سے رجوع کرلیا۔

سپریم کورٹ پاکستان میں انتخابی بے قاعدگیوں کے سلسلے میں مقدمہ چلنے لگا اور یہ بات سامنے آئی کہ الیکشن کمیشن سے کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں۔ تاہم سپریم کورٹ نے الیکشن ۲۰۱۳ء کو کالعدم قرار نہیں دیا۔ اس دوران مالی بے قاعدگیوں پر اس نے وزیراعظم نواز شریف کو برطرف کرڈالا۔ میاں صاحب نے شروع میں فیصلہ قبول کرلیا، مگر بعد ازاں وہ احتجاج کے موڈ میں نظر آئے اور ججوں پر برسنے لگے۔

یہ حقیقت ہے کہ عدل و انصاف کی فوری فراہمی اور قانون کی حکمرانی کسی بھی انسانی معاشرے میں ترقی و خوشحالی کی بنیاد ہیں۔ جس معاشرے میں فرد کو عدل و انصاف میسر نہ آئے اور قانون کی رٹ کمزور ہوجائے، وہ رفتہ رفتہ گل سڑ کر معدوم ہوجاتا ہے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ کینیا، پاکستان اور تمام ممالک میں عدالتیں آزاد و خودمختار ہوں تاکہ وہ حکومتوں (اور اسٹیبلشمنٹ) کی سازشوں اور کوتاہیوں پر انہیں قرار واقعی سزا دے سکیں۔ سزا کا خوف انسان کو راہ سے بھٹکنے نہیں دیتا۔ مشہور یونانی فلسفی، ارسطو کا یہ قول تمام حکمرانوں کو یاد رکھنا چاہیے:

''انسان کرہ ارض پر موجود تمام جانداروں میں سب سے زیادہ شریف النفس ہے لیکن وہ قانون اور انصاف سے جدا ہو تو زمین پر سب سے زیادہ خطرناک جاندار بن جاتا ہے۔''

کینیا میں اب ۱۷ اکتوبر کو نئے صدارتی الیکشن ہوں گے۔ امید ہے کہ اس بار عوامی دباؤ اور سپریم کورٹ کی پہرے داری کے باعث اسٹیبلشمنٹ کھل کر دھاندلی نہیں کرسکے گی۔ اگر یہ الیکشن منصفانہ ہوئے، تو رایلا نیا صدر بن سکتا ہے۔ یوں اقتدار سنبھال کر اپنے ملک کو ترقی دینے کی اس کی خواہش پوری ہوسکے گی۔ ◆◆◆

کینیا کے عوام عدالتی فیصلہ آنے پر خوشیاں مناتے ہوئے

خزینۂ کتب

نام کتاب: مولانا عبدالرحیم اشرف، حیات و خدمات

ترتیب: ڈاکٹر زاہد اشرف

ناشر: مکتبہ المنبر۔ جامعہ اسٹریٹ بالمقابل ستارہ ٹیکسٹائل ملز، سرگودھا روڈ، فیصل آباد

برصغیر پاک و ہند کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس خطے میں ایسے بلند پایہ مسلمانوں نے جنم لیا جنہوں نے اپنی زندگیاں تبلیغ دین اور خدمت خلق کی راہ میں وقف کیے رکھیں۔ انہی شخصیات میں مولانا عبدالرحیم اشرف (متوفی ۱۹۹۴ء) کا شمار بھی ہوتا ہے۔ آپ قیام پاکستان کے وقت بے سروسامانی کی حالت میں لائل پور (فیصل آباد) آئے اور پھر اسی شہر میں عمر گزار دی۔

فیصل آباد میں مرحوم نے اشرف لیبارٹریز کے نام سے ایک طبی ادارے کی بنیاد رکھی اور کتب و رسائل طبع کرنے کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ مملکت خداداد میں دین اسلام کا نفاذ مولانا صاحب کا دیرینہ خواب تھا۔ فتنہ قادیانیت کے خلاف بھی نہایت سرگرم رہے۔ مرحوم نے طب اور علم و ادب میں جو بیج بوئے تھے، وہ اب تناور پیڑ بن چکے۔ ان کی اگلی نسلیں اسی جذبہ خدمت اور حب الوطنی سے پیڑوں کی آبیاری کررہی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب مولانا عبدالرحیم اشرف پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے۔ مصنفین کی کہکشاں میں نامی گرامی اہل قلم مثلاً مولانا ایوب بنوری، مولانا مجاہد الحسینی، مولانا عبدالمالک، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، مولانا محمد اسحاق بھٹی، حافظ

لدھیانوی وغیرہ شامل ہیں۔ سبھی اصحاب نے اپنے اپنے انداز میں ممدوح پر خامہ فرسائی کی ہے۔

یہ مضامین بڑے سبق آموز اور جامع ہیں۔ ان کا مطالعہ افشا کرتا ہے کہ ایک انسان کو خدمت دین وخلق میں محورہ کر کیونکر زندگی گزارنی چاہیے۔ زندگی کا مقصد دولت کمانا اور عہدوں کا حصول نہیں بلکہ انسانیت کی مدد کرنا اور بھٹکے انسانوں کو سیدھی راہ دکھلانا ہونا چاہیے۔ مضامین میں جا بجا دلچسپ واقعات کا تذکرہ ہے جو بڑے نصیحت آموز بھی ہیں۔ کتاب عمدہ کاغذ پر دیدہ زیب انداز میں طبع ہوئی ہے۔ معنوی اور صوری لحاظ سے نہایت خوبصورت اس کتاب کو اپنی لائبریری کا ضرور حصہ بنائیے۔

نام کتاب: صاحب آواز دوست مختار مسعود
ترتیب: امر شاہد۔
ناشر: بک کارنر، جہلم
فون نمبر: 0321-5440882

دور جدید کے انشا پردازوں میں مختار مسعود (متوفی اپریل ۲۰۱۷ء) کا نام نامی نمایاں ہے۔ آپ اعلیٰ سرکاری افسر اور منفرد ادیب تھے۔ وطن عزیز کا ہر تعلیم یافتہ باسی مرحوم کی تین کتب..... آواز دوست، سفر نصیب اور لوح ایام سے بخوبی شناسائی رکھتا ہے۔ قاری میں جذبہ حب الوطنی ابھارنا اور تاریخ سے دلچسپی پیدا کرنا مختار مسعود کی تحریر کا وصف خاص ہے۔

زیر تبصرہ کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے جو مرحوم کی شخصیت اور کارناموں پر لکھے گئے۔ نیز چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل کتاب میں مرحوم کی تصانیف کا جامع و مربوط انتخاب بھی شامل ہے۔ مختار مسعود شہرت کے طلبگار نہیں تھے اور اپنے گوشہ تنہائی میں مگن رہتے۔ اسی لیے ان کی نجی زندگی کے اکثر گوشے پردہ اخفا میں ہیں مگر اس کتاب کے مضامین قاری کو ایک مایہ ناز لکھاری کی زندگی کے مختلف گوشوں سے متعارف کرواتے ہیں۔

مختار مسعود ایک سلجھی ہوئی شخصیت کے مالک تھے اور انہوں نے نظم وضبط سے اور بڑے باوقار انداز میں اپنی حیات بسر کی۔ بڑے لوگوں کی زندگیاں بھی خصوصاً نوجوانوں کے لیے مشعل راہ ہوتی ہیں۔ وہ ان کی خوبیاں جان کر اپنی زندگی بھی بامقصد بنا سکتے ہیں۔ یہ منزل پانے میں زیر تبصرہ کتاب ان کی بہترین معاون بن سکتی ہے۔ کتاب کی طباعت معیاری ہے اور کاغذ بھی عمدہ۔

نام کتاب: یاران نجد
مصنف: مقبول جہانگیر
ناشر: اٹلانٹس پبلی کیشنز، اے۔ ۳۶، ایسٹرن اسٹوڈیو کمپاؤنڈ، بی۔ ۱۶، سائٹ، کراچی۔
فون: 021-32581720
قیمت: ۳۸۰ روپے

خاکوں کی اس کتاب کے خالق منفرد اردو ادیب ہیں۔ اہل زباں میں سے ہیں کہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور چلے آئے اور طویل عرصہ اردو ڈائجسٹ سے منسلک رہے۔ قارئین میں مقبول جہانگیر (متوفی اکتوبر ۱۹۸۵ء) کی لکھی شکاریات، مہم جوئی اور فرار پر مبنی کہانیاں بہت مشہور ہوئیں اور آج تک شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

مقبول صاحب کو علم وادب کے نامی گرامی ستاروں سے ملنے ملانے کا شوق تھا تاکہ ان کے خیالات عالیہ سے مستفید ہو سکیں۔ رفتہ رفتہ ان کے کئی بڑے ادبا و علما سے تعلقات پیدا ہو گئے۔ مرحوم راقم کے والد، سید قاسم محمود سے بھی قربت رکھتے تھے۔ والد ان کی تحریر و شخصیت کے مداح تھے۔

انیس سو ستر کے عشرے میں مقبول صاحب نے نامور علمی و ادبی

شخصیات کے دلفریب و بامعنی خاکے لکھے جن کا مجموعہ ۱۹۷۶ء میں طبع ہوا۔ اس کی دوسری اشاعت اب شائع ہوئی ہے۔

یاران نجد میں مولانا صلاح الدین احمد، رئیس احمد جعفری، امتیاز علی تاج، حفیظ جالندھری، پروفیسر حمید احمد خان، پروفیسر منظور الحق صدیقی اور حبیب اشعر جیسی قد آور ادبی و علمی ہستیوں پر خوبصورت خاکے شامل ہیں جو ان کی حیات و خدمات کا حقہ انداز میں اجاگر کرتے ہیں۔ خاکوں میں اخلاقیات و علم وادب کے جا بجا بکھرے موتی قاری کو دعوت فکر و عمل دیتے اور نیکی کرنے پر ابھارتے ہیں۔

کتاب عمدہ کاغذ پر نفیس انداز میں طبع ہوئی ہے۔ اس کی افادیت کے سبب قیمت مناسب ہے۔ آپ بیتیوں اور خاکوں سے شغف رکھنے والے قارئین اسے دل پسند کتاب پائیں گے۔

نام کتاب: کون سے کام بند ہیں
مصنف: مرزا عاصی اختر
ناشر: رنگ ادب پبلی کیشنز، ۵، کتاب مارکیٹ، اردو بازار کراچی۔
فون: 0336-2085325

کہتے ہیں کہ تمام اصناف ادب میں مزاح اور بچوں کا ادب تخلیق کرنا بڑا کٹھن کام ہے۔ بقول عطاء الحق قاسمی ''مزاح وہ میدان ہے جس میں محض ایک نقطے کا فرق ''محرم'' کو ''مجرم'' بنا سکتا ہے۔ مرزا عاصی اختر داد کے مستحق ہیں کہ وہ ایک دور دراز واقع شہر میں بسنے کے باوجود معیاری مزاحیہ و نثری تخلیقات پیش کر رہے ہیں۔

مرزا صاحب اگست ۱۹۵۴ء میں حیدر آباد، سندھ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم مکمل کر کے تدریس سے وابستہ ہوئے اور کئی برس سے میر پور خاص میں مقیم ہیں۔ آپ کی مزاحیہ شاعری اردو ڈائجسٹ سمیت وطن عزیز کے اکثر رسائل میں طبع ہوتی ہے۔ مزاحیہ شاعری کے تین مجموعے شائع ہو چکے، زیر تبصرہ کتاب مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔

یہ مضامین چھوٹے چھوٹے چٹکلوں کا خزینہ ہیں جنہیں پڑھتے ہوئے قاری بے اختیار مسکرانے لگتا ہے۔ طنزیہ جملے بھی بڑے کاٹ دار انداز میں معاشرتی برائیاں نمایاں کرتے ہیں۔ مزاحیہ تحریر لکھنے کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ ہنسی ہنسی میں انسان کو زندگی کے تلخ وشیریں حقائق سے آگاہ کروا دیا جائے۔ اسی تعریف پر مرزا صاحب کے مضامین پورے اترتے ہیں۔

یہ سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔ چھپائی بھی مناسب ہے۔ طنز و مزاح کی کتب پڑھنے والوں کے لیے عمدہ قلمی تحفہ ہے۔ ویسے بھی اردو مزاح کے سکہ بند لکھاری اب کم ہی رہ گئے ہیں۔ ایسے ماحول میں مرزا عاصی اختر کا سرگرم و متحرک رہنا قابل تعریف ہے۔

نام کتاب: راولپنڈی
مصنف: راجا محمد خالد جنجوعہ
قیمت: ۳۰۰ روپے

راولپنڈی برصغیر پاک و ہند کا تاریخی علاقہ ہے۔ قیام پاکستان سے قبل انگریزوں نے یہاں فوجی چھاؤنی کی بنیاد رکھی۔ بعد ازاں اس کے قریب ہی نئی مملکت کا دارالحکومت قائم کیا گیا۔ یوں خطہ راولپنڈی کو پاکستان میں بڑی اہمیت حاصل ہو گئی۔

زیر تبصرہ کتاب میں راولپنڈی اور ملحقہ علاقوں کی تاریخ، حقائق اور معلومات موجود ہیں۔ تاریخی واقعات خاصے کی چیز ہیں۔ تاہم کتاب میں پتے کی عدم موجودگی حیران کن بات ہے۔ بہر حال اس کتاب سے دلچسپی رکھنے والا قاری کتاب فروش سے مطلوبہ معلومات حاصل کر سکتا ہے۔

انٹری ٹیسٹ کا دھندا

تعلیم دینے کے نام پر جاری لوٹ کھسوٹ کا چشم کشا قصہ

اعجاز شیخ

مملکت خداداد میں جہاں عوام ان گنت مصیبتوں سے نبرد آزما ہیں، ان میں شعبہ تعلیم بھی شامل ہے۔ کبھی وقت تھا کہ تعلیمی شعبے سے وابستہ لوگ بڑے معتبر، شرفاء اور ایماندار گردانے جاتے تھے مگر اب صورت حال یہ ہے کہ یہ طبقہ بھی طلبہ وطالبات اور غریب والدین سے پیسے بٹورنے میں مصروف ہے۔ مثال کے طور پر وطن عزیز کے بڑے شہروں میں انٹری ٹیسٹ کی تیاری کے لیے مخصوص مافیا وجود میں آچکا جو ہر یونیورسٹی اور کالج میں موجود ہے۔ یہ سیاسی بنیادوں پر غیر مستحق طلبہ وطالبات کے داخلوں پر سرگرداں رہتا ہے۔ یوں غریب اور متوسط والدین وسائل اور پیسا نہ ہونے کی وجہ سے اپنے بچوں کو انٹری ٹیسٹ کی تیاری کے لیے ان اکیڈمیوں میں داخلہ نہیں دلا سکتے۔

بھلے وقتوں میں ایک طالب علم کا محنتی ہونا ضروری تھا۔ مگر اب نئے سیٹ اپ کے تحت محنتی ہونے کے ساتھ ساتھ وسائل کا ہونا بھی ضروری ہے۔ جبکہ ہماری حکومت مسلسل اس بات کو دہرا رہی ہے کہ ہم نے تعلیم کو عام آدمی تک پہنچا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک میں رائج دوہرے نظام تعلیم نے جہاں طبقاتی نظام کو پروان چڑھایا ہے، وہاں سفید پوش طبقے کے محنتی طلبہ کی حق تلفی بھی ہو رہی ہے۔ شہروں میں کھمبیوں کی طرح اُگے ہوئے انٹری ٹیسٹ کی تیاری کروانے والے سنٹر جنہیں سیاسی پشت پناہی حاصل ہے، انٹری ٹیسٹ رائج کروانے کے لیے بے دریغ پیسا خرچ کر رہے ہیں تاکہ ان کا دھندا جاری وساری رہے۔ انٹری ٹیسٹ کے پرچوں کا قبل از وقت افشا ہونا بھی انہی اداروں کا شاخسانہ ہے۔

راقم کو بہت پہلے اپنے بیٹے کو انٹری ٹیسٹ کی تیاری کے سلسلے لاہور کی ایک مشہور اکیڈمی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں جا کر احساس ہوا کہ اکیڈمی کی عمارت کسی بین الاقوامی بینک یا سفارتخانے کا دفتر لگتی ہے۔ دور دراز سے آئے ہوئے والدین چیک چاپ فارم لے کر داخلے کی اجازت ملنے کے منتظر بیٹھے نظر آئے۔ بھاری فیسوں کی ادائیگی کے بعد متعلقہ عملہ آپ کو ہاسٹل میں داخلے کی بابت بڑی سیر حاصل گفتگو

کرے گا کیونکہ باہر سے آئے ہوئے طلبہ ہاسٹل میں رہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

ان اکیڈمیوں کے ہاسٹل نجی رہائش گاہوں کو لے کر بنائے گئے ہیں جہاں عمومی طور پر ۸×۸ کے ایک کمرے میں پانچ سے سات طلبہ کو رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ہاسٹل میں کھانے کے نظام کے لیے ان اکیڈمیوں کے مالکوں نے کسی معیار کا خیال رکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ کھانا اتنا ناقص اور غیر معیاری ہوتا ہے کہ جیل میں درجہ دوم کے قیدیوں کو بھی نہیں دیا جاتا۔

اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ان اکیڈمیوں کے مالکوں کو شاید کوئی پوچھنے والا نہیں۔ غریب والدین ذہین بچوں کو اپنا پیٹ کاٹ کر ایف ایس سی تک اس امید سے پڑھانے میں سرگرداں رہتے ہیں کہ ان کا بیٹا اچھے نمبروں اور محنت کے بل بوتے پر انجینئر یا ڈاکٹر ضرور بن جائے گا مگر فی الوقت رائج نظام تعلیم اور انٹری ٹیسٹ نے والدین کی مجبوریوں کو بھی ڈس لیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بگاڑ کا ذمہ دار کون ہے؟ اس نئے نظام تعلیم میں اگر خرابیاں موجود ہیں تو ان کے ذمہ دار کون لوگ ہیں؟

اگر بورڈ کی سطح پر پرچوں میں گھپلے کا خطرہ ہے تو اس کی سزا والدین اور محنتی طلبہ کو کیوں دی جاتی ہے؟ امتحان لینے والے اور ڈگریاں دینے والوں پر اگر بھروسا نہیں تو ان کو وہاں سے ہٹا کر انہیں سزا کیوں نہیں دی جاتی؟ اگر انٹری ٹیسٹ ہی معیار جانچنے کا پیمانہ ہے تو پھر بورڈ کی سطح پر امتحانات کا انعقاد کیوں ضروری ہے؟ تب صرف انٹری ٹیسٹ کو ہی کیوں نہ مرکز مان لیا جائے؟

غریب والدین کی کمائی اور محنتی بچوں کا رات دن ایک کر دینے کے باوجود انٹری ٹیسٹ میں ناکامی ان کا مقدر ٹھہر جاتی ہے تو اس کا جواب کون دے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ انٹری ٹیسٹ کے مافیا نے غیر مستحق طلبہ کو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخلہ دلانے کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے، اس سے متوسط اور ذہین طالب علموں کا داخلہ شجر ممنوعہ بن کے رہ گیا ہے۔ کیا حکومت پھر بھی اشتہاری مہموں پر کروڑوں روپے خرچ کر کے عوام کو یہ یقین دلاتی رہے گی کہ ہم نے شعبہ تعلیم میں ترقی کر لی ہے؟

ایک طالب علم بورڈ کے امتحان میں ۱۰۰۰ نمبروں میں سے ۹۲۰ نمبر لے کر بھی انٹری ٹیسٹ میں ناکام ہو جاتا ہے صرف اس لیے کہ وہ انٹری ٹیسٹ کے لیے قائم شدہ اکیڈمیوں میں فیس نہ ہونے کی وجہ سے اس سسٹم کو اپنا نہیں سکا جو نصاب کے علاوہ اشرافیہ نے زبردستی رائج کروا رکھا ہے۔ جہاں پر اشرافیہ اور مافیا کی ملی بھگت سے پاس شدہ طلبہ کو فیل اور فیل کو پاس کیا جاتا ہے۔ ایسے حالات میں کیا طالب علم اس قوم کے لیے دعا گو ہوں گے؟ ہرگز نہیں۔

جب ابتدا ہی سے ان کی حق تلفی ہو گئی تو آئندہ زندگی میں وہ دوسروں کی حق تلفی سے کیونکر گریز کریں گے؟ حکومت سے گزارش ہے کہ طالبان علم کی تعلیمی استطاعت جاننے کے لیے صرف انٹری ٹیسٹ کو ہی حرف آخر نہ سمجھیں ورنہ والدین اور طلبہ میں احساس محرومی مزید بڑھتا جائے گا جس سے مزید انتقام کا جذبہ اُبھرے گا۔

کاش حکومت اس امر سے واقف ہو سکے کہ انٹری ٹیسٹ کے عذاب سے دوچار طلبہ اور طالبات کے علاوہ والدین کیسے پریشان کن حالات سے گزر کر اپنے بچوں کے داخلے کے لیے سرگرداں ہیں۔ اس کرب کو وہی جانتے ہیں جو اس انٹری ٹیسٹ کے عذاب سے گزر رہے ہوں۔ حکومت کو چاہیے کہ اس مسئلے کو اولین ترجیح دے کر انٹری ٹیسٹ کے نام پر جاری لوٹ کھسوٹ ختم کرے تاکہ محنتی طلبہ کی دادرسی ہو سکے۔ محنتی اور قابل طلبہ وطالبات کو ان کا حق دینا حکومت کی ذمے داری ہے۔ ●●●

قارئین کے تبصروں، مشوروں
اور باتوں سے سجا کالم

ملک کی آبادی ماشااللہ اکیس کروڑ کے لگ بھگ ہو چکی۔اس میں ہر سطح پر نہایت قابل ہستیاں گزر چکی ہیں اور موجود بھی ہیں۔ہر پہلو سے ترقی ہوئی ہے اور ہو بھی رہی ہے۔تمام حاکموں نے خواہ فوجی ہوں یا سویلین، میرے خیال میں پوری محنت اور خلوص سے ملک کی خدمت کرنے کی کوششیں کی ہیں لیکن ناخوش ہو کر باگ ڈور دوسروں کے حوالے کرتے گئے۔شاید ہی کسی نے وجہ معلوم کرنے کی طرف توجہ دی۔ہماری ناکامی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ پاک وطن میں بہت سی برائیاں موجود ہیں۔مثلاً سود کی لعنت، کرپشن اور قانون کی حکمرانی نہ ہونا۔یہ برائیاں دور ہو جائیں تو ہمارا ملک خوب ترقی کر سکتا ہے۔

(ڈاکٹر ملک محمد عظیم مجوکہ، شیخوپورہ)

☆☆☆☆☆

اُردو زبان وادب اور صحافت کے تحفظ اور تدریج کے لیے ''اُردو ڈائجسٹ'' اور اس کے سرپرستوں نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں وہ ہم طلبا کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔خصوصاً آج جب کہ انگریزی الفاظ کی بے جا اور بے تحاشا مداخلت نے اُردو کی بقا اور ہمارے تین سو سالہ علمی، ادبی اور ثقافتی ذخیرے کی بقا پر سوالیہ نشان لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ایسے میں جب آپ کی کاوشوں اور جدوجہد پر نظر پڑتی ہے تو بے اختیار دل کہہ اُٹھتا ہے

سلیقے سے ہواؤں میں جو خوشبو گھول سکتے ہیں
ابھی کچھ لوگ زندہ ہیں جو اُردو بول سکتے ہیں

اُردو ڈائجسٹ کا کمال یہ ہے کہ یہ ماضی کے اکابر ادیبوں کے شہ پاروں اور معاصر لکھاریوں کی گوہر فشانیوں کو بیک وقت جمع کر کے ماضی اور حال کے درمیان پُل کا کام سرانجام دے

رہا ہے۔بس ایک کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے یعنی شاعری۔امید ہے آپ اس طرف بھی توجہ فرمائیں گے۔نئے اور قدیم شعرا کی شاعری، ان کا تعارف اور تجزیے کے ساتھ کچھ انتخاب شمارے کو چار چاند لگانے کے مترادف ہو گا اور رسالہ صحیح معنوں میں اُردو کا ترجمان بن سکے گا۔

(ابوالحسین آزاد۔تلہ گنگ)

☆☆☆☆☆

مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اُردو ڈائجسٹ جناب الطاف حسن قریشی صاحب کی زیرِ نگرانی ہماری قومی زبان وادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہا ہے لیکن ہماری نوجوان نسل کا یہ المیہ ہے کہ وہ اپنی قومی زبان کو فراموش کر کے اس کے ادب اور اسلوب سے بہت دور ہو چکے۔آج کل کے بچوں کو اردو کی بجائے انگریزی زبان زیادہ آسان لگتی ہے اور وہ اردو زبان کے مشکل الفاظ اور معنی ومطالب کو سمجھنے کے لیے انگریزی زبان کا سہارا لیتے ہیں۔اسکول وکالج میں بھی انگریزی زبان پر ہی زور دیا جاتا ہے۔اس لیے بچے انگریزی زبان کے قریب اور اردو سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔بے شک انگریزی زبان دورِ جدید کی ضرورت ہے لیکن نسلِ نو کو اپنے ملک کی اقدار اور اسلاف کی روایات سے جوڑے رکھنے کے لیے اردو زبان وادب کی اہمیت سے روشناس کروانا نہایت ضروری ہے کیونکہ اسی نسل نے کل کو ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہے۔

(دانیہ صدیقی۔کراچی)

☆☆☆☆☆

محترمہ! یہ واقعی لمحۂ فکریہ ہے کہ نسلِ نو اُردو زبان لکھنے، پڑھنے اور بولنے میں شرم محسوس کرتی ہے۔انہیں لگتا ہے کہ اُردو بولنے والا یا پڑھنے والا زمانۂ جدید کے تقاضوں پر پورا نہیں اُتر سکتا حالانکہ یہ بالکل غلط سوچ ہے۔ہمیں سب سے پہلے اپنی سوچ بدلنا ہو گی تب ہی ہم نئی نسل کے لیے مثال بن سکیں گے۔

(ادارہ)

اُردو ڈائجسٹ سے وابستگی کافی پرانی ہے اسی وجہ سے یہ ڈائجسٹ میرے نزدیک ہمیشہ سے خاص رہا ہے۔

ستمبر کے شمارے میں تو کمال ہو گیا۔جب میری تحریر کو شرفِ قبولیت بخشا گیا، یقین مانیں میں خوشی سے دنگ رہ گئی۔اس کے بعد اعزازی شمارہ اور معاوضہ پا کے تو خوشی سے ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔واقعی حوصلہ افزائی اور شفقت کا یہ مظاہرہ اب خال خال ہی دیکھنے میں آتا ہے۔اب مجھے اُمید بندھ گئی ہے کہ میں بھی عمدہ اور اچھی تحریریں لکھنے کے قابل ہو سکوں گی۔

(سعدیہ جبار۔فیصل آباد)

☆☆☆☆☆

اس دفعہ کا اُردو ڈائجسٹ بھی ہمیشہ کی طرح معیاری اور بامقصد پایا۔ڈاکٹر روتھ فاؤ کی سرورق پر تصویر اچھی لگی۔بلاشبہ انہیں خراجِ تحسین پیش کرنے کا اس سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں۔وہ واقعی قابلِ تحسین تھیں اور ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔مزید برآں عافیہ مقبول جہانگیر نے لکھا بھی بہت خوب۔اُردو ادب سے انتخاب اچھا لگا نیز مزاح بھی عمدہ رہا۔غذائیات پر تحریریں، اُترن اور ماسٹر خوشی محمد کی پیسٹری پسند آئی۔اس کے علاوہ گمنام شعراء کے مشہور اشعار بے حد معلوماتی اور دلچسپ لگا۔اللہ آپ کے ادارے کو مزید ترقی دے۔آمین۔

(یاسمین کنول۔پسرور)

☆☆☆☆☆

توجہ فرمائیے

ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ میں طبع ہونے والی تحریروں کے حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔کسی کتاب یا رسالے میں اُردو ڈائجسٹ کی کوئی تحریر شائع کرنے سے قبل ادارے سے اجازت لینا ضروری ہے۔

TENDER NOTICE

Sealed tenders based on MRS Bi-Annual system (District Gujranwala) are invited for the work mentioned below from the approved Contractors/ Firms of HUD& PHE Department for the year 2017-18 and those who have got deposited their enlistment/ renewal fee for current financial year. The tender/ biding documents can be obtained immediately after the publication from the Divisional Head Clerk of this office during office hours on payment of non-refundable tender documentation/ printing as mentioned against each on written request accompanied by, original PEC License/ Registration 2017-18 in relevant category. Original contractor/ Firm's Managing Partner, authority letter/ Power of attorney, original CNIC of Contractor/ Firm's Managing Partner, original enlistment/ renewal letter and proof for depositing of enlistment/ renewal fee, original National Tax Number, original Registration with Punjab Revenue authority, failing which the tender documents will not be issued. The earnest money of the estimated cost of the tender in shape of "Deposit at Call" from any scheduled bank in the name of Executive Engineer, P.H.E. Division Gujranwala must be attached alongwith tender document;failing which tender will be cancelled automatically.

The tender documents will be issued up to **13-10-2017**during office hours and will be received **21-10-2017**at **1:30 P.M.** & opened at **2:00 P.M.** in office of the undersigned in the presence of the intending firms or their authorized representative. The conditional/ telegraphic tender or tender by post will not be entertained.

If any contractor quoted his rates more than 5% below the approved estimate/ item rates, they shall have to deposit additional performance security equal to the amount of less quoted rates as required under Finance Department letter No.RO(Tech.)FD-12/83/(IV)(P) dated 6.4.2005.

Sr #	Name of Scheme	Estimated cost Rs. in million	Earnest Money	Time Limit	Tender Document/ Printing Fee	T.S. No. & Date
1	Construction of PCC/ RCC, Drain UC Mandiala Warraich, Rajkot, District Gujranwala.	18.519	2% of estimated cost	45-days	Rs. 1000	S.E. No. 13540/B Dt. 16.9.2017

Sr #	Name of Scheme	Estimated cost Rs. in million	Earnest Money	Time Limit	Tender Document/ Printing Fee	T.S. No. & Date
2	Construction of PCC/ RCC UC Butranwali, Madina Colony, District Gujranwala.	23.148	-do-	-do-	Rs. 2000	S.E. No 13540/B Dt 16.9.2017
3	Installation of Injector Pumps in NA-97, District Gujranwala.	13.310	-do-	-do-	Rs. 1000	S.E. No 13540/B Dt 16.9.2017
4	Installation of LED Lights main Fatomand/ UC Ameer Park, District Gujranwala.	22.337	-do-	-do-	Rs. 2000	S.E. No 13540/B Dt 16.9.2017
5	Providing and installing Generator at Disposal Station More Eminabad Sharqi District Gujranwala.	5.150	-do-	-do-	Rs. 1000	S.E. No 13543/B Dt 16.9.2017
6	Providing and installing Generator at Disposal Station Madu Khalil, District Gujranwala.	5.150	-do-	-do-	Rs. 1000	S.E. No 13543/B Dt 16.9.2017
7	Construction and Installing Of Injector Pump UC Khiali Shah Pur, District Gujranwala.	1.713	-do-	-do-	Rs. 500	S.E. No 13543/B D 16.9.2017
8	Construction and Installing Of Injector Pump UC Tatly Mali, District Gujranwala.	2.285	-do-	-do-	Rs. 500	S.E. No 13543/B D 16.9.2017
9	Provision Of Sewerage Scheme New Abadie Sensara Goraya, District Gujranwala.	14.733	-do-	-do-	Rs. 1000	S.E. No 13543/B Dt 16.9.2017

IPL-12624

Executive Engineer,
Public Health Engg; Division
Gujranwala

PUBLIC HEALTH ENGINEERING DIVISION SAHIWAL
PH: 040-9200319
NOTICE INVITING TENDER

Sealed Tenders based on item market rates schedule of the respective half year are hereby invited for the following works by the undersigned from approved contractors/ firms of Public Health Engg: Department as well as registered with Punjab Revenue Authority, who have got their names enlisted/ renewed and deposited requisite enlistment/ renewal fee for the year 2017-18.

The tender documents can be obtained from the Divisional Head Clerk on production of CDR in the name of undersigned amounting to 5% of the estimated cost and on written request of firm on letter pad of company with original documents such as enlistment/ Renewal letter, GR (Government receipt) in token of deposit of fee, original partnership deed of the firm/ contractor, original NIC of the proprietor/ contractor of the firm, in case of authorized person his authority letter on stamp paper with his original NIC on payment of prescribed tender fee during office working hours. The tenders can be obtained from the date of publication of this advertisement upto **18.10.2017**within office hours. The tenders will be received on **19.10.2017**upto **02:30PM** and will be opened immediately after **30Minutes(03:00PM)** in this office situated at 537/K, Farid Town, Sahiwal in the presence of contractors or their authorized representative who may desire to be present at that time.

The blank form can be purchased from the Head Clerk of this office at the non refundable cost mentioned against the work during normal office hour. No tender shall be sold on the date of receipt of tenders. No tender except those purchased as mentioned above, will be entertained/accepted.

Tenders/ bids received by post or through any other means shall not be accepted.

The conditional, incomplete and over written tender/ bids will be rejected.

Undersigned has the right to reject all bids or proposals at any time prior to the acceptance of bids or proposals.

Undersigned shall upon request communicate to any bidder, the grounds for its rejection of all bids or proposals, but shall not be required to justify those grounds.

Note:-1. In case the tendered amount is less than 5% of the approved estimate/ DNIT amount, the lowest bidder shall have to deposit the performance security equal to less quoted amount in advance in shape of deposit at call from any scheduled bank, cash, bunk draft, payment order or bank guarantee which will be refunded on completion of the work. Failure to deposit the performance security within 15days from the date of issuance of acceptance letter shall result into forfeiture of earnest money without any further notice.

2. No tenders will be issued to the contractor whose progress of work in hand projects is unsatisfactory or who have been declared as defaulter or black listed.
3. Tender will not be issued without aforementioned original documents.
4. In case any public holiday is declared on any one of above mentioned dates, the respective activity will be shifted on next working day/ days automatically.
5. CDR will be deposited with the Head Clerk at time of issuance of tender so that its genuineness can be checked well in time.
6. The contractors/ firms have to provide enlistment/ registration of **Punjab Revenue Authority(PRA)** at the time of issue of tenders.

Tender Fee(Printing Charges as per PPRA) Rs. 3000/- (Each)

Sr: No.	Name of Work	Estimated Cost (Rs. In Millions)	Earnest Money As per PPRA	Time of Completion
1	Construction of PCC Streets Harappa City.	Rs. 7.560	5% of Bid Price	04 Months
2	Soling 44/5-L Fojiyan Wala to 45/5-L via Sem Nala	Rs. 2.450	do	03 Month

IPL-12708

Executive Engineer, Public Health Engg; Division Sahiwal

لکھیے اور معقول معاوضہ پائیے

گستاف فلابیر فرانس کا ممتاز لکھاری گزرا ہے۔ اس کا قول ہے: ''لکھنا ایسا فن ہے جس کے ذریعے آپ اپنے دل و دماغ میں پوشیدہ جذبے اور خیال دریافت کرتے، بوجھتے ہیں۔''

اُردو ڈائجسٹ آپ کو بھی لکھنے کی دعوت دیتا ہے

کہانی لکھیے، سچا واقعہ، آپ بیتی، مزاح یا معلوماتی مضمون! یا پھر کسی اسلامی موضوع پر قلم اٹھایئے اور ایسی تحریر تخلیق کیجیے کہ وہ قاری کی زندگی میں انقلاب لے آئے۔

عمدہ نثر پارہ تخلیق کرنے پر آپ کو جو قلبی مسرت ہوگی، اس کی اہمیت اپنی جگہ! اُردو ڈائجسٹ میں جگہ پانے پر وہ آپ کو معقول معاوضے کا حقدار بھی بنا دے گی۔ آخر میں مشہور برازیلی ادیب، پاؤلو کیولو کا یہ قول بھی مدنظر رکھیے:

''ساجھے داری (Sharing) کا دوسرا نام لکھنا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے خیالات، نظریات اور تجزیوں کو دوسروں کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہے۔'' (ادارہ اُردو ڈائجسٹ)

ادارتی آفس 325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738
فیکس: +92-42-35290731
ای میل: editor@urdudigest.pk

کتاب سے بہتر دوست کہاں!!! جُمہوری سے بہتر کتابیں کہاں!!!

خالدؓ بن ولید

اسلام کے عظیم ترین فاتح اور نامور جرنیل کی مختصر اور جامع سوانح عمری

غزوات اور اسلامی فتوحات کی تفصیل

قیمت 600 روپے

پاکستان سے بنگلہ دیش۔ اَن کہی جدوجہد	شریف الحق دالیم	860	
بادشاہی سے جلاوطنی۔ بہادر شاہ ظفر	فرخ سہیل گوئندی	380	
ترکی ہی ترکی سفرنامہ، تاریخ وتہذیب	فرخ سہیل گوئندی	480	
بکھرتا سماج	فرخ سہیل گوئندی	400	
عالمی بیکاروں کی دہشت گردی	فرخ سہیل گوئندی	180	
سلطنتِ عثمانیہ سے جمہوریہ ترکیہ	ضمیر احمد ہاشمی	400	
تاریخِ عالم	ڈاکٹر فیدور کروکن	750	
اکہتر کے وہ دن (مشرقی پاکستان کے آخری 9 ماہ)	جہاں آراء امام	650	
سکندرِ اعظم۔ دنیا فتح کرنے کی تاریخ	ہیرالڈ لیمب	540	
سلیمان عالیشان۔ تاریخ سلطنتِ عثمانیہ	ہیرالڈ لیمب	520	
صلیبی جنگوں کی تاریخ۔ صلاح الدین ایوبی	ہیرالڈ لیمب	590	
حیاتِ قائداعظم	ہیکٹر بولتھو	580	
ایم ٹی وی سے مکہ تک۔ اسلام نے کیسے میری کایا پلٹ دی	کرسٹیان بیکر	990	
سندھ ساگر اور قیامِ پاکستان	اعتزاز احسن	800	
ایشیا کا مقدمہ (سابق وزیراعظم ملائیشیا کی کتاب)	مہاتیر محمد	200	
دہشت گردی۔ ایک فکری مطالعہ	سلمان عابد	780	

مردِ آہن۔ روسی صدر پوتن

کی سنسنی خیز سوانح

Rs.600

امریکہ کی عوامی تاریخ		باورڈزن	600
مسلمان اُندلس میں		سٹینلے لین پول	380
ناموس	ناول	ایلف شفق	580
رسولِ کائناتؐ (سیرتِ نبوی)		عبدالکریم ثمر	400
سرخ میرا نام	ناول	اورحان پاموک	780
اُجڑے دیار	ناول	انطونیو توریس	500
سرزمین	ناول	انطونیو توریس	300
چلتا مسافر	ناول	الطاف فاطمہ	800
خواب گر	ناول	الطاف فاطمہ	800
بوئے گل	ناول	یشار کمال	480
انا طولیہ کہانی	ناول	یشار کمال	580
بابِ اسرار۔ دوررویش، شمس تبریز اور رومی		احمت امیت	980
مزاحمت کی سرگوشیاں	ناول	احمت امیت	980
شیشے کا آدمی (مختصر روسی افسانے)		ڈاکٹر نجم الحسن	550
استنبول (داستانوں کا شہر)	ناول	ماریو لیوی	1600
بادِ بہار	ناول	ژلفو لیوانلی	700

کہانی جلال الدین رومی کی

چالیس چراغ عشق کے (ترجمہ)

ایلف شفق

Rs.880 (The Forty Rules Of Love)

ایک فون کال پر گھر بیٹھے کتاب خریدیے

Free Delivery

جمہوری پبلیکیشنز۔ 2۔ ایوانِ تجارت روڈ، لاہور 042-36314140

www.jumhooripublications.com